سلسلہ 2
اصلاحِ خاندان

فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما

هدیۃ الوالدین

اولاد اور والدین کے باہمی مسائل و احکام



تالیف

حافظ مبشر حسین حفظہ اللہ

توجہ فرمائیں

منہاج السنۃ النبویہ لائبریری

(رجسٹرڈ) حیدرآباد دکن۔

پر اپلوڈ کی جانے والی تمام کتب، تحقیقی مضامین ورسائل ، نیز کتب ورسائل کا کوئی ایک ضروری حصہ ، عام قارئین کے مطالعے کے لئے اور دعوتی، اصلاحی اور تربیتی مقاصد کی خاطر اپلوڈ کیا جاتا ہے۔

تنبیہ:

کسی بھی کتاب یا اس کے حصہ کو تجارتی یا مادی نفع کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے ، نیز یہ عمل اخلاقی، قانونی وشرعی جرم بھی کہلائے گا۔

Minhaj-us-Sunnat-un-Nabawiya Library,

Hyderabad, TS

فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما

هدیۃُ الوالدین

اولاد اور والدین کے باہمی مسائل و احکام



اریب پبلیکیشنز

1542، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

نام کتاب	:	ہدیۃ الوالدین
مولف	:	حافظ مبشر حسین
ناشر	:	اریب پبلیکیشنز
صفحات	:	296
سن اشاعت	:	2013
قیمت	:	

HADIYAT-UL-WALDAIN
Hafiz Mubashshar Husain

ناشر

اریب پبلیکیشنز

1542، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

فون: 23284740، 23282550، 43549461

فہرست مضامین

باب 13

والدین کے لیے ایصال ثواب 246

باب 14

سوتیلی اولاد اور سوتیلے والدین [باہمی مسائل اور حقوق و فرائض] 267

حرفِ آغاز

خاندانی نظام میں والدین اور اولاد کا رشتہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔اس رشتہ کی پائیداری کے لیے اللہ تعالیٰ نے والدین اور اولاد کے درمیان فطرتی طور پر باہمی محبت کے بیج بودیے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ پھلتے پھولتے چلے جاتے ہیں۔ان کا پھلنا پھولنا ہی خاندانی نظام کے استحکام کی علامت ہے۔اس نظام کو مزید مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اولاد اور والدین کے حقوق وفرائض کو یہ حسنِ اعتدال بخشا ہے کہ جب تک اولاد پرورش، تعلیم وتربیت اور وسائل واخراجات کی محتاج ہے، تب تک ان کی حضانت وکفالت اور تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے والدین پر ڈال دیں اور انہیں اپنی طاقت واستعداد کے مطابق ان سے عہدہ برآ ہونے کا ذمہ دار ٹھہرایا اور جب والدین بوڑھے، لاچار اور محتاج ہو جاتے ہیں، اس وقت ان کی کفالت وسکونت سے متعلقہ تمام تر ذمہ داریاں ان کی جوان اولاد (بیٹوں) پر عائد کردیں اور اولاد کے حق میں اسے ایک شرعی ودینی فریضہ قرار دے دیا۔

اولاد اور والدین کے باہمی تعلق کو مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے اسلام نے جس طرح ہر دو فریق کو اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے قانوناً پابند بنایا ہے، اسی طرح مزید بہتری کے لیے فضیلت ورغبت کا طریقہ بھی اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف اولاد کی پرورش وتربیت پر والدین کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے جبکہ دوسری طرف اولاد کو یہ بتایا گیا ہے کہ باپ جنت کا مرکزی دروازہ ہے اور ماں کے قدموں تلے جنت ہے یعنی ماں باپ کی خدمت گزاری جنت میں لے جانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

یہ دین اسلام ہی کی خوبی ہے کہ اس نے خاندانی نظام کے تحفظ کے لیے اولاد اور والدین کے باہمی رشتے کو محبتیں، اُلفتیں اور ادب واحترام کی نہایت مضبوط دیواریں فراہم کیں، ورنہ آج کی ماڈرن سولائزیشن سمیت دنیا کا کوئی نظام ایسا نہیں جس نے عمرانیات کے اس اہم ترین حصے یعنی ادارۂ خاندان کو حقیقی تحفظ فراہم کیا ہو۔مغربی تہذیب وتمدن میں پروان چڑھنے والی نوجوان نسل بوڑھے اور محتاج والدین کو اپنی عیاشانہ زندگی میں رکاوٹ اور بوجھ سمجھتے ہوئے جس وقت گھروں سے نکال کر'اولڈ ہوم' [نرسنگ ہاؤس] میں بھیج رہی ہوتی ہے، اس وقت اسلام ان بوڑھے اور محتاج والدین کو موقعِ غنیمت قرار دیتے ہوئے ان کی خدمت پر دنیا وآخرت کی بہتری اور جنت میں داخلے کی ضمانت دیتا ہے.....!

امتِ مسلمہ کی بدعملی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا خاندانی ادارہ آج بھی کسی حد تک مضبوط ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام دشمن قوموں کی پوری توجہ مسلمانوں کے خاندانی نظام کی تباہی کی طرف ہے اوروہ پوری شدت سے خاندانی ادارے کے قلع پر سنگ باری کر رہے ہیں اوراس میں شگاف پیدا کرنے میں انہیں کامیابیاں بھی مل رہی ہیں۔ یقیناً یہ ہمارے لیے مقامِ غور وفکر ہے کہ ہم اپنے فیملی سسٹم کو کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ خاندانی نظام کے تحفظ کے لیے راقم الحروف نے اس کی بنیادی کڑیوں کو موضوع بحث بنایا ہے اوراس سلسلہ میں چند کتابیں تالیف کی ہیں۔ زیرنظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب میں والدین کے حقوق وفرائض کے علاوہ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اُن مسائل کو خصوصی طور پر زیر بحث لاؤں جن سے والدین اوراولاد کے درمیان بحث وتکرار کی فضا پیدا ہوتی اور باہمی تنازعات جنم لیتے ہیں اوراسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگران کا صحیح ومنصفانہ حل پیش نہ کیا جائے تو خاندانی ادارہ تباہی وبربادی کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ آئندہ نسلوں میں بھی ہمیشہ کے لیے بغض وعداوت کی خلیجیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

والدین اوراولاد کے متنازعہ مسائل کی تفصیلات میں جھگڑوں کی وجوہات اوران کے تدارک وسدباب کے ذرائع پر بھی خصوصی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے اورقرآن وسنت کی روشنی میں ایسا منصفانہ حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نہ اولاد کی حق تلفی ہو اور نہ ہی والدین پر ظلم وزیادتی ہو بلکہ افہام وتفہیم اورادب واحترام سے زندگی کی گاڑی چلتی رہے اور خاندانی نظام کی مستحکم روایت قائم رہے۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی تعلیمات سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے اورمسائل کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اپنے مشاہدات و تجربات پر مبنی سچے واقعات بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض ابواب کے آخر میں متعلقہ موضوع پر دیگر اہل علم کے خیالات، آراء اور فتاوٰی بھی درج کر دیے گئے ہیں تا کہ زیر بحث موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

راقم الحروف اپنے علم کی حد تک یہ دعوٰی کر سکتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر آج تک کسی مصنف نے قلم نہیں اٹھایا جبکہ موجودہ حالات اس موضوع پر کسی جامع تصنیف کے متقاضی تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے راقم الحروف کو اس کی توفیق بخشی۔ کتاب کی تصنیف وتالیف سے اشاعت وطباعت تک ہر مرحلے پر ہم نے بہتری کی پوری کوشش کی ہے۔ اگراس کے باوجود کہیں کمی کوتاہی رہ گئی ہو تو قارئین ضرور مطلع فرمائیں۔ اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ وہ ہماری ان کاوشوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین!

طالب دعا

حافظ مبشر حسین

حِصّہ اَوّل

والدین کے حقوق وفرائض اوران کی اطاعت کی حدود

*......حقوقِ والدین اوراطاعتِ والدین

*......اطاعتِ والدین سے متعلقہ ضعیف روایات

*......والدین کے فرائض اوراولاد کے حقوق

*......والدین کے فرائض سے متعلقہ چند سوالات

*......والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کی حدود

*......والدین کونیکی کی تلقین اوراس کے آداب وضوابط

*......والدین کی فرمانبرداری کاصلہ اورنافرمانی کی سزا



باب ا:

حقوقِ والدین اور اطاعتِ والدین

[قرآن وحدیث کی روشنی میں]

اللہ تعالیٰ نے والدین کے دل میں فطری طور پر اپنی اولاد کے لیے بے پناہ محبت پیدا کر رکھی ہے، اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت اور بہتری کے لیے ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں، اپنی جوانی کی تمام تر صلاحیتیں اولاد کے بہتر مفادات کی خاطر صرف کر دیتے ہیں، اور ضرورت پڑنے پر جان کی بازی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اولاد سے محبت کی وجہ سے ہر بچے کے والدین یہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد کا مستقبل ہم سے بہتر ہو اور وہ ترقی کر کے ہم سے بھی آگے نکلے، ورنہ والدین کے علاوہ اور کوئی رشتہ ایسا نہیں جس میں ایک شخص دوسرے کا اپنے سے آگے بڑھ جانا دل سے پسند کرتا ہو۔ اِلَّامَاشَاءَ اللّٰہ!

اولاد کے لیے والدین کی انہی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے ہر دور میں اولاد بھی والدین کا ادب و احترام اور اہم معاملات میں ان سے مشاورت ضروری سمجھتی رہی ہے۔ تاہم دورِ جاہلیت میں جہالت، غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ایسی مثالیں بھی پیش آتی رہیں کہ والدین کی ہدایات کو بے جا مداخلت سمجھا جاتا، یا ان کی خدمت کو خواہ مخواہ کا بوجھ سمجھا جاتا اور ان سے جان چھڑانے کے لیے انہیں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والی آج کی مغربی تہذیب پھر سے اسی جاہلیت کو آج دہرا رہی ہے۔

اسلام میں والدین کی اطاعت وفرمانبرداری پر بڑا زور دیا گیا ہے، اور ہر شخص سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ والدین کے کسی بھی جائز اور معروف حکم کی خلاف ورزی نہ کرے، اور ان کی خدمت اس حد تک کرے کہ وہ دنیا میں اس سے راضی ہو کر مریں۔ والدین کی فرمانبرداری کی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی رضا کو اللہ کی رضا اور والدین کی ناراضگی کو اللہ کی ناراضگی قرار دیا!

آئندہ سطور میں ہم قرآن وحدیث کے منتخب حوالوں سے حقوقِ والدین اور اطاعتِ والدین کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے۔ ان شاء اللہ!

فصل ۱:

والدین کی اطاعت اوران سے حُسنِ سلوک

[قرآن مجید کی روشنی میں]

حقوق العباد میں سرِ فہرست حق والدین کا ہے:

انسان پر سب سے پہلے حقوق اللہ کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، کیونکہ انسان کو عدم سے وجود بخشنے والا صرف اور صرف ایک اللہ ہے، لہذا انسان کے خالق و مالک ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ کے حقوق ہر لحاظ سے فائق و برتر ہیں اور حقوق اللہ میں سرفہرست حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانا جائے اور توحیدِ باری تعالیٰ کا قولی و عملی اقرار کیا جائے۔ روزِ آخرت انسان کی نجات کا معیار یہی توحید باری تعالیٰ ہے۔

حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا معاملہ ہے۔ حقوق العباد میں سرفہرست والدین کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد انسان کا سب سے قریبی تعلق اپنے والدین سے ہوتا ہے۔ والدین ہی اس کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے دیگر انسانوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ وہی اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ نیکی اور حسنِ سلوک کیا جائے۔

قرآن مجید کی کم وبیش چار آیات میں اللہ تعالیٰ نے والدین کے حق کو اپنے حق کے متصل بعد ذکر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں والدین کے حقوق کی کیا اہمیت ہے۔ وہ چار آیات یہ ہیں:

۱۔﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾[سورة النسآء:٣٦]

''اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''

۲۔﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَاتَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾[سورة البقرة:٨٣]

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین سے حسنِ

سلوک کرنا۔"

۳۔﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [الانعام:۱۵۱]

"(اے نبی ﷺ) آپ کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیز پڑھ کر سناؤں جس کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمادیا ہے، وہ یہ ہے کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔"

٤۔﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا﴾[سورة الاسراء:۲۳]

"اور تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کو مت پوجو اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرو۔ اگر تم (اپنی زندگی میں) ان میں سے کسی ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پاؤ تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ ہی انہیں جھڑکو۔ بلکہ ان سے نرمی سے بات چیت کرو اور مہربانی سے اپنی عاجزی کا بازو، ان کے لیے جھکا دو اور یہ دعا کرو:

"اے میرے مالک! تو ان پر رحم کر جیسے انہوں نے (مجھ پر رحم کرتے ہوئے) بچپنے میں مجھے پالا پوسا۔" تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے (یعنی یہ کہ تم والدین سے نیکی کرو گے یا نافرمانی) اگر تم نیکی کرو گے تو وہ اللہ توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔"

اس آیت نمبر چار میں والدین کے حوالے سے درج ذیل نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ والدین کو ناراضگی سے 'اُف' بھی نہ کہا جائے۔

۲۔ انہیں تادیباً 'جھڑکا' نہ جائے۔

۳۔ ان سے نرمی اور اخلاق سے بات کی جائے۔

۴۔ ان کے سامنے عاجزی وانکساری کا اظہار کیا جائے۔

۵۔ والدین زندہ ہوں یا فوت شدہ، ان کے حق میں دعائے رحمت کی جائے۔

والدین کو 'اُف' نہ کہنے کا مطلب:

جہاں تک والدین کو 'اُف' کہنے سے روکنے کا معاملہ ہے تو اس حوالے سے یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ عام طور پر جب کسی انسان کے سامنے کوئی شخص غلطی کرتا ہے، تو وہ غصے اور ناراضگی سے 'اُف' کا کلمہ کہتا ہے:

''اُف!......(اُفوہ!) یہ تم نے کیا کر دیا!''

بڑھاپے کی عمر میں والدین عام طور پر کئی امراض وعوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم بھول چوک، نسیان، ذہول، سہو، بے چینی اور اضطراب تو معمولی باتیں ہیں۔ اب بھول چوک کی وجہ سے والدین سے کوئی خطا ہو جائے تو ظاہر ہے وہ ان کی خطا ہی شمار ہوگی اور خطا ہی پر انسان دوسروں کو 'اُف' کہتا ہے مگر والدین کی خطاؤں پر بھی انہیں اُف نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لیے قرآن مجید نے والدین کے سامنے اُف کہنے سے بھی روک دیا۔

جب خطا اور غلطی کی نوعیت سہو ونسیان سے ذرا سنگین ہو تو خطا کار کو سختی سے روکا اور منع کیا جاتا ہے۔ اس سختی کو دوسرے لفظوں میں جھڑکنا بھی کہا جا سکتا ہے۔ انسان اپنے ماتحتوں کو ان کی خطاؤں پر اگرچہ جھڑک سکتا ہے مگر والدین سے چھوٹی موٹی خطا ہو جائے تو اس پر انہیں جھڑکنے سے اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیت میں صاف منع فرما دیا ہے۔

دراصل بڑھاپے کی مشکلات میں والدین کا سہارا بننے اور انہیں آرام پہنچانے کے لیے انسان کی یہ تربیت کی جا رہی ہے کہ وہ صبر اور قوت برداشت پیدا کرے۔ اور بوڑھے والدین کی بڑھاپے کی ماری عجیب وغریب اور غلط سلط باتوں کو سن کر سیخ پا ہونے سے اپنے آپ کو بچائے۔ اس سلسلہ میں درج ذیل نصیحت آموز واقعہ پر ذرا غور کریں:

ایک صاحب بوڑھے ہو گئے، انہوں نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کر فاضل بنا دیا۔ ایک دن گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک کوا گھر کی دیوار پر آ کر بیٹھ گیا۔ باپ نے بیٹے سے پوچھا:

''بیٹا! یہ کیا چیز ہے؟''

بیٹے نے کہا: ''ابا جان! یہ کوا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد باپ نے پوچھا: ''بیٹا! یہ کیا چیز ہے؟''

بیٹے نے کہا: ''ابا جان! یہ کوا ہے۔''

پھر جب تھوڑی دیر گزر گئی تو باپ نے پوچھا: ''بیٹا یہ کیا ہے؟''

اس مرتبہ بیٹے نے قدرے سخت لہجہ میں کہا: ''ابا جان! ابھی تو آپ کو بتایا ہے کہ یہ کوا ہے!''

تھوڑی دیر گزرنے کے بعد پھر باپ نے پوچھ لیا: ''بیٹا یہ کیا ہے؟''

اب بیٹے کے لہجے میں اور تبدیلی آ گئی اور اس نے جھڑک کر کہا کہ: ''ابا جان! یہ کوا ہے کوا!''

پھر تھوڑی دیر بعد باپ نے بیٹے سے پوچھا: ''بیٹا! یہ کیا ہے؟''

اس مرتبہ بیٹے نے یہ کہا: ''آپ ہر وقت ایک بات پوچھتے رہتے ہیں، ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ یہ کوا ہے، آپ کی سمجھ میں نہیں آتا!''

اس کے ساتھ ہی بیٹے نے باپ کو سخت لہجہ میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد باپ اپنے کمرے میں گیا اور ایک پرانی ڈائری نکال لایا اور اس ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کو دکھاتے ہوئے کہا: ''بیٹا! یہ ذرا پڑھنا، کیا لکھا ہے؟''

چنانچہ اس نے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا:

''آج میرا چھوٹا بیٹا صحن میں بیٹھا ہوا تھا اور میں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں ایک کوا آ گیا تو بیٹے نے مجھ سے پچیس (۲۵) مرتبہ پوچھا کہ ابا جان! یہ کیا ہے؟ تو میں نے ۲۵ مرتبہ اس کو یہ جواب دیا کہ بیٹا یہ کوا ہے اور بیٹے کی اس اَدا پر مجھے بڑا پیار آیا۔''

اس کے پڑھنے کے بعد باپ نے بیٹے سے کہا:

''بیٹا، دیکھا! باپ اور بیٹے میں کتنا فرق ہے؟ جب تم بچے تھے تو تم نے مجھ سے پچیس (۲۵) مرتبہ پوچھا اور میں نے پچیس (۲۵) مرتبہ بالکل اطمینان سے صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ میں نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ مجھے اپنے بیٹے کی اس اَدا پر بڑا پیار آیا، اور آج جب میں نے تم سے صرف پانچ (۵) مرتبہ یہی بات پوچھی تو تمہیں اتنا غصہ آ گیا!''

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد عام طور پر اپنے والدین کے ساتھ اتنی شفقت و محبت کا اظہار نہیں کرتی جتنی ان کے والدین نے ان کے ساتھ کی ہوتی ہے۔ ہمیں اس صورتحال کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور والدین کے ساتھ اسی طرح نرمی اور رحمدلی سے پیش آنا چاہیے جس طرح انہوں نے رحمدلی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے ہماری تربیت کی ہے۔اور بڑھاپے کی عمر میں عادات واطوار کے حوالے سے انہیں اسی طرح سمجھنا چاہیے جس طرح اپنے چھوٹے بچوں کو سمجھتے ہیں۔

اسی طرح والدین کو بھی تھوڑا سا خیال کرنا چاہیے۔بعض والدین کے ہوش وحواس پوری طرح قائم ہوتے ہیں اور کوئی ذہنی بیماری یا پریشانی بھی نہیں ہوتی مگر اس کے باوجود وہ ہر وقت صاحبِ شعور اولاد کو ذرا ذرا سی بات پر روکتے ،ٹوکتے اور ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں۔ایک ہی کام اتنی مرتبہ دہراتے ہیں کہ بچے تنگ آ جاتے ہیں۔سمجھدار والدین کو خود ہی اس بات کا احساس کرنا اور خیال رکھنا چاہیے کہ بچوں کے سامنے کبھی ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے بچوں کو بدتمیزی یا حکم عدولی کا ارتکاب کرنا پڑے۔

حقوقِ والدین سے متعلقہ دیگر آیات:

۵۔﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُونَ شَهْرًا﴾[سورة الاحقاف:۱۵]

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنم دیا،اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔''

۶۔﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾[سورة لقمٰن:۱۴،۱۵]

''اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ (اچھا سلوک کرنے کی) نصیحت کی ہے۔ماں نے اس کو تھک تھک کر (اپنے پیٹ میں) اٹھایا،اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے (یعنی دو سال اس نے دودھ پلایا،اور ہم نے آدمی کو یہ حکم بھی دیا) کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر کرتا رہ۔اور میرے پاس ہی تمہیں لوٹ کر آنا ہے۔اگر وہ دونوں (یعنی والدین) تم پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مانو،ہاں دنیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے رہو۔''

۷۔﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾[سورة العنكبوت:۸]

''اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی نصیحت کی۔لیکن اگر والدین تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔''

ان تینوں آیات میں بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا تذکرہ ہے البتہ آخری دونوں آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ والدین اگر کفر وشرک یا اسلامی تعلیمات کے صریح منافی کوئی حکم دیں تو اس موقع پر ان کے والدین ہونے کے باوجود ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، تاہم یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ان کے ادب واحترام اور حقِ خدمت میں کمی نہ آنے پائے۔اس سلسلہ میں صحیح مسلم کا درج ذیل واقعہ قابلِ توجہ ہے:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی والدہ حمنہ بنت سفیان نے غصے میں آ کر کہا:

" وَاللّٰهِ لَا أَطْعَمُ طَعَامًا وَلَا أَشْرَبُ شَرَابًا حَتّٰى أَمُوْتَ أَوْ تَكْفُرَ "

''بخدا! میں اس وقت تک نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک کہ تم کفر کی طرف واپس نہ لوٹ آؤ، ورنہ میں اسی طرح جان دے دوں گی۔''

ان کی والدہ اپنے موقف پر اس قدر ڈٹ گئیں کہ زبردستی ان کا منہ کھول کر انہیں کھلایا پلایا جاتا جبکہ دوسری طرف وہ بیٹے کو یہ بھی کہتی تھی کہ جب تمہارا دین تمہیں کہتا ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرو، تو پھر تم میرا کہا کیوں نہیں مانتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾[سورة العنكبوت:٨]

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔لیکن اگر والدین تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔''(١)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں:

(١) [جامع ترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورة العنكبوت(ح٣١٨٩) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل سعد بن ابی وقاص(ح١٧٤٨)]

''میں اپنی والدہ سے بڑی محبت کیا کرتا تھا، جب میں نے اسلام قبول کرلیا تو میری والدہ کہنے لگی:
''نہ میں کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی، یہاں تک کہ تو اپنا دین چھوڑ دے یا میں اسی حال میں مرجاؤں گی۔''
چنانچہ (اس نے فاقہ شروع کردیا اور) وہ مجھے عار دلاتے ہوئے کہتی: ''او! اپنی ماں کے قاتل......!''
اسی طرح سارا دن گزر گیا حتی کہ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ چنانچہ میں نے بالآخر اپنی ماں کو یہ جواب دیا:
"يَا أُمَّاهُ لَوْ كَانَتْ لَكِ مِائَةُ نَفْسٍ فَخَرَجَتْ نَفْسًا نَفْسًا مَا تَرَكْتُ دِيْنِيْ هٰذَا فَإِنْ شِئْتِ فَكُلِيْ وَإِنْ شِئْتِ فَلَا تَأْكُلِيْ"
''اے اماں جان! [آپ کی تو ایک ہی جان ہے، لیکن] اگر آپ کی سو جانیں بھی ہوتیں اور وہ ایک ایک کر کے نکل جاتیں، تو میں پھر بھی اپنا دین اسلام نہ چھوڑتا۔ لہٰذا آپ کچھ کھائیں یا نہ کھائیں، آپ کی مرضی ہے!''(۱)
صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ
"فَجَعَلَتْ تَدْعُوْا عَلٰى سَعْدٍ"(۲)
''حضرت سعدؓ کی ماں نے انہیں بددعائیں دینا شروع کردی تھیں۔'' لیکن ظاہر ہے ماں باپ اگر ناجائز طور پر اولاد کے لیے بددعا کریں، تو وہ قبول نہیں ہوتی۔



(۱) تفسیر القرطبی، بذیل آیت مذکورہ (ج ۱۳ ص ۲۹۱) تفسیر قرطبی کے محقق 'عبدالرزاق مھدی' نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔]
(۲) [صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل سعد بن ابی وقاصؓ (ح ۱۷۴۸)]

فصل ۲:

والدین کی اطاعت اور ان سے حُسنِ سلوک

[احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں]

اللہ کی نظر میں محبوب ترین عمل:

☆......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

((سَأَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ؟ قَالَ: اَلصَّلٰوۃُ عَلٰی وَقْتِھَا، قَالَ: ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: ثُمَّ بِرُّالْوَالِدَیْنِ ،قَالَ: ثُمَّ اَیٌّ؟ قَالَ: اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))(1)

''میں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے کہا: پھر کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا۔ میں نے کہا: پھر کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

قرآن مجید کی طرح یہاں بھی پہلے حقوق اللہ (نماز) کا تذکرہ کیا گیا، اس کے بعد حقوق العباد کے حوالے سے حقوق الوالدین کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد جہاد جیسے افضل عمل کو رکھا گیا۔ یہ ترتیب نارمل حالات کی مناسبت سے ہے ورنہ نفل نماز پر والدین کی اطاعت مقدم ہے۔ اسی طرح جہاد اگر فرضِ عین ہو جائے تو پھر یہ والدین کی خدمت سے مقدم ہو جاتا ہے۔ [عصر حاضر میں جہاد اور والدین کی اجازت کے مسئلہ پر ہم اسی کتاب کے گیارہویں باب میں بالتفصیل روشنی ڈالیں گے۔ ان شاء اللہ!]

جنت والدین کے قدموں تلے ہے:

☆...... ((عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ جَاھِمَۃَ السُّلَمِیِّ اَنَّ جَاھِمَۃَ جَآءَ اِلَی النَّبِیِّ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ:

(1) [صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قولہ: ووصینا الانسان بوالدیہ (ح ۵۹۷۰) کتاب مواقیت الصلوۃ، باب فضل لوقتھا (ح ۵۲۷) ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی برالوالدین۔ نسائی، کتاب المواقیت، باب فضل الصلوۃ لمواقیتھا]

أَرَدْتُ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ، فَقَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ رِجْلَيْهَا)) (1)

''حضرت معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میرے باپ جاہمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! میں جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپؐ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر اس کی خدمت کر، بے شک جنت اس کے قدموں تلے ہے۔''

یہ ایک تمثیلی اندازِ بیان ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اپنی ماں کی خدمت کر کے اسے راضی کر لو گے تو جنت پا لو گے۔ اور اگر اس کی نافرمانی اور گستاخی کر کے اسے ناراض کر بیٹھو گے تو جہنم کی سزا پاؤ گے۔ یہاں اگرچہ ماں کے حوالے سے جنت کا ذکر ہے لیکن آگے بیان ہونے والی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ والد بھی اس فضیلت میں شامل ہے۔ تاہم حقِ خدمت کے سلسلہ میں والد کا درجہ والدہ کے بعد ہے مگر حقِ اطاعت میں یہ ترتیب الٹ ہے۔ حقِ اطاعت اور حقِ خدمت میں فرق اور اس سے متعلقہ تفصیل پانچویں باب [یعنی ''والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کی حدود''] میں ملاحظہ فرمائیے۔

والد جنت کا دروازہ ہے:

☆ ......حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ حدیث سنی:

((اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَاِنْ شِئْتَ فَاَضِعْ ذٰلِكَ الْبَابَ اَوِاحْفَظْهُ)) (2)

''والد جنت کا مرکزی دروازہ ہے، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس دروازے کو ضائع کرو (یعنی اس کو ناراض کر کے جنت سے محروم بنو) یا اس کی حفاظت کرو۔'' (یعنی اس کی خدمت کے راستے سے جنت میں داخل ہو جاؤ)۔

---

(1) [سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة (ح ٣١٠٦) الترغیب والترهیب (ج٣ ص ٢١٤) حاکم (ج٤ ص ١٥١) امام حاکم، امام ذہبی، علامہ منذری اور شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔]

(2) [جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء من فضل فی رضا الوالدین (ح ١٩٠٠) سنن ابن ماجه، کتاب الطلاق، باب الرجل یامره ابواه بطلاق امرأته (ح ٢٠٨٩) کتاب الادب (ح ٣٦٦٣) مسند احمد (ج٦ ص ٤٤٥) صحیح ابن حبان (ج٢ ص ١٤٧)]

سب سے زیادہ حسنِ سلوک کا حقدار کون ہے؟

☆......حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

((جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! مَنْ اَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ ؟ قَالَ اُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ: اُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: اُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ اَبُوْكَ)) (۱)

''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق کون رکھتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا تیری ماں۔ چوتھی مرتبہ اس نے پوچھا پھر کون؟ تو آپؐ نے فرمایا پھر تیرا باپ۔''

☆......((عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَبَرُّ؟ قَالَ: اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اُمَّكَ ثُمَّ اَبَاكَ)) (۲)

''بہز بن حکیم اپنے والد حکیم بن معاویہ سے اور وہ بہز کے دادا معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میں کس سے نیکی کروں؟ آپؐ نے فرمایا اپنی ماں سے، پھر اپنی ماں سے، پھر اپنی ماں سے، پھر اپنے باپ سے۔''

☆......((عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْ كَرِبَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ يُوْصِيْكُمْ بِاُمَّهَاتِكُمْ ثَلٰثًا اِنَّ اللّٰهَ يُوْصِيْكُمْ بِاٰبَائِكُمْ)) (۳)

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہیں یہ وصیت کرتا ہے کہ تم اپنی ماؤں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔'' [پھر آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا:] ''اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتے ہیں کہ تم اپنے باپوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔''

مذکورہ بالا احادیث میں والدہ کو والد پر جو ترجیح دی گئی ہے، اس کی وجہ سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔ اولاد کی

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من احق بحسن الصحبة (ح۵۹۷۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب برالوالدین وایهما احق به (ح۲۵٤۸)]

(۲) [سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی برالوالدین (ح۵۱۲۸)]

(۳) [سنن ابن ماجه، کتاب الادب، باب برالوالدین (ح۳٦٦۱)]

پیدائش اور پرورش کے سلسلہ میں جتنی مشکلات ایک ماں اٹھاتی ہے، اتنی باپ نہیں اٹھاتا۔ ہر بچے کو نو ماہ تک پیٹ میں اٹھانا، زندگی موت کے مراحل طے کر کے اسے جنم دینا، دو سال تک اپنا دودھ پلانا، بچے کا پیشاب پاخانہ صاف کرنا، گرمی اور سردی میں موسمی شدت خود برداشت کر کے اسے ہر ممکنہ راحت پہنچانا،...... یہ ایسی دشوار چیزیں ہیں جن کا سامنا صرف ایک ماں ہی کرسکتی ہے۔ ظاہر ہے انصاف اسی بات میں ہوسکتا تھا کہ ان مشقتوں کو برداشت کرنے کی وجہ سے ماں کا حقِ خدمت والد کے مقابلے میں زیادہ ہوتا۔ اسی انصاف کے پیش نظر اسلام میں والدہ کا حقِ خدمت والد کے مقابلے میں تین گنا زیادہ رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ماؤں کی کماحقہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

کیا والدین کا حق ادا ہوسکتا ہے؟

☆...... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَایَجْزِیْ وَلَدٌ وَالِدًا اِلَّا اَنْ یَّجِدَهُ مَمْلُوْکًا فَیَشْتَرِیَهُ فَیُعْتِقَهُ))(۱)

''کوئی بیٹا اپنے باپ کا حق ادا نہیں کرسکتا، البتہ یہ ایک صورت ہے کہ اگر وہ اپنے باپ کو غلام پائے تو اسے خرید کر آزاد کردے۔'' [تب اس کا حق ادا ہو جائے گا]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید اور فضیلت بیان کی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس فضیلت کے حصول کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرنے لگے۔ انہی حالات میں ہوسکتا ہے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں یہ بات بھی آئی ہو کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جس سے والدین کے حقوق کماحقہ پورے ادا ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ ایسی کوئی صورت نہیں البتہ یہ ایک صورت ہے کہ اگر کوئی اپنے باپ کو غلام پائے تو وہ اسے خرید کر آزاد کردے۔ اُس دور میں غلامی اور آزادی کی یہ صورتیں موجود تھیں مگر آج دنیا سے غلامی کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اس کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ اگر کسی کا باپ ناحق یا کسی جرم کی وجہ سے لمبی قید کی سزا میں ہو اور اسے تاوان وغیرہ کے ذریعے آزادی دلوانا ممکن ہو تو وہ اسے آزادی دلوادے۔

---

(۱) [صحیح مسلم، کتاب العتق، باب فضل عتق الوالد (ح ۱۵۱۰) جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی حق الوالدین (ح ۱۹۰۶)]

اللہ کی خوشنودی والدین کی خوشنودی میں:

☆......حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رِضَى الرَّبِّ فِيْ رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ))(1)

''رب کی خوشنودی والد کی خوشنودی میں ہے اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔''

اس حدیث میں اگرچہ والد کی رضامندی کا ذکر ہے، تاہم والدہ کی رضامندی بالتبع اس میں شامل ہے۔ اور جہاں تک والدین کی خوشنودی اور ناراضگی کا مسئلہ ہے، تو اس سلسلہ میں یہ بات یاد رہے کہ اس پر عمل اس وقت تک کیا جائے گا جب تک والدین کا حکم اللہ کے کسی حکم کے منافی نہ ہو۔ اور اگر اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی اس لیے کی جائے کہ والدین خوش ہو جائیں تو اس سے رب تعالیٰ تو کبھی خوش نہ ہوں گے، والدین خواہ لاکھ مرتبہ خوش ہوں! [اس کی تفصیل پانچویں باب یعنی: ''والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کی حدود'' میں ملاحظہ فرمایئے۔]

والدین کی اطاعت نفل نماز پر مقدم ہے:

☆......حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جُـرَیج ایک عابد وزاہد (راہب) شخص تھا، اس نے عبادت کے لیے (شہر سے باہر جنگل میں) ایک کٹیا (عبادت گاہ) بنا رکھی تھی۔ وہ اسی کٹیا میں رہتا تھا، ایک مرتبہ اس کی والدہ اس سے ملنے آئی تو وہ نماز (نفل) پڑھ رہا تھا، اس کی والدہ نے اسے پکارا: ''جُرَیج......!''

جریج نے (دل میں) کہا:

اے میرے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ (کیا کروں؟)

چنانچہ اس نے (والدہ کو جواب دینے کی بجائے) نماز جاری رکھی، حتی کہ اس کی والدہ واپس چلی گئی۔ دوسرے دن اس کی والدہ دوبارہ آئی مگر اس دن بھی جریج عبادت میں مصروف تھا۔ اس کی والدہ نے اسے پکارا: ''جُرَیج!''

---

(1) [جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء من الفضل فی رضا الوالدین (ح1899) مستدرك حاکم (ج4ص152) صحیح ابن حبان (ج2ص151)]

جریج نے (دل میں) کہا: اے میرے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ اس نے (اس مرتبہ بھی والدہ کو جواب دینے کی بجائے) نماز کو ترجیح دی، چنانچہ اس کی والدہ واپس چلی گئی۔

تیسرے دن اس کی والدہ پھر آئی مگر اس دن بھی جریج عبادت میں مصروف تھا۔ اس کی والدہ نے اسے پکارا: جریج! جریج نے (دل میں) کہا: اے میرے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ (کیا کروں؟) چنانچہ اس نے (والدہ کو جواب دینے کی بجائے) اب بھی اپنی عبادت کو ترجیح دی، حتی کہ اس کی والدہ نے (اس کے لیے بدعا کرتے ہوئے کہا) ''یا اللہ! جب تک جریج بدکارہ عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے، اسے موت نہ آئے۔''

ادھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں اس جریج کی عبادت وریاضت کا چرچا ہونے لگا، تو ایک فاحشہ عورت، جس کے حسن کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے، نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں جریج کو فتنہ میں مبتلا کرسکتی ہوں، چنانچہ وہ جریج کے پاس آئی اور اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کر دیا مگر جریج نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ چنانچہ وہ ایک چرواہے کے پاس چلی گئی جو جریج کی کٹیا کے پاس ٹھہرا کرتا تھا، اور اپنا آپ اس پر پیش کر دیا۔ اس چرواہے نے اس فاحشہ عورت کے ساتھ بدکاری کی جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ جب اس نے بچہ جنا تو لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ جریج کا بچہ ہے۔ لوگوں نے یہ سنا تو جریج کا محاصرہ کرلیا، اسے باہر نکالا اور اس کی کٹیا مسمار کر کے اسے مارنا شروع کر دیا۔

جریج نے کہا: ماجرا کیا ہے؟

انہوں نے کہا: تم نے فلاں فاحشہ سے بدکاری کی ہے جس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوا ہے۔

جریج نے کہا: وہ بچہ کہاں ہے؟

لوگ وہ بچہ لے آئے۔ جریج نے کہا: مجھے مہلت دو، میں نماز پڑھ لوں۔

چنانچہ اس نے نماز پڑھی اور فراغت کے بعد اس بچے کے پاس گیا اور اس کے پیٹ کو کچوکا دے کر کہا:

''اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟''

اس بچے نے کہا: فلاں چرواہا!

یہ کرامت دیکھ کر لوگوں نے جریج کے ہاتھ پاؤں چومنے شروع کر دیے، اور اس سے کہنے لگے کہ اب ہم تمہاری یہ کٹیا سونے کی بنا دیتے ہیں۔ جریج نے کہا: نہیں بلکہ جس طرح یہ پہلے مٹی کی تھی اسی طرح یہ مٹی کی بنا دو۔ چنانچہ لوگوں نے اس کی کٹیا دوبارہ مٹی کی بنا دی۔ (۱)

اولاد اور والدین کے باہمی تعلق کے حوالے سے اس حدیث میں درج ذیل نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ والدین کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے عبادت و ریاضت، دعوت و تبلیغ، اور جہاد وغیرہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا درست رویہ نہیں۔

۲۔ جہاں نوافل اور فرائض کا تصادم ہو وہاں فرائض کو ترجیح دی جائے گی۔ اسی لیے امام مسلم نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے: ''نفل نماز وغیرہ پر والدین کی خدمت کو ترجیح دینے کا بیان''

۳۔ والدین پر اگر ان کی اولاد ظلم کرے تو وہ ان کے حق میں بددعا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اولاد سے شفقت و مودت کی وجہ سے وہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔

۴۔ والدین کی اپنی اولاد کے لیے کی جانے والی دعا (خواہ نیک دعا ہو یا بد) رائیگاں نہیں جاتی، بشرطیکہ والدین حق پر ہوں۔

اولاد کے حق میں والدین کی دعا قبول ہوتی ہے:

☆...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِهٖ)) (۲)

''تین طرح کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہے:

۱۔ مظلوم کی دعا۔

۲۔ مسافر کی دعا۔

---

(۱) [صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تقدیم بر الوالدین علی التطوع بالصلاة وغیرها (ح۲۵۵۰) مزید دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب اذا هدم حائطا فلیبن مثله (ح۲۴۸۲۔ ۳۴۳۶)]

(۲) [جامع ترمذی، کتاب ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی دعوة الوالدین (ح۱۹۰۵) سنن ابن ماجة، کتاب الدعاء، باب دعوة الوالد ودعوة المظلوم]

۳۔ والدین کی دعا، اپنی اُولاد کے لیے۔"

والدین ہمیشہ اپنی اولاد کی بہتری، ترقی اور خیر خواہی چاہتے ہیں لیکن اگر اولاد کی بہتری کے لیے والدین کسی اور کی حق تلفی کرتے ہوئے دعا کریں تو ایسی دعا قبولیت کے زمرے میں داخل نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اگر والدین کسی معاملہ میں اپنی ہی اولاد کے لیے ناجائز اور بلاوجہ بددعا کریں جبکہ اولاد اس معاملہ میں بے قصور ہو تو ایسی دعا بھی اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگی۔ مختصر یہ کہ والدین کی دعا کی قبولیت کا تعلق جائز اور معروف معاملات سے ہے ناجائز امور سے نہیں!

والدین کے فرمانبردار کو دنیا میں مصیبت سے بچایا جاتا ہے:

☆...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین آدمی کہیں جا رہے تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی، انہوں نے ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پناہ لی۔ اتفاق سے پہاڑ کی ایک چٹان اوپر سے لڑھکی (اور اس نے اس غار کے منہ کو بند کر دیا جس میں یہ تینوں پناہ لیے ہوئے تھے) اب انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ اپنے کیے ہوئے کسی سب سے اچھے عمل کا نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس پر ان میں سے ایک نے یہ دعا کی:

"اے اللہ! میرے ماں باپ نہایت بوڑھے تھے، میں اپنے مویشی باہر لے جا کر چرایا کرتا تھا۔ پھر جب شام کو واپس آتا تو ان کا دودھ نکالتا اور برتن میں ڈال کر پہلے اپنے والدین کو پیش کرتا، جب میرے والدین پی چکتے تو پھر اپنی بیوی، اور بچوں کو پلایا کرتا تھا۔ اتفاق سے ایک رات واپسی میں دیر ہوگئی اور جب میں گھر لوٹا تو والدین سو چکے تھے۔ پھر میں نے پسند نہ کیا کہ انہیں جگاؤں، جبکہ بچے میرے قدموں میں بھوکے پڑے رو رہے تھے مگر میں برابر دودھ کا پیالہ لئے والدین کے سامنے اسی طرح کھڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ اے اللہ! اگر تیرے نزدیک بھی میں نے یہ کام صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، تو تو ہمارے لئے اس چٹان کو ہٹا کر اتنا راستہ تو بنا دے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: چنانچہ وہ پتھر کچھ ہٹ گیا۔ پھر دوسرے شخص نے یہ دعا کی:

"اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ مجھے اپنے چچا کی ایک لڑکی سے اتنی زیادہ محبت تھی، جتنی ایک مرد کو کسی

عورت سے ہوسکتی ہے۔اس لڑکی نے کہا تم مجھ سے اپنی خواہش اس وقت تک پوری نہیں کر سکتے جب تک مجھے سو اشرفی نہ دے دو۔ میں نے سو اشرفی حاصل کرنے کی کوشش کی اور آخر اتنی اشرفی جمع کر لی پھر جب میں اس کی دونوں رانوں کے درمیان بیٹھا تو وہ بولی: اللہ سے ڈر اور مہر کو ناجائز طریقے پر نہ توڑ۔ یہ سن کر میں کھڑا ہو گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔اب اگر تیرے نزدیک بھی میں نے یہ عمل تیری ہی رضا کے لیے کیا تھا تو تو ہمارے لیے (نکلنے کا) راستہ بنادے۔"

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: چنانچہ وہ پتھر دو تہائی حصہ ہٹ گیا۔ پھر تیسرے شخص نے یہ دعا کی: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں نے ایک مزدور سے ایک فرق جوار [یعنی ایک برتن بھر جوار ربعض روایات کے مطابق: ایک برتن بھر چاول کی مزدوری] پر کام کرایا تھا۔ جب میں نے اس کی مزدوری اسے دی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس جوار کو لے کر بو دیا (کھیتی جب کٹی تو اس میں اتنی جوار پیدا ہوئی کہ) اس سے میں نے ایک بیل اور ایک چرواہا خرید لیا، کچھ عرصہ بعد پھر اسی مزدور نے آکر مطالبہ کیا کہ خدا کے بندے مجھے میرا حق دے دے۔ میں نے کہا کہ اس بیل اور اس کے چرواہے کے پاس جاؤ کیونکہ یہ تمہارے ہی ملکیت ہیں۔اس نے کہا مجھ سے مذاق کرتے ہو! میں نے کہا، میں مذاق نہیں کرتا، واقعی یہ تمہارے ہی ہیں۔ (تو وہ انہیں لے کر چلتا بنا) اے اللہ! اگر تیرے نزدیک یہ کام میں نے صرف تیری رضا حاصل کرنے کے لیے کیا تھا تو تو ہمارے لیے (اس چٹان کو ہٹا کر) راستہ بنادے"۔

چنانچہ وہ غار پورا کھل گیا اور وہ تینوں شخص باہر آگئے۔"(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کے ساتھ کی جانے والی نیکی اس دنیا میں بھی بسا اوقات کام آجاتی ہے۔والدین کو دودھ پیش کرنے والے چرواہے کے واقعہ کی پوری تفصیلات تو نہیں ملتیں تاہم اسی حدیث میں مذکور واقعہ کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ چرواہا ایک غریب آدمی تھا، آمدن کم تھی اور بکریوں کے دودھ پر گزر بسر تھی۔ بکریوں کا دودھ بھی پہلے وہ اپنے بوڑھے والدین کو پیش کرتا پھر اپنی اولاد اور بیوی کی خبر لیتا۔ یہ بھی اس کی طرف سے والدین کی خدمت کا ایک پہلو تھا، تاہم اس کی زندگی میں ایسا موقع بھی

(۱) [صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب اذا اشتری شیئا لغیرہ بغیر اذنہ (ح ۲۲۱۵)]

آیا کہ والدین انتظار کر کے بھوکے سو گئے جبکہ بچے جاگ رہے تھے مگر بھوک سے نڈھال تھے۔اس نے سوچا کہ بچے بھوک برداشت کرلیں یہ اچھا ہے مگر والدین سے پہلے دودھ نہ پئیں۔دوسری طرف اس نے والدین کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے انہیں بیدار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔اور یہ بھی مناسب نہ سمجھا کہ خود دودھ پی کر سو جائے، بلکہ والدین کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا اور اسی انتظار کی حالت میں صبح ہوگئی!

یقیناً یہ اس شخص کی والدین کی خدمت کے حوالے سے بہت بڑی نیکی تھی۔

والدین کی اطاعت گناہوں کا کفارہ ہے:

☆......حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

((اَنَّ رَجُلًا اَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنِّیْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِیْمًا فَھَلْ لِّیْ تَوْبَۃٌ ؟ قَالَ: ھَلْ لَّکَ مِنْ اُمٍّ ؟ قَالَ لَا،قَالَ:ھَلْ لَّکَ مِنْ خَالَۃٍ ؟ قَالَ نَعَمْ،قَالَ: فَبِرَّھَا))[1]

''ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ [ایک روایت میں ماں کی بجائے والدین کا ذکر ہے] اس نے کہا نہیں۔پھر آپؐ نے پوچھا: کیا تیری خالہ زندہ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔تو آپؐ نے فرمایا: جا پھر اس کے ساتھ نیک سلوک کر۔''

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کبیرہ گناہوں کی معافی تو اللہ کے حضور توبہ ہی سے ہوتی ہے اس لیے اس حدیث میں جس شخص نے یہ کہا کہ ''میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔'' اس سے مراد کبیرہ گناہ نہیں تھا بلکہ کوئی صغیرہ گناہ ہی تھا مگر اس شخص نے اس صغیرہ کو بھی معمولی نہ سمجھا، ورنہ اگر وہ کبیرہ گناہ ہی ہوتا تو آنحضرت ﷺ اسے والدہ اور خالہ سے نیکی کرنے کی بجائے توبہ کا حکم دیتے۔تاہم اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کبیرہ گناہ ہی ہوا ہو اور اسے توبہ کے ساتھ اضافی طور پر والدہ اور خالہ کے ساتھ نیکی کرنے کی رغبت دلائی گئی ہو۔

علاوہ ازیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض صغیرہ گناہ والدین کی خدمت گزاری کی بدولت اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں۔

---

(۱) [جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ ،باب فی برالخالۃ (ح۱۹۰٤)مستدرک حاکم (ج٤ص۱۵۵)]

والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے:!

☆.....حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہ فرمایا:

((اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِاَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟۔ ثَلَاثًا۔ قُلْنَا: بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اقَالَ: اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ))(۱)

''کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے بڑے گناہ نہ بتاؤں؟'' ہم (صحابہؓ) نے کہا: اللہ کے رسولؐ! ضرور بتلایئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔''

گناہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (۱) صغیرہ گناہ۔ (۲) کبیرہ گناہ۔

صغیرہ گناہ تو عام طور پر مختلف نیک اعمال کے ساتھ خود بخود دھل جاتے ہیں، جبکہ کبیرہ گناہوں کے لیے اللہ کے حضور سچی توبہ اور معافی مانگنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان کبیرہ گناہوں میں سے بھی بعض گناہ چوٹی کے کبیرہ گناہ شمار ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی نافرمانی بھی انہی میں شامل ہے۔

والدین کے نافرمان پر پھٹکار:

☆.....((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَقِیَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ: اٰمِیْنَ ! اٰمِیْنَ ! اٰمِیْنَ! فَقِيْلَ لَهٗ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَاكُنْتَ تَصْنَعُ هٰذَا؟ فَقَالَ: قَالَ لِیْ جِبْرِيْلُ: اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَ عَبْدٍ اَوْ بَعُدَ، دَخَلَ رَمَضَانُ فَلَمْ يُغْفَرْ لَهٗ فَقُلْتُ اٰمِیْنَ، ثُمَّ قَالَ: رَغِمَ اَنْفُ عَبْدٍ اَوْ بَعُدَ، اَدْرَكَ وَالِدَيْهِ اَوْ اَحَدَهُمَا لَمْ يُدْخِلْهُ الْجَنَّةَ فَقُلْتُ اٰمِیْنَ، ثُمَّ قَالَ: رَغِمَ اَنْفُ عَبْدٍ اَوْ بَعُدَ، ذُكِرْتَ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيْكَ فَقُلْتُ اٰمِیْنَ))(۲)

''حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر چڑھے تو فرمایا: ''آمین! آمین! آمین!'' صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے پوچھا گیا: اللہ کے رسولؐ! ایسے آپ نے کیوں کہا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل امین علیہ السلام نے میرے سامنے یہ بددعا کی تھی:

---

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین من الکبائر (ح۵۹۷٦)]

(۲) [ابن خزیمه، باب استحباب الاجهاد فی العبادة فی رمضان (ح۱۸۸۸ ج۳ ص۱۹۲) ترمذی (ح۳۵٤٥)]

''اللہ اس آدمی کو ذلیل کرے جس نے ماہِ رمضان پایا مگر (اس مہینے میں بھی نیک عمل سے محروم رہنے کی وجہ سے) اس کو بخشا نہیں گیا۔''

تو میں نے کہا: آمین!

پھر جبرئیل علیہ السلام نے یہ بددعا کی: ''پھٹکار ہو اس آدمی پر جس نے اپنے والدین دونوں کو یا ان میں سے ایک کو پایا مگر (ان کی خدمت نہ کر کے) جنت میں جانے سے محروم رہا۔''

تو میں نے کہا: آمین!''

پھر جبرئیل علیہ السلام نے یہ بددعا کی: ''وہ شخص ذلیل ہو جائے جس کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جائے تو وہ آپ پر درود نہ پڑھے۔''

تو میں نے کہا: آمین!

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین اگر زندہ ہوں تو اسے اپنی سعادت سمجھنا چاہیے اور ان کی زندگی میں ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنی چاہیے، تاکہ ایک تو ان کی دعائیں حاصل کی جائیں اور دوسرا یہ کہ ان کی خدمت کر کے اپنی آخرت بہتر بنائی جائے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کے والدین زندہ ہوتے ہیں مگر وہ والدین کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں۔ معاذ اللہ!

والدین کو بُرا بھلا کہنے والا ملعون ہے:

☆......((عَنْ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنِي [رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ] بِكَلِمَاتٍ اَرْبَعٍ: لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَهُ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ آوٰى مُحْدِثًا وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْاَرْضِ)) (1)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چار باتیں بتائی تھیں:

۱۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اپنے ماں باپ کو لعنتی (اور برا بھلا) کہا۔

۲۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے غیر اللہ کے لیے جانور ذبح کیا۔

۳۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے کسی بدعتی کو جگہ دی۔

۴۔ اس پر بھی اللہ کی لعنت ہو جس نے (اپنی زمین بڑھانے کے لیے) زمین کی حدوں کو تبدیل کیا۔''

---

(1) [صحیح مسلم، کتاب الاضاحی، باب تحریم الذبح لغیر اللہ تعالیٰ ولعن فاعلہ (ح [illegible]) وفی روایۃ: مَنْ سَبَّ وَالِدَيْهِ (صحیح ابن حبان)]

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن ذات ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کے لیے جس قدر رحم دل اور مہربان ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بھی ستر بلکہ ننانوے گنا زیادہ اپنے بندے کے لیے رحم دل ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رَحْمَۃً لِلْعَالَمِیْن کہا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی رحمت ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی پر لعنت بھیجیں، مگر اس کے باوجود جن احادیث میں مختلف گناہوں کے مرتکب لوگوں پر لعنت کی گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی گناہ نہیں ہیں، تبھی تو ان کے مرتکب پر لعنت کی گئی اور انہیں ملعون قرار دیا گیا۔

والدین کو برا بھلا کہنے والا بھی ان ملعونوں میں شامل ہے۔ اللہ ہمیں اس گناہ سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

والدین کے نافرمان کی طرف قیامت کے دن اللہ دیکھنا بھی پسند نہیں فرمائیں گے:

☆...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ثَلٰثَةٌ لَا یَنْظُرُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ: اَلْعَاقُّ لِوَالِدَیْهِ وَالْمَرْاَةُ الْمُتَرَجِّلَةُ وَالدَّیُّوْثُ))(۱)

''تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی طرف (نظرِ رحمت سے) نہیں دیکھے گا:

۱۔ والدین کا نافرمان۔

۲۔ وہ عورت جو مردوں سے مشابہت اختیار کرتی ہے۔

۳۔ دیوث۔'' (اپنے گھر میں بے غیرتی برداشت کرنے والا)

ان تین طرح کے گنہگاروں کی طرف نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر نظرِ کرم نہیں فرمائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے اللہ کی نگاہوں سے تو یہ چھپ نہیں سکتے!

والدین کا نافرمان جہنم میں جائے گا:

☆...... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رَغِمَ اَنْفُ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفُهٗ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفُ قِیْلَ مَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ اَدْرَكَ اَبَوَیْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدَهُمَا اَوْ كِلَیْهِمَا فَلَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ))

(۱) [سنن نسائی، کتاب الزکوۃ، باب المنان بما اعطی (ح۲۵۶۳)]

''خاک آلود ہوناک اس کی، (پھر فرمایا) خاک آلود ہوناک اس کی، (پھر فرمایا) خاک آلود ہوناک اس کی۔ پوچھا گیا: اللہ کے رسول! کس شخص کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے ماں باپ دونوں کو یا ان میں سے ایک کو بوڑھا پائے پھر بھی (ان کی خدمت نہ کر کے) جنت میں جانے سے محروم رہے۔''(۱)

☆......حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنَّانٌ وَلَا عَاقٌ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ))(۲)

''بہت احسان جتانے والا، ماں باپ کا نافرمان اور ہمیشہ شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

جس طرح نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے نیک عملوں کی وجہ سے جنت کے انعامات سے نوازے گا، اسی طرح گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے جہنم کی سزا سے دوچار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ عادل، منصف ہے اور ظاہر ہے عدل کے تقاضوں کی وجہ سے جس کا جتنا اور جیسا عمل ہوگا، اتنا اور ویسا ہی اسے بدلہ دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کافر و مشرک جو توبہ کے بغیر مر جائے وہ کبھی بھی جنت میں نہیں جائے گا جبکہ اس کے علاوہ دیگر گناہوں کے مرتکب افراد کو ان کے گناہوں کے بقدر جہنم میں سزا دی جائے گی اور سزا پوری ہونے کے بعد انہیں جنت میں جانے کا موقع دیا جائے گا اور اگر اللہ کسی گنہگار کو معاف کر کے سیدھا جنت میں بھیج دے، تو یہ اس کا فضل و کرم ہے جس پر کوئی اسے پوچھنے والا نہیں!

مذکورہ بالا احادیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ والدین کے نافرمان بھی اپنے اس گناہ کی وجہ سے جہنم کی سزا کے مستحق ہیں۔ جب تک وہ سزا نہ پالیں تب تک جنت میں نہ جائیں گے، خواہ کتنے ہی موحد اور دیندار کیوں نہ ہوں۔ تاہم اللہ تعالیٰ کسی اور نیکی سے خوش ہو کر ان کی یہ سزا بھی معاف کر دیں تو یہ الگ بات ہے۔

والدین کے نافرمان کو دنیا میں سزا دی جاتی ہے:

☆......((عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَامِنْ ذَنْبٍ اَجْدَرُ اَنْ يُّعَجِّلَ اللّٰهُ لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ فِی الدُّنْيَا مَعَ مَايَدَّخِرُ لَهُ فِی الْاٰخِرَةِ مِثْلُ الْبَغْیِ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ))(۳)

حضرت ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی حدود کو پامال کرنے اور قطع

---

(۱) [صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل صلة اصدقاء الاب والام ونحوهما (ج۲ ص۳۱۴)]

(۲) [سنن نسائی، کتاب الاشربة، باب الروایة فی المدمنین فی الخمر (ح۵۶۷۵۔ح۲۵۶۳)]

(۳) [ابو دائود، کتاب الادب، باب فی النهی عن البغی (۴۸۹۴) ترمذی (ح۲۵۱۱) ابن ماجه (ح۴۲۱۱)]

رحمی کرنے کے علاوہ اور کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے مرتکب کو دنیا میں بھی اس کا عذاب دے اور آخرت میں بھی اس کے عذاب کو اس کے لیے جمع رکھے۔"

معلوم ہوا کہ بلاوجہ قطع رحمی کرنا گناہ کا کام ہے اور یہ اللہ کو اتنا ناپسند ہے کہ اس پر دنیا میں بھی انسان کی پکڑ ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ انسان کے سب رشتوں ناتوں میں سے بہترین اور قریب ترین رشتہ والدین کا ہے۔ لہذا جو شخص اپنے والدین سے بے رخی کرے گا، ان کے حقوق نظر انداز کرے گا، ان سے حسن سلوک نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اسے اس کی سزا دیں گے اور آخرت میں بھی اسے عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی درج ذیل روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

((كُلُّ الذُّنُوبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَاشَاءَ إِلَّا عُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ فَإِنَّهُ يُعَجِّلُ لِصَاحِبِهِ فِي الْحَيَاةِ قَبْلَ الْمَمَاتِ))[1]

"والدین کی نافرمانی کے علاوہ اگر اللہ چاہے تو ہر گناہ معاف کر دے، [سوائے شرک کے] جبکہ والدین کے نافرمان کو موت سے پہلے دنیا ہی میں عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔"

اس کی مزید تفصیلات اور اس موضوع سے متعلقہ بعض واقعات کے لیے اس کتاب کا ساتواں باب [یعنی "والدین کی فرمانبرداری کا صلہ اور نافرمانی کی سزا...... دنیا میں"] ملاحظہ فرمائیں۔

کافر ماں باپ کے ساتھ بھی حسنِ سلوک:

☆......((عَنْ أَسْمَاءَ ابْنَةِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَتْ أَتَتْنِي أُمِّي رَاغِبَةً فِي عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ أَصِلُهَا؟ قَالَ: نَعَمْ۔ وَفِي رِوَايَةٍ۔ قَدِمَتْ أُمِّي وَهِيَ مُشْرِكَةٌ))[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ کے دور کی بات ہے کہ میری ماں جو مشرکہ تھی، وہ مال کے لالچ میں میرے پاس آئی تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: "کیا میں اس سے حسنِ سلوک کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، اس سے اچھا سلوک کر۔"

---

(۱) [شعب الایمان از امام بیھقی، باب فی برالوالدین (ج٦ ص٢٠٢) اس کی سند کمزور ہے مگر اس میں بیان ہونے والا مسئلہ پچھلی صحیح حدیث سے بھی ثابت ہو رہا ہے۔]

(۲) [صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صلة الوالد المشرك (ح٥٩٧٨۔ ٢٦٢٠)]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا کفر وشرک اس بات سے رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اس سے بے رخی اور سخت روی کا مظاہرہ کریں۔ اس کے کفر وشرک کے عمل سے تو نفرت ضرور ہونی چاہیے مگر اس کے وجود سے نفرت کا آپ کو کوئی حق نہیں، اس لیے کہ اسے بھی ایک انسان کی حیثیت سے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے جس طرح آپ کو پیدا کیا ہے۔ یہ تو عام کفار ومشرکین کا معاملہ ہے جبکہ والدین اگر کافر ومشرک ہوں تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت اس لیے بڑھ جائے گی کہ وہ والدین ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اگر کافر ومشرک کے ساتھ حسنِ سلوک اور اچھا برتاؤ کیا جائے تو عین ممکن ہے وہ آپ کے اسی عمل سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لے۔ خود نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے حسنِ عمل سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔



باب۲:

حقوقِ والدین سے متعلقہ چند ضعیف روایات

اس بات میں کوئی شک نہیں اللہ تعالیٰ نے والدین کو بہت سے حقوق سے نوازا ہے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں دنیا و آخرت کی بھلائیاں رکھ دی ہیں۔ ان کی رضامندی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی اور ان کی ناراضگی کو اپنی ناراضگی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے حقِ خدمت کو تمام انسانوں سے فائق وبرتر قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کے مستند دلائل ہم نے پچھلے باب میں آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ اس باب میں حقوق والدین سے متعلقہ چند ضعیف روایات پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ہمارے ہاں بعض خطیب و مبلغ حضرات ان ضعیف روایتوں کو بڑی مبالغہ آرائی اور شدومد سے بیان کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ان ضعیف روایتوں کی بجائے صحیح روایتیں عوام کے سامنے بیان کریں۔

حدیث کی صحت و ضعف میں اصول حدیث کی فنی تفصیلات چونکہ عام قارئین کے لیے خشک بحث سے زیادہ اور کچھ نہیں، اس لیے اس سے اجتناب کرتے ہوئے چند ضعیف روایات کی محض نشاندہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں عالمِ عرب کے مشہور و معروف محدث علامہ ناصر الدین البانیؒ کی تحقیقات سے بالعموم استفادہ کیا گیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے ان روایات کے حواشی میں دیے گئے مصادر کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

پہلی ضعیف روایت:

☆......عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:

((مَـامِـنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُاِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً قَالُوْا: وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ ؟قَالَ:نَعَمْ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ!))[1]

---

(۱) [سلسلة الاحاديث الضعيفة والموضوعة.از علامه ناصرالدين البانیؒ(ج٦ ص٢٤٢،٢٤٣)شعب الايمان ازامام بيهقی، باب فی برالوالدين(ج٦ ص٢٠٢ - ح٧٨٥٩)]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''والدین کا جو فرمانبردار بچہ اپنے والدین کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر نظر کے بدلے ایک حج مبرور کا ثواب لکھ دیتا ہے۔''

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا:

''اگر چہ وہ ہر روز سو مرتبہ اپنے والدین کو دیکھے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہاں! اگر چہ وہ سو مرتبہ دیکھے، اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑا اور سب سے پاکیزہ ہے۔''

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ''خواہ وہ ایک دن میں ایک لاکھ مرتبہ والدین کو دیکھے؟''

تو آپ ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں، اگر چہ وہ ایک دن میں ایک لاکھ مرتبہ دیکھے!''[1]

ایک اور ضعیف روایت میں ہے کہ ''اگر کوئی باپ اپنے بچے کی طرف خوشی اور پیار کی نظر سے دیکھے تو اسے ہر ایک نظر پر ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: ''اگر چہ وہ ایک دن میں تین سو ساٹھ مرتبہ اپنے بچے کو دیکھے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!''[2]

دوسری ضعیف روایت:

☆......عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

((مَنْ قَبَّلَ بَيْنَ عَيْنَيْ أُمِّهِ كَانَ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))[3]

''جس شخص نے اپنی ماں کی دونوں آنکھوں کے درمیان چوما، اس کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ جہنم کے درمیان رکاوٹ بنا دیں گے۔''

یہ روایت ضعیف بلکہ من گھڑت (موضوع) ہے مگر اس کا یہ معنی نہیں کہ ماں کے ماتھے کو چوما نہیں جا سکتا، البتہ اس عمل پر اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے وہ فضیلت بیان نہیں کی جا سکتی جو اس ضعیف روایت میں بیان کی گئی ہے۔

---

(۱) [سلسلة الاحاديث الضعيفة (ج۷ص۳۰۴۔ح۳۲۹۸)] (۲) [ايضا (ج٦ص۲۳۹ح۲۷۱٦)]

(۳) [ايضا، سلسلة الاحاديث الضعيفة(ج۳ص۳۹٦۔ح۱۲٤٥) علامہ البانیؒ اور ابن جوزیؒ نے اسے موضوع (من گھڑت) روایت قرار دیا ہے۔ الموضوعات لابن الجوزیؒ (ج۳ص۸٦) اللآلیء المصنوعة(ج۲ص۲۹٥)]

تیسری ضعیف روایت:

☆......حضرت عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا:

''فلاں نوجوان موت کی کشمکش میں ہے، اسے کہا گیا کہ ''لاالٰہ الّا اللّٰہ'' پڑھ لے مگر اس سے پڑھا ہی نہیں جارہا!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: ''کیا وہ نوجوان نمازی ہے؟''

اس نے کہا: ہاں!

چنانچہ آپؐ اٹھے اور ہم بھی آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نوجوان کے پاس آئے اور اسے کہا: ''لاالٰہ الّا اللّٰہ'' پڑھ!

اس نے کہا: ''میں پڑھنا چاہتا ہوں مگر مجھ سے پڑھا ہی نہیں جاتا!''

راوی کا کہنا ہے کہ دراصل وہ اپنی والدہ کا نافرمان تھا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

''کیا اس کی ماں زندہ ہے؟''

لوگوں نے کہا: ہاں!

آپؐ نے فرمایا کہ اسے بلاؤ، لوگ اس کی والدہ کو بلا لائے، جب وہ آئی تو آپؐ نے اس سے پوچھا:

''یہ تیرا بیٹا ہے؟''

اس نے کہا: ہاں۔

آپؐ نے اس عورت سے کہا: ''اگر آگ کا الاؤ روشن کیا جائے اور تجھ سے کہا جائے کہ اگر تو اس بیٹے کو معاف کردے گی تو ہم اس کو چھوڑ دیں گے اور اگر تو اسے معاف نہ کرے گی تو ہم اسے اس آگ میں جلا کر راکھ کردیں گے، تو کیا تو اس کو معاف کردے گی؟''

اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیوں نہیں، میں اس کو ضرور معاف کردوں گی۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تو اللہ کو اور مجھے گواہ بنا کر کہہ دے کہ تو اس بیٹے سے راضی ہوگئی ہے!''

اس نے کہا: ''یا اللہ! میں تجھے اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ بے شک میں اپنے بیٹے

سے راضی ہوگئی ہوں اور میں نے اسے معاف کردیا ہے۔''
اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اس نوجوان سے کہا:''اے نوجوان!'' یہ کلمہ پڑھ......لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْـدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' اس مرتبہ اس نے یہ کلمہ پڑھ لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے میرے ذریعے اس نوجوان کو (جہنم کی) آگ سے بچالیا۔''[1]

چوتھی ضعیف روایت:

☆......عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:
((مَنْ اَصْبَحَ مُطِیْعًا لِلّٰهِ فِیْ وَالِدَیْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ کَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا،وَمَنْ اَمْسٰی عَاصِیًا فِیْ وَالِدَیْهِ اَصْبَحَ لَهٗ بَابَانِ مَفْتُوْحَانِ مِنَ النَّارِ اِنْ کَانَ وَاحِدًا فَوَاحِدًا قَالَ رَجُلٌ :وَاِنْ ظَلَمَاهُ؟ قَالَ:وَاِنْ ظَلَمَاهُ ، وَاِنْ ظَلَمَاهُ ،وَاِنْ ظَلَمَاهُ))[2]
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''جو شخص اللہ کا حکم سمجھتے ہوئے اپنے ماں باپ کی فرمانبرداری میں صبح کرتا ہے،اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر ان (ماں باپ میں سے) ایک زندہ ہے تو پھر جنت کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور جو شخص ان کی نافرمانی میں صبح کرتا ہے،اس کے لیے دوزخ کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر ان (ماں باپ میں سے) ایک زندہ ہو تو پھر جہنم کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔''
ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا:
''اگر چہ والدین اپنی اولاد پر ظلم ہی کرنے والے ہوں؟''
آپ ﷺ نے فرمایا:
''ہاں! اگر چہ وہ اس پر ظلم کریں، اگر چہ وہ اس پر ظلم کریں، اگر چہ وہ اس پر ظلم کریں۔''

(۱) [الترغیب والترھیب،للمنذریؒ(ج۳ص۵۴۷،۵۴۸)الموضوعات، لابن الجوزیؒ(ج۱ص۸۷)]
(۲) [علامہ البانیؒ نے اسے ابن ابی ایاس نامی راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے دیکھیے:مشکوٰۃ ،تحقیق از علامہ البانیؒ (ج۳ص۱۳۸۲)الادب المفرد،باب بر والدیہ وان ظلما(ح۷ص۱۲)شعب الایمان ازامام بیہقی، باب فی بر الوالدین(ج۶ص۲۰۲۔ح۷۹۱۶)اس سند سے یہ روایت ابن عباسؓ سے موقوفاً مروی ہے۔]

یہ حدیث بھی ضعیف ہے تاہم یہاں یہ بات یادر ہے کہ جس طرح عدل وانصاف ایک نیکی ہے اوراس پراللہ کے ہاں عادل ومنصف شخص کوثواب ملتا ہے،اسی طرح ظلم وزیادتی بھی ایک گناہ ہے جس پر ظالم کواللہ کے ہاں سزا ملے گی۔والدین اگر ظالم ہوں تو وہ خود اللہ کے ہاں مجرم ہوں گے۔البتہ ان کے ظلم پر صبر کرنے والا یقیناً بے پناہ اجروثواب کا مستحق قرار پائے گا۔

پانچویں ضعیف روایت:

☆......عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَيَمُوْتُ وَالِدَاهُ اَوْاَحَدُهُمَا وَاِنَّهُ لَهُمَا لَعَاقٌ فَلَايَزَالُ يَدْعُوْ لَهُمَا وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمَا حَتّٰى يَكْتُبَهُ اللّٰهُ بَارًّا))(1)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کسی شخص کے ماں باپ دونوں یا دونوں میں سے ایک اس حال میں فوت ہو جائے کہ وہ ان کا نافرمان ہو،مگر والدین کی وفات کے بعد وہ ان کے لیے ہمیشہ بخشش کی دعا کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ اسے (والدین کے نافرمان کی بجائے) فرمانبردار لکھ دیتے ہیں۔''

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا مقصود یہ ہے کہ انہیں زندگی میں راحت وسکون پہنچایا جائے۔جس نے زندگی میں انہیں دکھ پہنچایا ہو اس سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعائیں کرے گا،ہاں اللہ چاہے تو کسی بدبخت کو یہ توفیق بھی مل سکتی ہے۔لہٰذا اگر کسی شخص نے بھول کر یا جان بوجھ کر اپنے والدین کو دکھ پہنچایا ہو اور ان کے مرنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو تو پھر اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں کہ وہ ایک طرف تو اپنی غلطی کی اللہ کے حضور سچے دل سے معافی مانگے اور دوسری طرف اپنے والدین کے لیے بخشش ومغفرت کی دعائیں کرتا رہے اور ان کی طرف سے صدقہ وخیرات بھی کرے۔امید ہے اس طرح اس کی معافی کی صورت نکل آئے۔یا اس نیکی کی وجہ سے روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اس کے والدین کو اس سے خوش کردیں۔اور جو شخص زندگی میں بھی والدین کا نافرمان رہا اور ان کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان کا شاکی رہا،اس کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔

---

(۱) [السلسلة الضعيفة،از البانیؒ (ج۲ص۳۱۶۔ح۹۱۵)مشكوة ،بتحقيق البانیؒ(ج۲ص۴۲۱)الموضوعات لابن الجوزی(ج۳ص۸۸)شعب الایمان ازبیهقی، باب فی برالوالدین(ج۶ص۲۰۲۔ح۷۹۰۲)]

چھٹی ضعیف روایت:

☆......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ، مَنْ شِئْنَ اَدْخَلْنَ وَمَنْ شِئْنَ اَخْرَجْنَ))[1]

"جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے، لہٰذا جسے وہ چاہیں گی جنت میں داخل کردیں گی اور جسے وہ چاہیں گی جنت سے محروم کردیں گی۔"

اس روایت کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ "جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے"۔ یہ بات بعض صحیح روایات سے بھی ثابت ہے جیسا کہ پچھلے باب میں گزر چکا ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا حصہ کہ "جسے وہ چاہیں گی جنت میں داخل کردیں گی اور جسے وہ چاہیں گی جنت سے محروم کردیں گی۔" یہ کسی بھی صحیح سند کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

ساتویں ضعیف روایت:

☆......حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((دُعَاءُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ مِثْلُ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ لِاُمَّتِهٖ))[2]

"باپ کی دعا اپنے بیٹے کے حق میں ایسے ہی ہے جیسے نبی کی دعا اپنی امت کے حق میں ہوتی ہے۔"

والدین کی دعا کو پیغمبر کی دعا کے مشابہ قرار دینا درست نہیں۔ تاہم پچھلے باب میں موجود صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے لیے کی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔

آٹھویں ضعیف روایت:

☆......حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بَرُّوْا آبَائَكُمْ تَبَرُّكُمْ اَبْنَائُكُمْ))[3] "والدین سے نیکی کرو، تمہاری اولاد تم سے نیکی کرے گی۔"

ابن جوزیؒ اور شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف جبکہ منذریؒ، ہیثمیؒ اور حسین العفانی نے [الجزاء من

---

(1) [السلسلة الضعيفة، از علامہ البانیؒ (ج۲ ص۵۹۔ ح۵۹۳) شیخ البانی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔]

(2) [ایضاً السلسلة الضعيفة (ج۲ ص۲۰۳۔ ح۷۸٦) شیخ البانی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔ نیز دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزی (ج۳ ص۸۷)]

(3) [الضعيفة (ج۵ ص۵۷۔ ح۲۰۳۹) الموضوعات لابن الجوزی (ج۳ ص۸۵) حاکم (ج٤ ص۱۵٤)]

جنس العمل میں اسے] صحیح کہا ہے۔ اختلاف سے قطعِ نظر تجربات بھی یہ بتاتے ہیں کہ اس میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ عمومی حیثیت میں صحیح ہے یعنی جو لوگ اپنے والدین کی نافرمانی کرتے ہیں، عام طور پر ان کی اولاد ان سے بڑھ کر ان کی نافرمان ثابت ہوتی ہے۔ [اس کتاب کا ساتواں باب اسی موضوع پر ہے]

البتہ بعض اوقات آزمائش کے لیے نیک لوگوں کی اولاد بد عمل اور گنہگار لوگوں کی اولاد نیک عمل بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت نوحؑ جیسے پیغمبر کا بیٹا ان کا نافرمان تھا۔

نوویں ضعیف روایت:

☆...... حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے اپنی ماں کو سخت گرم پتھریلی زمین میں اپنے کندھوں پر اٹھا کر چھ میل کا سفر طے کیا ہے۔ وہ زمین اتنی گرم تھی کہ اگر میں گوشت کا ٹکڑا اس پر ڈال دیتا تو وہ بھی اس پر بھونا جاتا، تو کیا اب میں نے ماں کے احسانات کا بدلہ ادا کر دیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ تو تیری ماں کی دردِ زہ کی ایک ٹیس کا بدلہ بھی بمشکل ہوا ہوگا۔''

حافظ ابن کثیرؒ نے مسند بزار کے حوالے سے یہی روایت اس طرح نقل کی ہے:

''حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی اپنی ماں کو کندھوں پر اٹھا کر بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، اسی حالت میں اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''کیا میں نے اپنی ماں کا حق ادا کر دیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، ابھی تو تم نے اس کے ایک سانس کا بھی حق ادا نہیں کیا۔''(1)

اسی سے ملتی جلتی ایک موقوف (حضور کی بجائے صحابیؓ سے مروی) روایت میں ہے کہ

ایک یمنی آدمی نے اپنی ماں کو اپنے کمر پر سوار کر کے بیت اللہ کا طواف کیا، بعد میں اس نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آ کر پوچھا: ''کیا میں نے اپنی ماں کا حق ادا کر دیا ہے؟'' حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ابھی تو تم اپنی والدہ کے ایک سانس کا بھی حق ادا نہیں کر سکے......!''(2)

دسویں ضعیف روایت:

☆......عن ابی الطفیلؓ قال:

(1) [تفسیر ابن کثیر، بذیل سورۃ الاسراء، آیت ۲۳ (ج ۳ ص ۶۰) حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔]

(2) [الأدب المفرد، للبخاری، باب جزاء الوالدین (ص ۱۳۔ ح ۱۱)]

((رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقْسِمُ لَحْمًا بِالْجِعِرَّانَةِ اِذَا اَقْبَلَتِ امْرَاَۃٌ حَتّٰی دَنَتْ اِلَی النَّبِیِّ فَبَسَطَ لَهَا رِدَاءَهُ فَجَلَسَتْ عَلَیْهِ فَقُلْتُ :مَنْ هِیَ؟ فَقَالُوْا:هِیَ اُمُّهُ الَّتِیْ اَرْضَعَتْهُ))[1]

حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ ''جِعِرَّانَه'' نامی جگہ میں گوشت تقسیم کر رہے تھے، کہ ایک عورت آپ کی طرف آئی حتی کہ وہ آپ ﷺ کے بالکل قریب آ گئی، چنانچہ آپؐ نے اس کے لیے اپنی چادر پھیلائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے (صحابہؓ سے) کہا: یہ کون ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا: یہ آپ ﷺ کی رضاعی ماں ہے۔''

اس حدیث میں والدین کے لیے جس خدمت کا ذکر ہے، وہ دیگر صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے، اس کے علاوہ اس حدیث سے کوئی اور شرعی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ محض تاریخی حیثیت سے اسے اگر بیان کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگلی حدیث بھی اسی سلسلہ میں ہے۔

گیارہویں ضعیف روایت:

☆......اَنَّ عُمَرَ بْنَ السَّائِبِ حَدَّثَهُ اَنَّهُ بَلَغَهُ :

((اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ کَانَ جَالِسًا یَوْمًا فَاَقْبَلَ اَبُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ فَوَضَعَ لَهُ بَعْضَ ثَوْبِهِ فَقَعَدَ عَلَیْهِ ثُمَّ اَقْبَلَتْ اُمُّهُ فَوَضَعَ لَهَا شِقَّ ثَوْبِهِ مِنْ جَانِبِهِ الْآخَرِ فَجَلَسَتْ عَلَیْهِ ثُمَّ اَقْبَلَ اَخُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ فَقَامَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَجْلَسَهُ بَیْنَ یَدَیْهِ))[2]

''عمر بن سائب فرماتے ہیں کہ انہیں یہ بات پہنچی کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ ﷺ کا رضاعی باپ اُدھر آ نکلا۔ آپؐ نے اس کے لیے اپنا کچھ کپڑا بچھا دیا اور وہ اس پر بیٹھ گیا، پھر اسی اثنا آپ کی رضاعی ماں بھی وہاں آ گئی تو آپؐ نے کپڑے کی دوسری جانب اس کے لیے بچھا دی اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ پھر آپ کا رضاعی بھائی بھی آ گیا، تو آپؐ اس کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے پھر آپؐ نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔''

---

(۱) [ضعیف ابو داؤد (ص۵۰۹) کتاب البر، باب فی بر الوالدین (ح۵۱۴٤) مشکوٰۃ، تحقیق از البانیؒ (ج۳ ص۱۳۸۰)]

(۲) [ایضاً ضعیف ابو داؤد (ح۵۱٤۵) سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة (ج۳ ص۲٤٦۔ ح۱۱۲۰)]

بارہویں ضعیف روایت:

☆......عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ:

((یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! مَاحَقُّ الْوَالِدَیْنِ عَلٰی وَلَدِ هِمَا؟قَالَ:((هُمَا جَنَّتُكَ وَنَارُكَ)) (1)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا:

''اے اللہ کے رسول ! والدین کا اپنی اولاد پر کیا حق ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''والدین تمہاری جنت ہیں (اگر تم ان کی اطاعت کرو) اور وہی تمہاری دوزخ ہیں۔'' (اگر تم ان کی نافرمانی کرو)

یادرہے کہ اس روایت کی سند تو ضعیف ہے مگر اس سے ملتی جلتی بعض صحیح روایات پچھلے باب میں گزر چکی ہیں اور والدین کے جنت یا جہنم ہونے کا مطلب بھی پیچھے بیان ہو چکا ہے۔

تیرہویں ضعیف روایت:

☆......عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :

((ثَلَاثٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ نَشَرَاللّٰهُ عَلَیْهِ کَنَفَهُ [وَفِیْ رِوَایَةِ الْمِشْکٰوةِ: یَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهُ] وَاَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ ، رِفْقٌ بِالضَّعِیْفِ وَالشَّفَقَةُ عَلَی الْوَالِدَیْنِ وَالْاِحْسَانُ اِلَی الْمَمْلُوْكِ)) (2)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس میں تین چیزیں ہوں، اسے اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں [ایک روایت کے مطابق: اس کی موت (کی سختی) اللہ تعالیٰ آسان فرمادیں گے] اور اسے جنت میں داخل کریں گے (وہ چیزیں یہ ہیں)

۱۔ کمزور اور ناتواں کے ساتھ نرمی کرنا۔

۲۔ ماں باپ سے نرمی کرنا۔

۳۔ اپنے غلاموں سے احسان کرنا۔''

---

(۱) [ضعیف سنن ابن ماجه ،ازالبانیؒ (ص۲۹٦) کتاب الأدب،باب فی برالوالدین(ح۳٦٦۲)]

(۲) [ضعیف ترمذی،ازعلامه البانیؒ (ص۲۸۵) کتاب صفة القیامة،باب فیه اربعة احادیث......(ح۲٤۹٤) مشکوٰة بتحقیق البانیؒ(ح٤٦٦۳)]

یہ حدیث تو ضعیف ہے تاہم اس میں ذکر کیے گئے تینوں کام بڑے اجر والے ہیں کیونکہ دیگر احادیث میں ان کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک مختلف فیہ حدیث:

☆......عن ابی اَسِید اَلسَّاعِدِیؓ قال:

((بَيْنَـا نَـحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِذْجَاءَ رَجُلٌ مِنْ بَنِیْ سَلَمَةَ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ اَبَوَیَّ شَیْءٌ اَبَرُّهُمَا بِهٖ بَعْدَ مَوْتِهِمَا؟ قَالَ: نَعَمْ، اَلصَّلَاةُ عَلَيْهِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمَا وَاِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِ هِمَا وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَا تُوْصَلُ اِلَّا بِهِمَا وَاِكْرَامُ صَدِيْقِهِمَا))(1)

حضرت ابواُسید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ بنوسلمہ قبیلے کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا:

''کیا والدین کے حوالے سے میرے لیے کوئی ایسی نیکی باقی ہے کہ میں ان کے مرنے کے بعد بھی اسے کر سکوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہاں! ان کے لیے (بلندیٔ درجات کی) دعا کرنا، بخشش طلب کرنا، ان کے کیے ہوئے وعدے پورے کرنا اور اس رشتہ داری کو ملانا جو ان کے ساتھ ہی ملائی جا سکتی ہے اور ان کے دوستوں کی عزت وتکریم کرنا۔''

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو علی (مولی ابی اسید) نامی ایک غیر معروف راوی [جسے ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے] کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ بعض دیگر محققین مثلاً امام حاکمؒ، امام ذھبیؒ، امام ابن حبانؒ وغیرہ کے بقول یہ روایت صحیح ہے۔ محقق عبدالرزاق مھدی نے بھی تفسیر قرطبی کی تخریج میں اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔(2)

علاوہ ازیں اس حدیث میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں، وہ دیگر صحیح روایات سے بھی ثابت ہیں۔

(1) [ضعيف ابن ماجه، تحقيق البانيؒ (ص٢٩٦-٣٦٦٤) السلسلة الضعيفة (ج٢ص٦٢-ح٥٩٧) مشكوة، تحقيق از البانیؒ (ج٢ص١٣٨٠) ابوداؤد، كتاب الادب، باب في بر الوالدين (ح٥١٤٢) مسند احمد (ج٣ص٤٩٧)]

(2) [تفسير قرطبي، بذيل سورة الاسراء، آيت ٢٣- نيز ديكھيے: مستدرك حاكم (ج٤ص١٥٤) صحيح ابن حبان (حديث ٤١٨)]

باب۳:

والدین کے فرائض اوراولاد کے حقوق

جس طرح والدین کی اطاعت وفرمانبرداری ان کے حقوق اوراولاد کے فرائض میں شامل ہے اسی طرح اولاد کی تعلیم وتربیت اور پرورش وغیرہ والدین کے فرائض اوراولاد کے حقوق میں شامل ہے۔والدین اگراپنے فرائض صحیح طور پر پورے کریں گے،توکل کووہ اولاد سے اپنے حقوق صحیح معنوں میں پورے کرواسکیں گے۔اگر والدین اولاد کے حقوق پورے نہیں کرتے توپھرانہیں بھی مستقبل میں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی اولادان کے تمام حقوق پورے کرے گی۔الاماشاءاللہ!

اگرچہ اولاد کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں والدین عام طور پر پوری جانفشانی سے کام لیتے ہیں مگراس کے باوجودبعض مواقع پرشعوری یاغیرشعوری طور پراولاد کے ساتھ غیرمنصفانہ سلوک بھی کیاجاتا ہے۔بالخصوص جہاں سوتیلی اولادہووہاں یہ مسئلہ ضرور پیداہوتاہے۔سوتیلی اولاداورسوتیلے والدین کے حقوق وفرائض کے حوالے سے ہم علیحدہ باب میں بحث کریں گے،یہاں ہم سگی اولاد کے حقوق اوران کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے پیداہونے والے چنداہم مسائل پرروشنی ڈالیں گے۔



[1]......بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا مسئلہ

بچپن سے نوجوانی تک بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش کی ذمہ داری والدین پر ہے۔ جوانی کی عمر میں ان کے مناسب رشتے کرنا بھی والدین کی ذمہ داری ہے۔ بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت اور نگہداشت کے سلسلہ میں یہ بات واضح رہے کہ ان میں غیر مساوی سلوک نہ کیا جائے بلکہ عرف کے مطابق دونوں کے حقوق پورے کیے جائیں۔ حتیٰ کی سوتیلی اولاد کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بھی وہی حسن سلوک کیا جائے جو حقیقی اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اولاد کے حقوق پورے نہیں کریں گے تو اس سے نہ صرف یہ کہ آپ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر آخرت میں سزا کے مستحق ہوں گے بلکہ یہ بھی متوقع ہے کہ آپ کی اولاد بھی جوان ہونے کے بعد آپ کے حقوق نظر انداز کر دے۔

بچوں کی دینی تربیت کیوں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اور اس میں حقوق وفرائض کو فطرتی تقسیم کے ساتھ نہایت توازن واعتدال دیا گیا ہے۔ اولاد اور والدین کے حقوق وفرائض کے حوالے سے اسلام نے جس قدر اہتمام کیا ہے، اس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ اگر اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو اولاد اور والدین کے درمیان کبھی حقوق کا جھگڑا پیدا نہ ہو۔ لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کی خود مسلمان بھی خلاف ورزی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے گھرانوں میں آئے دن اولاد اور والدین کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے گھر میں کوئی ایسا جھگڑا پیدا نہ ہو اور اولاد ہمیشہ آپ کی فرمانبردار رہے تو آپ اپنی اولاد کی دینی تربیت سے کبھی غفلت نہ کریں۔ جوان ہونے کے بعد عام طور پر اولاد والدین کی اطاعت نہیں کرتی اس لیے شروع ہی سے اپنی اولاد کو دیگر علوم وفنون کے ساتھ اسلامی تعلیمات سے بھی روشناس کروایئے۔ یہ نہ صرف آپ کے فرائض میں شامل اور آخرت میں باعثِ اجر ہے بلکہ اس سے آپ کو دنیا میں بھی یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کی اولاد آپ کی خدمت واطاعت کو اپنی ذمہ داری سمجھے گی اور آپ

کو ہمیشہ امن وسکون اور راحت پہنچانے کی کوشش کرے گی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اولاد کو اچھا کھلانا، اچھا پہنانا اور مناسب روزگار کے قابل بنا دینا ہی اس کے حقوق کی ادائیگی ہے حالانکہ ان چیزوں کے ساتھ اس کی دینی تربیت کا اہتمام کرنا بھی اس کے حقوق میں شامل ہے بلکہ دینی تربیت ان تمام حقوق کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہم ہے، اس لیے کہ اگر آپ نے اپنی اولاد کو دنیا جہان کی ہر نعمت مہیا کر دی مگر دین کی دولت سے محروم رکھا اور وہ ساری زندگی بے دینی میں گزار کر فوت ہوئی تو یہ ان پر بہت بڑا ظلم ہے، اور روزِ قیامت اس ظلم میں آپ بھی ان کے ساتھ سزاوار ہوں گے۔

اولاد اور اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے ان کی دینی تربیت کے بارے میں اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ آئندہ سطور میں اس حوالے سے چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

۱)..... قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ [التحریم۔٦]

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے بچوں اور دیگر گھر والوں کو جہنم سے بچانے کے لیے کوشش کرنا فرض ہے۔

۲)..... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ وَالْاَمِيْرُ رَاعٍ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهِ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[1]

''تم میں سے ہر شخص ذمہ دار (حاکم) ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری (یعنی اس کی رعایا اور ماتحت افراد) کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ حاکمِ وقت (اپنی رعایا کا) ذمہ دار ہے۔ ایک مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور ایک عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہے۔ گویا تم میں سے ہر شخص ہی ذمہ دار (حاکم) ہے، اس لیے اس سے اس کی ذمہ داری (ماتحت) کے بارے میں (روزِ آخرت) سوال کیا جائے گا۔''

۳)..... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) [بخاری: کتاب النکاح: باب المرأة راعية في بيت زوجها (ح۵۲۰۰)]

((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِيْنَ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ))[1]

"جب تمارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو نماز پڑھنا سکھاؤ اور دس سال کی عمر کو پہنچ کر اگر وہ نماز میں کوتاہی برتیں تو ان پر سختی کرو اور عمر کے اس حصے کو پہنچنے کے بعد ان کے بستر الگ کر دو"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکا ہو یا لڑکی والدین کو دونوں کے لئے نماز کی تعلیم و تربیت کی ابتداء بچپن ہی سے کر دینی چاہیے تا کہ وہ بڑے ہونے تک نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرنے کے خوگر بن سکیں۔ اگر والدین اس ذمہ داری کو پورا نہ کریں تو وہ گویا آنحضرت ﷺ کے ایک نہایت اہم حکم کی خلاف ورزی کریں گے۔

میں نے بہت سے لوگوں کی زبانی کئی مرتبہ اس طرح کی 'فخریہ' باتیں سنی ہیں:...... "ہم اپنے بیٹے کو انجینیر بنا رہے ہیں"...... "ہم نے بیٹے کو میڈیکل میں داخلہ دلوا دیا ہے"...... "ہم نے بچے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھیج دیا ہے"......لیکن ان ساری باتوں کے باوجود کبھی آپ پوچھ کر دیکھ لیں کہ آیا بچے کو نمازی پرہیزی بھی بنایا ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ جب آخرت ہی برباد ہو گئی تو اس دنیا کی دولت کا کیا فائدہ؟!

بچوں کی دینی تربیت کے فائدے:

بچوں کی دینی تربیت کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کی اولاد کل کو آپ کے ساتھ نیک سلوک کرے گی۔ اور اگر اولاد دینی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے بدعمل نکلی تو پھر اس سے حسنِ سلوک کی توقع نہایت مشکل ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کے حضور آپ اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگر آپ کے سمجھانے بجھانے اور محنت کرنے کے باوجود اولاد بڑی ہو کر بے دین ثابت ہوتی ہے تو اس کا مؤاخذہ آپ سے نہیں کیا جائے گا۔

اس کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر آپ بچوں کی دینی تربیت کرنے میں کامیاب ہو گئے اور آپ کی اولاد نیک عمل ثابت ہوئی تو ان کے نیک اعمال کا ثواب انہیں بھی ملے گا اور آپ کو بھی اتنا ہی ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہے گا، اس لیے کہ آپ نے انہیں نیکی کی راہ پر چلایا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

---

(۱) [ابو داؤد، کتاب الصلاۃ، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ (ح ۴۹۱)]

☆ ......حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَّمَهُ وَنَشَرَهُ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ يَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ))[1]

''مومن آدمی کو موت کے بعد بھی اپنے درج ذیل عملوں اور نیکیوں کا فائدہ (ثواب) ملتا رہتا ہے:

۱۔ایسا علم جس کی اس نے تعلیم دی اور اسے نشر کیا۔

۲۔ایسی اولاد جسے اس نے نیکی کی راہ دکھائی۔

۳۔وہ نسخۂ قرآن (یا دینی کتابیں) جسے اس نے اپنے ورثہ (ترکہ) میں چھوڑا۔

۴۔وہ مسجد جو اس نے تعمیر کی۔

۵۔وہ مسافر خانہ جو اس نے تعمیر کیا۔

۶۔وہ نہر جو اس نے کھدوائی۔ (جاری کی)

۷۔وہ مال جو اس نے اپنی زندگی میں حالتِ صحت کے ساتھ صدقہ کیا۔''

مرنے کے بعد بھی جب تک یہ ساتوں چیزیں موجود رہیں گی، ان کا اجر اسے ملتا رہے گا۔

☆......حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ))[2]

''جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا ہر عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے:

(۱) صدقہ جاریہ (۲) اس کا پھیلایا ہوا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے۔ (۳) اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے۔'' [ان تینوں چیزوں کا ثواب اسے مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے۔]

والدین کے لیے ایصالِ ثواب کی مختلف صورتوں کی مزید تفصیلات کے لیے تیرھواں باب ملاحظہ فرمائیے۔

---

(۱) [ابن ماجه، المقدمه، باب ثواب معلم الناس الخير (ح۲٤۲) ابن خزيمه (ح۲٤۹۰) شعب الايمان، للبيهقيؒ (ح۳٤٤۸) صحيح الجامع الصغير، للالبانيؒ (ح۲۲۳۱)]

(۲) [صحيح مسلم، كتاب الوصية، باب مايلحق الانسان من الثواب بعد وفاته (ح۱٦۳۱)]

[2]......لڑکیوں کی حق تلفی کا مسئلہ

والدین کو لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں سے زیادہ توقعات ہوتی ہیں، اس لیے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں عام طور پر سستی اور لاپروائی برتی جاتی ہے۔ یہ دورِ جدید کا پیدا کردہ مسئلہ نہیں بلکہ دورِ جاہلیت میں بھی بچیوں کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک کیا جاتا رہا ہے، حتیٰ کہ عرب کے بعض قبائل بچیوں کے زندہ رہنے کے حق کو بھی چھین لیتے تھے مگر اسلام نے بچوں کے علاوہ بچیوں کے بھی ہر طرح کے حقوق کی پاسداری کی ہے۔ بچیوں کی تعلیم و تربیت اور ان سے حسنِ سلوک کے حوالے سے آنحضرت ﷺ نے خصوصی ترغیب دلائی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کی چند احادیث یہاں بیان کر دی جائیں:

۱)......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))(۱)

''جس شخص کی بیٹیوں کے ساتھ آزمائش کی جائے (اور وہ صبر کرے) تو یہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم کی آگ کے مقابلے میں ڈھال بن جائیں گی۔''

۲)......اسی سے ملتی جلتی صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ يَلِيْ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ شَيْئًا فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))(۲)

''جو شخص بھی بچیوں کی پرورش کرے گا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو یہ بچیاں اس کے لیے جہنم کے آگے پردہ بن جائیں گی۔''

۳)......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

میرے پاس ایک مسکین عورت آئی، اس نے اپنی دو بچیاں گود میں اٹھا رکھی تھیں۔ (میرے پاس اس وقت صرف تین ہی کھجوریں تھیں) میں نے وہ اس محتاج عورت کو دے دیں۔ اس نے ایک ایک

(۱) [صحیح بخاری: کتاب الزکاۃ: باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ (ح ۱۴۱۸)]

(۲) [صحیح بخاری: کتاب الادب: باب رحمۃ الولد و تقبیلہ و معانقتہ (ح ۵۹۹۵)]

کھجور دونوں بچیوں کو دے دی اور باقی ایک اپنے پاس رکھ لی۔مگر جب اس نے اپنے حصہ کی کھجور کھانے کے لیے منہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تو دونوں بچیوں نے ماں سے وہ بھی مانگنا شروع کر دی۔ماں خود بھی بھوکی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اپنے حصہ کی کھجور کے بھی دو ٹکڑے کیے اور وہ بھی ان دونوں بچیوں میں تقسیم کر دیئے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے اس عورت کا اولاد کے لیے ایثار کا یہ جذبہ بڑا پسند آیا۔اس کے جانے کے بعد جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ سنایا۔آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ اَوْ اَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ))(1)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کے لیے جنت واجب فرما دی۔'' (راوی کے بقول یا آپؐ نے یہ فرمایا تھا) ''اس عورت کو اس عمل کے بدلے اللہ تعالیٰ نے جہنم سے آزادی دے دی ہے۔''

۴)......حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَاَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ))(2)

''جس شخص نے تین بیٹیوں کی پرورش کی، انہیں اچھی تعلیم و تربیت دی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تو اس شخص کے لیے جنت کا انعام ہے۔''

۵)......حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے تین بہنوں یا تین بیٹیوں یا دو بہنوں یا دو بیٹیوں کی اچھی پرورش کی اور تعلیم و تربیت دی، اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔''(3)

۶)......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((سَوُّوْا اَوْلَادَكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا اَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ))(4)

---

(۱) [صحيح مسلم: كتاب البر والصلة، باب فضل الاحسان الى البنات (ح ۲۶۳۰)]

(۲) [سنن ابو داؤد: كتاب الادب: باب في فضل من عال يتامى (ح ۵۱۳۸)]

(۳) [ابو داؤد، ايضا (ح ۵۱۳۹)]

(۴) [فتح البارى شرح صحيح بخارى (ج ۵ ص ۲۱۴) وقال سنده حسن]

''اپنی اولاد کو تحائف دینے میں برابری اختیار کرو۔اگر میں کسی کو فضیلت دینا چاہتا تو عورتوں کو (مردوں پر)فضیلت دیتا۔''

۷)......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَامِنْ رَجُلٍ تُدْرِكُ لَهُ ابْنَتَانِ فَيُحْسِنُ اِلَيْهِمَا مَاصَحِبَتَاهُ اَوْصَحِبَهُمَااِلَّا اَدْخَلَتَاهُ الْجَنَّةَ))(۱)

''جس شخص کی دو بیٹیاں ہوں اور وہ جب تک اس کے پاس رہیں،یہ ان کی اچھی تربیت کرے تو وہ بچیاں اسے جنت میں لے جانے کا ذریعہ بن جائیں گی۔''

۸)......حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنَاوَهُوَ وَضَمَّ اَصَابِعَهُ))(۲)

''جس نے دو بچیوں کو پال پوس کر جوان کیا،وہ اور میں روزِ قیامت اس طرح اکٹھے ہوں گے۔(آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر فرمایا)جس طرح یہ دو انگلیاں ہیں۔''

ان تمام احادیث میں بچیوں کے ساتھ محبت وشفقت اور ان کی تعلیم وتربیت کی فضیلت بیان ہوئی ہے،اس کے باوجود اگر کوئی شخص بچیوں کے حقوق نظر انداز کردے تو اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں!

مغربی نظریۂ مُساواتِ مردوزن سے متاثر بعض لوگ بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بھی وہی معیار اور وہی پیمانے تجویز کرتے ہیں جو بچوں کے لیے ہیں،حالانکہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مردوزن کا دائرہ عمل ہی چونکہ جدا جدا ہے،اس لیے تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں بھی منطقی طور پر دونوں کے پیمانے جدا جدا ہونے چاہییں۔بچیوں کے لیے معیارِ تعلیم وتربیت کیا ہونا چاہیے؟ اس کا فیصلہ خواتین کی ذمہ داریوں اور ان کے دائرہ عمل کی روشنی میں بخوبی کیا جاسکتا ہے۔اس موضوع کی مزید تفصیل کے لیے ہماری کتاب: ھدیۃ النسآء کا مطالعہ مفید رہے گا۔ان شاءاللہ!



(۱) [سنن ابن ماجه، كتاب الادب،باب بر الوالد، الاحسان الى البنات (ح ٣٦٧٠)]

(۲) [صحيح مسلم ، كتاب البر والصلة،باب فضل الاحسان الى البنات(ح ٢٦٣١)]

[3]......بچوں کی تعلیم وتربیت اور مالی اخراجات کا مسئلہ

اولاد جب تک بالغ ،صاحب شعوراور روزی کمانے کے قابل نہیں ہو جاتی اور بچیاں جب تک اپنے گھروں میں بس نہیں جاتیں، تب تک ان کی بنیادی ضروریات پوری کرنا والدین پر فرض ہے۔ مسلمان والدین اگر چہ اسے اپنا دینی وشرعی فریضہ سمجھتے اور اسے پورا کرنے پر اجروثواب کی امید بھی رکھتے ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ نے فطرتی طور پر والدین کے دلوں میں اولاد کے لیے جو محبت پیدا کر دی ہے، وہ خود ہی انہیں اولاد کی ضروریات کی تکمیل کے لیے آمادہ کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر والدین خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، ان کی ہمیشہ خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو اچھا کھلائیں، اچھا پہنائیں، اچھا پڑھائیں اور اچھا سکھائیں تا کہ ان کا مستقبل روشن اور بہتر ہو۔

اولاد کے علاوہ کسی اور کے لیے انسان کبھی نہیں چاہتا کہ وہ مجھ سے آگے نکلے، مگر اولاد سے فطرتی محبت کی وجہ سے ہر والدین کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کا مستقبل ان سے بھی بہتر ہو۔ حتیٰ کہ اولاد سے یہ فطرتی محبت بسا اوقات والدین کو اس حد تک آگے لے جاتی ہے کہ وہ اولاد کی خوشی کے لیے ہر جائز اور ناجائز کا ارتکاب کرتے ہیں مگر اسلام نے اولاد سے اس فطرتی محبت کو ایک توازن بخشا ہے اور اولاد کی اندھی محبت میں کوئی بھی ناجائز قدم اٹھانے سے سخت منع کیا ہے۔

اولاد سے امتیازی سلوک اور اس کا نتیجہ:

والدین میں اپنی اولاد سے اس فطرتی محبت کا جذبہ مختلف ہوتا ہے مثلاً اکثر و بیشتر والدین بچیوں کے مقابلہ میں اپنے بچوں سے زیادہ محبت رکھتے ہیں اور انہیں تعلیم وتربیت، آرائش ورہائش، خوراک وعطیات وغیرہ میں بچیوں پر ترجیح دیتے ہیں یا اگر سگی اولاد کے ساتھ سوتیلی اولاد بھی ہو تو سگی اولاد کو سوتیلی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ان چیزوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کے بڑا ہونے اور اپنے گھر آباد کرنے کے بعد ان کی باہمی اخوت ومحبت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں حتیٰ کہ ان کا یہی ردعمل اپنے والدین کے ساتھ بھی ظاہر ہو سکتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر ہوتا ہے۔

والدین زندہ ہوں یا فوت شدہ، ایسے بچے جن کے ساتھ والدین کا سلوک غیر مساوی اور مبنی بر امتیاز رہا ہوتا ہے، وہ اپنے والدین کو برا بھلا کہتے ہیں۔ان کے بڑھاپے میں ان کی خدمت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ ردعمل بعض اوقات اتنی شدید صورتحال اختیار کر جاتا ہے کہ اولاد اپنے والدین کو مارنے، پیٹنے حتیٰ کہ قتل کر دینے کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہے۔العیاذ باللہ!

اسلام نے اولاد اور والدین کے حوالے سے جو اصول پیش کیے ہیں ان پر عملدرآمد اولاد اور والدین دونوں کی دنیوی واخروی فلاح کی ضمانت پیش کرتا ہے۔آئندہ سطور میں ہم تعلیم وتربیت اور اخراجات کے حوالے سے اولاد اور والدین کے باہمی مسائل پر روشنی ڈالیں گے۔

اولاد کی تعلیم وتربیت اور اخراجات میں منصفانہ سلوک کیا جائے:

والدین کو چاہیے کہ اپنی ساری اولاد کے ساتھ مساویانہ اور مبنی بر عدل وانصاف سلوک کریں۔لڑکوں کو لڑکیوں پر اس طرح سے ترجیح نہ دیں کہ لڑکیوں کے حقوق متاثر ہوں۔سگی اولاد کو سوتیلی اولاد پر اس انداز سے برتری نہ دیں کہ سوتیلی اولاد کل کو دشمن بن جائے۔ایک بچے کے تعلیم وتربیت، شادی بیاہ اور دیگر ضروریات پر اتنا خرچہ نہ کریں کہ باقی بچوں کو اعتراض کا موقع ملے یا باقیوں کے حقوق متاثر ہوں بلکہ سب کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک کریں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ مساویانہ سلوک کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ ایک بچے پر جتنے اخراجات ہوئے ہیں آپ انہیں شمار کر کے دوسرے بچے پر بھی اتنا ہی خرچ کریں۔یا ایک بچے کو میڈیکل کی تعلیم دی ہے تو باقی سارے بچوں کو بھی ڈاکٹر ہی بنائیں۔یا ایک بچے کو کاروبار یا اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجا ہے تو باقی سب کو بھی لازماً وہاں بھیجیں۔نہیں، ہرگز نہیں! اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔اس لیے کہ والدین کا فرض تو یہ ہے کہ اپنے ہر بچے کی اچھی سے اچھی تربیت کریں اور والدین شروع ہی سے اس ذمہ داری کو پورا بھی کرتے ہیں مگر بعض اوقات حالات بدل جاتے ہیں، مالدار والدین اچانک غریب یا غریب والدین بعد میں اچانک مالدار بن جاتے ہیں۔اب ظاہر ہے حالات کی یہ تبدیلی بچوں کی تعلیم وتربیت پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ جب والدین کی مالی پوزیشن مستحکم تھی تب اولاد کے لیے سہولیات اور مواقع زیادہ تھے اور جب والدین کی مالی پوزیشن کمزور ہوئی تو اس دوران پیدا ہونے والے بچوں کے لیے سہولیات اور مواقع خود بخود کم ہو گئے۔

اسی طرح ایک بچہ اگر ذہین ہے تو والدین اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کی پوری کوشش کرتے ہیں حتیٰ کہ اس مقصد کے لیے انہیں قرض اٹھانا پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتے بلکہ خود پیٹ پر پتھر باندھ کر اس ذہین بچے کو ترقی اور بہتری کے پورے مواقع مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے برعکس اگر انہی والدین کا ایک بچہ غبی اور کند ذہن ہو، پڑھائی میں اس کا ذہن نہ چلتا ہو تو ظاہر ہے والدین امیر ہونے کے باوجود اس کی تعلیم پر پیسہ خرچ نہیں کرتے بلکہ اسے کسی ہنر، پیشے یا کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔اب ان دونوں صورتوں میں ذہین اور غبی بچے کے درمیان تعلیمی میدان میں مساوات آخر کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟

اسی طرح لڑکوں کے لیے اعلیٰ تعلیم اور کاروبار وغیرہ کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں مگر بچیوں کی شادی اوران کے ستر وحجاب کے مسائل کی وجہ سے ہر جگہ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انہیں بھی لڑکوں کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجا جائے یا انہیں بھی اسی طرح کاروباری مواقع فراہم کیے جائیں، جس طرح لڑکوں کو فراہم کیے جاتے ہیں۔

مُساوات پھر کیا ہے؟

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مُساوات آخر کیا ہے؟

مغربی نقطۂ نظر سے اس سوال پر غور کیا جائے تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں آخرت سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اس مادی دنیوی زندگی کے لیے مرد وزن کی آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو جس انداز سے تسلیم کر لیا گیا ہے، اس کی رو سے ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور یہ حق بلوغت کے بعد ہر لڑکے اور لڑکی کو مل جاتا ہے، اس کے بعد والدین بھی ان کے اس حقِ آزادی اور خود مختاری میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کر سکتے۔البتہ اسلامی معاشروں میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے حقوق میں برابری کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ انصاف کا لحاظ رکھا ہے، اور یہی حقیقی مساوات ہے۔

یعنی بچوں کے درمیان منصفانہ سلوک کیا جائے اور منصفانہ سلوک یہ ہے کہ اول تو تمام بچوں کی تعلیم وتربیت پر بقدرِ استطاعت خرچ کیا جائے اور بخل سے کام نہ لیا جائے۔اسلام کی بنیادی تعلیمات سے تمام بچوں کو روشناس کرایا جائے، خواہ گھر میں انتظام کیا جائے یا مسجد ومکتب میں۔پھر جس بچے کا ذہن جس میدان میں زیادہ کام کرتا ہو، اس کے لیے وہی میدان منتخب کیا جائے۔خود بچہ اگر شعور کی عمر کو پہنچ جائے تو اس سے بھی مشورہ کیا جائے اور باہمی مشاورت سے قدم اٹھایا جائے۔

بچیوں کے لیے منصفانہ سلوک یہ ہے کہ عرف کے مطابق ان کی جتنی تعلیم وتربیت ضروری ہے اس میں تمام بچیوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے۔ بروقت ان کی شادیاں کی جائیں۔ان کے رشتے کے انتخاب میں دین ودنیا کی بھلائیوں کو مدنظر رکھا جائے۔اس کے بعد فیصلہ بچوں کی قسمت پر ہے۔

جھگڑے سے بچاؤ کے لیے چند ہدایات:

گھر میں جھگڑا پیدا ہونے سے بچاؤ اور اولاد کی تعلیم وتربیت میں منصفانہ سلوک کے سلسلہ میں والدین اور صاحبِ شعور اولاد کو درج ذیل چند باتیں مدنظر رکھنی چاہییں:

۱۔ذہین یا غبی ہونا قسمت کی بات ہے اور ظاہر ہے اس بات کا اثر بچوں کی تعلیم وتربیت اور مستقبل پر بھی ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں والدین کے منصفانہ سلوک کے بعد اولاد کو بھی اپنی قسمت پر راضی وصابر رہنا چاہیے اور خدائی فیصلوں کے خلاف طعن وتشنیع نہیں کرنی چاہیے۔

۲۔والدین کے مالی حالات کے مستحکم اور کمزور ہونے کا اثر بھی بچوں پر پڑتا ہے، یہ بھی چونکہ قسمت کا مسئلہ ہے اس لیے اس سلسلہ میں والدین کو شرعاً معذور ومجبور سمجھنا چاہیے۔

۳۔بچوں کی بنیادی ضروریات کے بعد اگر کسی بچے پر اضافی طور پر کوئی خرچہ کرنا ہو تو اس میں برابری ہونی چاہیے مثلاً کسی بچے کو کوئی تحفہ دینا ہو تو اس میں لڑکے اور لڑکی کا فرق کیے بغیر برابری کا اصول استعمال کیا جائے۔اس کی مزید تفصیل کے لیے اسی کتاب کا دسواں باب "مالی معاملات....." ملاحظہ فرمائیں۔

۴۔اگر تمام بچے صاحبِ شعور ہوں اور والدین کسی ایک بچے کو اضافی طور پر کوئی چیز دینا چاہیں تو دیگر بچوں کی رضامندی کے ساتھ وہ ایسا کر سکتے ہیں مثلاً ایک بچہ امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتا ہے اور والدین اسے انعام دیتے ہیں جبکہ بقیہ بہن بھائی اس انعام پر کوئی اعتراض نہیں کرتے بلکہ وہ خود بھی اسے بہتر سمجھتے ہیں تو ایسی صورت میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں مگر اس کا یہ معنی نہیں کہ ساری جائیداد ایک بچے کے نام یا سگے بچوں کے نام لگادی جائے اور باقیوں کو ان کے شرعی حق سے محروم کر دیا جائے۔

۵۔لڑکے اور لڑکی کی شادی پر اخراجات کا فرق پڑتا ہے یعنی بچی کی شادی کے سلسلہ میں ولیمے کا خرچہ نہیں ہوتا مگر بچے کی شادی پر ولیمے کا خرچہ ہوتا ہے۔البتہ ولیمے کے خرچے کا بچیکے جہیز کے ساتھ تقابل کیا جائے تو شاید اخراجات کا توازن نکل آئے......![جہیز دینا خود ایک محلِ نظر مسئلہ ہے، اس کی تفصیل کے لیے ہماری کتاب: جھیز کی تباہ کاریاں ملاحظہ فرمائیں۔]

باب۴:

والدین کے فرائض سے متعلقہ چند سوالات

بچے کی تربیت اور والدین کی ذمہ داری:

سوال: میری والدہ تمام مذہبی فرائض پابندی کے ساتھ ادا کرتی ہیں لیکن اپنے بیٹے کی مذہبی تربیت کے بارے میں ان کا رویہ سنجیدہ نہیں ہے۔ جب میں ان کے بارے میں سوال کرتی ہوں تو وہ کہتی ہیں کہ اگر اللہ اسے ہدایت دے گا تو یہ نیک کام کرے گا اور اگر اللہ اسے ہدایت نہیں دے گا تو پھر بچے کو زبردستی کسی بات پر مجبور کر کے اس کے مستقبل کے رویے کو متاثر کرنا بے کار ہوگا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا والدہ کا یہ رویہ درست ہے؟ اگر نہیں تو براہِ کرم وضاحت فرمایئے کہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں والدین پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب:

آپ نے سوال میں جس مسئلے کی نشاندہی کی ہے وہ ان لوگوں کا ایک عام رویہ ہے جن کی اسلامی تعلیم میں خاصی کمی رہ گئی ہو۔ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی نیت اچھی ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ غلطی پر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اس کسان کی سی ہے جسے وراثت میں ایک ایسا قطعہ زمین ملا ہو جسے اس کے باپ نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصہ پہلے کاشت کے قابل بنایا ہو اور اس میں بیج ڈال دیے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں زمین تیار ہے، بیج بو دیا گیا ہے، کسان کو صرف یہ کرنا ہے کہ اس کی مناسب دیکھ بھال کرے، صحیح کھاد ڈالے، وقت پر آبیاری کرے اور ہر موقع پر اچھی نگہداشت رکھے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کی فصل اچھی ہوگی اور اسے منافع ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر کسان اپنی زمین سے غفلت برتے اور یہ کہے کہ......

> ''اگر اللہ چاہے گا تو یہ پودے اور درخت اُگ جائیں گے اور فصل اچھی ہوگی اور اگر نہیں چاہے گا تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ اللہ کی مرضی کے خلاف کام کروں۔''

اگر وہ کسان اسی سوچ سے فصل کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا تو ظاہر ہے

کہ اس کی فصل اچھی نہیں ہوگی اور اس موقع پر وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کی مرضی یہی تھی کہ میری فصل اچھی نہ ہو۔ اس کی فصل کے خراب ہونے کی وجہ اس کی اپنی غفلت اور عدمِ سعی ہوگی۔

ایسے شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی مرضی یہ ہے کہ ہر کوشش کا صلہ ملے۔ یہ فطرت کا قانون ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جاری کر رکھا ہے۔ جب بھی اور جو بھی انسان اس قانون کے مطابق کام کرتا ہے، اسے اپنی محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ فطرت کے اسی قانون کا اطلاق بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے پر بھی ہوتا ہے۔

والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اچھی نگہداشت کریں اور ان کی پرورش اس طرح کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی رہنمائی پر عمل کریں۔ بچوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور کافر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر کیا باتیں فرض کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں والدین کو بچوں کی صحیح تربیت کرنا چاہیے اور انہیں وقتاً فوقتاً یاددہانی کراتے رہنا چاہیے تاکہ وہ کوئی ناقابلِ قبول رویہ اختیار نہ کریں۔

جس طرح والدین اپنی اولاد کی تربیت میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے ہو کر ذمہ دار شہری بنیں اور مرد یا عورت کی حیثیت سے اپنی معاشرتی ذمہ داریاں پوری کرنے کے اہل ہوں، اسی طرح انہیں یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ ان کی اولاد بڑی ہو کر فطری طور پر اس قابل ہو کہ وہ صحیح ہدایت حاصل کرے اور ایمان کا راستہ اختیار کرے۔ اولاد میں یہ خصوصیات صحیح تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ تعلیم اسکول یا یونیورسٹی میں حاصل کی جائے، گو کہ یہ تعلیم بھی ضروری ہے اور صحیح اور غلط کے انتخاب میں مدد دیتی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر تعلیم وہ ہے جو انسان میں جستجو کا مادہ پیدا کرے اور اسباب و نتائج کے حوالے سے فیصلہ کرنے کی قوت عطا کرے۔ جب ایک نوعمر، ان صلاحیتوں اور اس رویہ کے ساتھ جوان ہوگا تو اشیاء اور معاملات کو دیکھنے کی اس کی نظر بالکل مختلف ہوگی اور ایمان کے بارے میں بھی اس کا رویہ مختلف ہوگا۔

اگر والدین نے اولاد کی تربیت کے بارے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے اور اس کے باوجود کوئی شخص بالغ ہونے پر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ملحد یا بے دین رہے گا تو یہ اس کا اپنا انتخاب ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر وہ والدین کی تربیت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی حاصل کرتا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ایک اچھا مسلمان ہوگا۔

لہذا یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت اچھی طرح کریں تا کہ وہ اللہ اور بندے کے تعلق کو سمجھنے کے اہل ہوں اور اللہ تعالیٰ سے حاصل ہونے والی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوں۔
والدین یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بریٔ الذمہ نہیں ہو سکتے کہ
''ہدایت تو اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اور اگر اس نے ہدایت نہ دی تو وہ اولاد کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔''
اس طرح کا رویہ اپنی ذمہ داری سے جان بچانے کا ہے اور ایک اچھا مسلمان یہ کبھی نہیں کرتا۔[1]

بیرون ملک ملازمت اور نافرمان اولاد سے سلوک:

سوال:

میں ۱۹۸۰ء سے سعودی عرب میں ملازمت کر رہا ہوں۔ بیوی اور بچے وطن میں ہیں۔ میرے چار بیٹے ہیں اور اب ماشاء اللہ یہ چاروں جوان ہو گئے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں ہمیشہ اس بارے میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا ہوں کہ انہیں بہتر سے بہتر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیے تا کہ جب وہ اپنی عملی زندگی شروع کریں تو کامیابی کے زیادہ مواقع ہوں۔ سعودی عرب میں رہتے ہوئے میں انہیں قرآن مجید کے اقتباسات میں دینی موضوعات پر شائع ہونے والی تحریریں اور آپ کے سوال وجواب کے تراشے ارسال کرتا رہتا ہوں۔ میں یہ امید رکھتا ہوں کہ ان سب کی مدد سے وہ مذہب کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کریں گے۔ میں نے انہیں اسلام کے بارے میں کتابیں بھی مہیا کی ہیں اور سختی سے تاکید کی ہے کہ وہ انہیں پڑھیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ وہ اپنے اسلامی فرائض کی ادائیگی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی والدہ کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی والدہ سے چلا کر بات کرتے ہیں اور اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسے بچوں کے ساتھ اب مجھے کیا سلوک کرنا چاہیے؟ کیا میں انہیں گھر سے نکال باہر کروں؟
اگر میں انہیں گھر میں رکھتا ہوں تو کیا میں اللہ کی نافرمانی میں ان کا شریک تو نہیں بنتا؟ کیا مجھے یہ ملازمت چھوڑ کر گھر واپس چلا جانا چاہیے یا پھر ان پر دباؤ رکھا جائے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں؟

جواب:

یقیناً یہ ہر باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کر کے انہیں اسلامی

(۱) [اسلامی طرز فکر، فتویٰ از، عادل صلاحی]

فرائض سے آگاہ کرے اور مذہب کے بارے میں ایسی تعلیم بہم پہنچائے کہ بچے اسلام کے بنیادی اصولوں کو اور اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ اسلام ان سے کیا تقاضا کرتا ہے اور انہیں یہ فرائض کس طرح ادا کرنے چاہییں۔ اگر باپ یہ نہیں کرے گا، تو اس غفلت کے بارے میں وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تمہارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کی ہدایت کرنا چاہیے۔ جب ان کی عمر دس سال ہو جائے اور وہ نماز نہ پڑھیں، تو انہیں ہلکی جسمانی سزا دی جائے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بچے کو نوعمری میں عبادات کی طرف راغب کیا جائے اور عبادت کے طریقے اسے سکھائے جائیں، اس طرح عبادت کرنا اس کے لیے ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ نماز کی طرح رمضان میں روزہ رکھنے کے لیے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ دن کے کسی ایک حصہ میں روزہ رکھ لیں یا ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھیں، اس طرح بلوغت کو پہنچنے تک، جب روزہ ان کے لیے فرض ہو جاتا ہے، تو ان کے لیے یہ مشکل کام نہیں رہتا۔

جب بچے بڑے ہو جائیں تب والد کی ذمہ داری کیا ہوگی ہے؟ اگر اس وقت وہ اسلامی تعلیمات سے روگردانی کریں تو کیا انہیں سزا دینی چاہیے؟

فرض کیجیے کہ بیٹے کی عمر ۱۴ سال ہے اور باپ کی مسلسل یاددہانی کے باوجود وہ نماز ادا نہیں کرتا، تو کیا اسے جسمانی سزا دینی چاہیے؟ اسلام میں اس امکان کی گنجائش ہے، لیکن والدین کو کسی ایسی بات پر مجبور نہیں کیا گیا جس میں ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ اسلام میں جو بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اگر ایک شخص کے ذمہ چند فرائض رکھے گئے ہوں تو ان فرائض کی ادائیگی اس شخص کو کرنا ہوگی۔ کسی دوسرے شخص سے اس بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی وہ فرض ادا کرنا کسی دوسرے کی ذمہ داری ہوگی۔

کسی شخص کو اس بات پر فکرمند نہیں ہونا چاہیے اور نہ غصہ کرنا چاہیے کہ اس کی اولاد اپنے اسلامی فرائض ادا نہیں کر رہی ہے۔ والدین کا فرض یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اولاد کو بہترین طریقے سے ان فرائض کی یاددہانی کراتے رہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اپنے خاندان کے لوگوں کو نماز کی ادائیگی کی یاددہانی کراتے رہو۔''

اگر اولاد یاد دہانی کے باوجود نماز ادا نہیں کرتی تو اس بارے میں اس کے والد سے جواب طلبی نہیں ہوگی۔

☆......اب میں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ معاملہ والدین کے ساتھ اولاد کے سلوک کا ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام ہر بیٹے اور ہر بیٹی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ فرمانبرداری سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں۔ اگر ایک بیٹا اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تو وہ والدین کی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے اور اسے اسلام کا ایک اہم فریضہ بتایا گیا ہے۔

درحقیقت والدین کی نافرمانی کرنے والی اولاد کے بارے میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ جنت سے محروم رہے گی۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید میں کئی جگہوں پر والدین کی اطاعت کو، اللہ تعالیٰ کے واحد اور لاشریک ماننے کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ والدین سے درشت لہجے میں بات کرے۔ اگر ایک بیٹا اپنی ماں یا باپ کو ضرر پہنچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو کبھی معاف نہیں کریں گے، سوائے اس کے کہ اس کے والدین اسے معاف کردیں۔

اب میں آپ کے سوال کے خاص حصے کی طرف آتا ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ایسی حیثیت میں نہیں ہوں کہ آپ کو کوئی حتمی مشورہ دے سکوں کہ آپ کو یہ کرنا چاہیے اور یہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کے خاندانی حالات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا جن کی بنیاد پر کوئی عملی اقدام تجویز کیا جاسکتا تھا۔

اگر آپ اپنے بیٹوں کو، ان کی والدہ سے گستاخی اور بدسلوکی کی وجہ سے گھر سے نکال باہر کریں تو نظری طور پر آپ کو اس کا بالکل حق ہے اور آپ یہ کرسکتے ہیں۔ بچوں کی تربیت اور پرورش کے بارے میں آپ نے اپنا فرض ادا کردیا ہے اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ اگر آپ انہیں گھر میں نہیں رکھتے ہیں تو اس صورت میں آپ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ لہٰذا فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سا طریقہ بہتر رہے گا۔

مجھے یہ کہنے دیجیے کہ آپ کے گھر کے حالات مثالی نوعیت کے نہیں ہیں۔ آپ گزشتہ کئی برسوں سے گھر سے باہر رہ رہے ہیں اور اس عرصہ میں بچوں کی تربیت کا سارا بوجھ آپ کی بیوی پر ہے جو اس اہم کام کے

لیے پوری طرح تیار نہیں ہیں، کیونکہ یہ کام میاں اور بیوی دونوں مل کر ہی بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں۔ بچے جب بڑے ہو جائیں تو والد کا گھر سے دور رہتے ہوئے اسلامی کتابیں اور دیگر مواد اولاد کو بھیجنا اور یہ توقع کرنا کہ والد کی ہدایت کے نتیجہ میں وہ انہیں پڑھیں گے، آج کل کے ماحول کے اعتبار سے حقیقت پسندانہ سوچ نہیں ہے۔ آپ کو خود اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ طے کرنا چاہیے کہ اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔[1]

بچوں پر تعلیم یافتہ ماں کے اثرات:

سوال:

ماں کی تعلیم کے اس کے بچے پر کیا اثرات ہوتے ہیں؟ کیا ماں کی تعلیم بچے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ناگزیر ہے؟ کیا اس بارے میں اسلام میں کوئی حوالہ موجود ہے؟

جواب:

ذہانت ایک عطیہ ہے جو تعلیم اور تجربے سے بڑھتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ذہانت کا کچھ حصہ فطری ہوتا ہے اور کچھ تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ ماں، بچوں کی صحت، عادات، اور عقائد اور اقدار کی تربیت کے لیے زیادہ بہتر ہوتی ہے، وہ ان کی تعلیم میں مدد دے سکتی ہے، ان کے مستقبل کی کامیابی میں حصہ دار ثابت ہو سکتی ہے۔

تاہم یہ بات جو عام طور پر درست ہے، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ ہر صورت میں درست ثابت ہو گی۔ آپ ایک بچے کی مثال لے سکتے ہیں جس کی ماں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور اس کا بہت خیال رکھتی ہے مگر دوسرے عوامل جو والدین کے قابو سے باہر ہیں، بچے کی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ذہین ماں، جو بہت کم پڑھی لکھی ہے، اس قابل ہو جاتی ہے کہ اپنے تجربے کی بناء پر بچوں کی بہترین پرورش کرے۔

اس بارے میں حضور اقدس ﷺ کی ایک حدیث مبارک ہے کہ "اپنے لیے بہتر شریکِ حیات کا انتخاب کرو۔"

---

(۱) [اسلامی طرز فکر، ایضاً (ج ۱ ص ۲۵۳ تا ۲۰۵)]

رسول مقبول ﷺ نے ایک خاص بات یہ فرمائی کہ مسلمان اپنے لیے وہ شریک حیات منتخب کرے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی ہو۔ ایسی ماں اپنے بچوں کو صراط مستقیم پر چلانے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں زیادہ مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ (1)

بچوں کے لیے بددعا:

سوال:

اکثر والدین بچوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ان کے لیے بددعا کرتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ ان کی رہنمائی فرمائیں۔

جواب:

ہم والدین کو نصیحت کریں گے کہ وہ بچپن میں بچوں کی کوتاہیوں سے درگذر کریں۔ ان کی تکلیف دہ باتوں پر حلم و حوصلہ کا مظاہرہ کریں۔ بچے چونکہ ناپختہ عقل کے مالک ہوتے ہیں اس لیے ان سے بات چیت یا کسی اور معاملہ میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے، اگر باپ حلیم الطبع ہو تو وہ درگذر کرتے ہوئے بچے کو بڑے پیار اور نرم خوئی سے سمجھائے۔ اسے نصیحت کرے۔ شائد اس طرح بچہ اس کی بات تسلیم کرے اور ادب کا برتاؤ کرنے میں پیش قدمی کرنے لگے۔

بعض والدین اس وقت سنگین غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جب وہ بچوں کے لیے موت، یا بیماری یا آلام و مصائب کی بددعائیں کرتے ہیں اور مسلسل اس کوتاہی کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں اور جب غصہ فرو ہوتا ہے تو اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری بددعائیں قبول ہوں اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ باپ فطرتاً مہرباں اور شفیق ہوتا ہے، چونکہ وہ محض شدت غضب کی وجہ سے ایسا کر گزرتا ہے، لہذا اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ﴾ [یونس: 11]

''اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر نقصان بھی جلدی سے واقع کر دیا کرتا جس طرح وہ فائدہ کے لیے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔''

لہذا والدین کو قوت برداشت اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ معمولی مار پیٹ سے ان کی اصلاح کی کوشش

(1) [ایضاً (ج 2 ص 255)]

کرنی چاہیے۔ بچے تعلیم وتادیب سے زیادہ جسمانی سزا سے متاثر ہوتے ہیں،ان کے لیے بددعا کرنا قطعاً غیر سودمند ہے،وہ نہیں جانتا کہ اس کے منہ سے کون سی بات نکل جائے گی،باپ نے جو کچھ کہا وہ تو لکھ لیا جائے گا اور بچے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ (1)

والدین پر بچوں کے حج کی ذمہ داری:

سوال:

میرے بچوں نے متعدد بار میرے ساتھ عمرہ کیا ہے لیکن میں انہیں حج کے لیے نہیں لے جا سکا۔ اگر میں بچوں کو اپنے ساتھ حج پر لے جائے بغیر سعودی عرب سے چلا جاؤں تو کیا یہ میری طرف سے کوتاہی تو شمار نہیں ہوگی؟

جواب:

اگر آپ کے بچے سنِ بلوغت تک نہیں پہنچے تو ان پر حج فرض نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں اس عمر میں حج پر لے جاتے ہیں تو اس کا ثواب آپ کو ملے گا۔ تاہم ان کی جانب سے فریضۂ حج کی ادائیگی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک وہ بلوغت کے بعد حج ادا نہ کریں۔ اگر بچوں میں سے کسی ایک نے بھی بلوغت کی شرط پوری کر لی ہے تو حج کی ادائیگی اس پر فرض ہے، تاہم یہ اس کی اپنی ذمہ داری ہے، آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر آپ اس فرض کی ادائیگی میں بچوں کی معاونت کرتے ہیں تو یہ احسن ہے اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو آپ کو اس سلسلہ میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ جب انہیں حج کرانے کے لیے آپ کو یا آپ کے اہل خانہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

کسی بھی فریضہ کی ذاتی طور پر ادائیگی، اسلام کا بنیادی تصور ہے۔ بچے جب چھوٹے ہوں تو آپ انہیں نماز کے لیے مسجد لے جاتے ہیں تاکہ وہ نماز پڑھنا سیکھ لیں، لیکن جب وہ اس عمر کو پہنچ جائیں جب نماز ان پر فرض ہو جائے، تب یہ فریضہ انہیں خود ہی ادا کرنا ہوگا۔ آپ بچوں کو عمرہ کے لیے لے جاتے رہے ہیں، بچے حرم شریف دیکھ چکے ہیں یقیناً حرم میں طواف کی ادائیگی کے دوران انہوں نے ویسی ہی دلچسپی اور شوق ظاہر کیا ہوگا جیسا کہ دوسرے بچے کرتے ہیں جب وہ بڑے ہوں گے تو یقیناً وہ وہاں جانے کی آرزو کریں گے۔

---

(1) [فتاویٰ برائے خواتین مفتوی از شیخ ابن جبرین (ص ۳۰۲)]

اگر بچے بالغ ہوچکے ہیں اور آپ انہیں اپنے ساتھ حج پر لے جاتے ہیں تو یقیناً یہ آپ کی عنایت ومہربانی ہوگی اور اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ عطا کریں گے۔[1]

بیوی سے جھگڑا اور جوان اُولاد کا ردِ عمل.....کیا کیا جائے؟

سوال:

میری بیوی ہر بات میرے خلاف کرتی ہے حقوق ادا نہیں کرتی۔گزشتہ روز میں نے اپنی بڑی لڑکی کو بلا کر والدہ کو سمجھانے کو کہا۔اس نے کہا کہ اب نبھاؤ مشکل ہے۔اچھا ہے کہ آپ کے درمیان علیحدگی ہوجائے۔ایک نالائق بیٹا درمیان آ گیا اور فیصلہ یہ کیا کہ میں اس (ماں) کو لے جاتا ہوں۔باوجودیکہ میں نے اس کی ماں کو کافی روکا کہ بغیر اجازت آپ نہیں جاسکتیں مگر وہ بیٹے کے ساتھ چلی گئی۔نامعلوم وہ کہاں ہے۔اب میں اپنے بیٹے کو عاق کرنا چاہتا ہوں اور بیوی کے لیے کیا کروں؟ اس بارے میں مشورہ طلب کرتا ہوں۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ بیٹے ماں باپ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کریں اور اوپر سے طرہ یہ کہ سب بچے ہی یک زبان ہوکر ماں کے طرف دار بن گئے ہیں۔

جواب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا اندوہناک خط تفصیل سے پڑھا، بہت صدمہ ہوا۔اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو آسان فرمائے۔ نجی اور ذاتی معاملات میں، میں مشورہ دینے سے گریز کیا کرتا ہوں۔اس لیے چند اصولی باتیں عرض کرتا ہوں:

1)..... اولاد جب جوان ہوجائے تو ان کے جذبات کا احترام ضروری ہوتا ہے۔اور والدین کی چپقلش اور سر پھٹول اولاد کے دل سے والدین کا احترام نکال دیتی ہے۔بیوی سے لڑائی جھگڑا اولاد کے سامنے کرنا اصولی غلطی ہے۔

2)..... بیوی کے ذمہ شوہر کے حقوق بلاشبہ بہت زیادہ ہیں اور بیوی کو شوہر کے حقوق ادا کرنے کی بہت ہی تاکید کی گئی ہے لیکن شوہر کو بھی یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ (بیوی) کتنے حقوق کا بوجھ اٹھانے کی متحمل ہے۔اسی لیے شریعت نے مرد کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ ایک بیوی پر اس کی برداشت سے

(۱) [اسلامی طرز فکر ازعادل صلاحی (ج ۱ ص ۲۰۳)]

زیادہ بوجھ نہ پڑے اور ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں شریعت نے شوہر پر یہ کڑی پابندی عائد کی ہے کہ وہ تمام بیویوں کے ساتھ کانٹے کے تول سے برابری کرے، سب کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھے اور کسی ایک طرف ادنیٰ جھکاؤ بھی روا نہ رکھے۔

3)......قیامت کے دن صرف بیوی کی نافرمانیوں ہی کا محاسبہ نہ ہوگا بلکہ شوہر کی بدخلقی، درشت کلامی اور اس کے ظلم وتعدی کا بھی حساب ہوگا اور پھر جس کے ذمہ جس کا حق نکلے گا، اسے دلایا جائے گا۔

4)......آپ نے جو حالات لکھے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کے بگاڑ میں سب سے زیادہ دخل آپ کی درشت کلامی کا ہے (جس میں آپ غالباً اپنی بیماری اور مزاجی ساخت کی وجہ سے کچھ معذور بھی ہیں) آپ کی اہلیہ اور اولاد پر اس کا ردِعمل غلط ہوا ہے، اگر آپ اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کرلیں اور اپنے رویہ کی اصلاح کرلیں تو آپ کے اہل وعیال کے انداز میں تبدیلی آسکتی ہے۔

5)......اگر آپ اپنے مزاج کو حالات کے مطابق تبدیل نہیں کرسکتے تو آخری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بیوی کو فارغ کردیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اپنی اولاد سے بھی کٹ جائیں گے کیونکہ آپ کی جوان اولاد، آپ کو ظالم اور اپنی والدہ کو مظلوم سمجھ کر اپنی ماں کا ساتھ دے گی اور بطورِ انتقام آپ سے قطع تعلق کرلے گی۔ یہ دونوں فریقوں کی دنیا وآخرت کی بربادی کا باعث ہوگا۔

6)......بیوی کی ایذاؤں پر صبر کرنا مستقل جہاد ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بہت بڑا درجہ ہے پس اگر آپ اس اجرِ عظیم کے خواستگار ہیں تو اس کا راستہ صبر واستقامت کی خارداروادی سے ہوکر گزرتا ہے۔ اس صورت میں آپ کو اپنی اہلیہ اور اولاد سے صلح کرنی ہوگی، ان کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم سمجھ کر نہیں بلکہ یہ سمجھ کر کہ ان کی غلطیاں بھی درحقیقت میری نااہلی کی وجہ سے ہیں۔ ظالم میں خود ہوں اور الزام دوسروں کو دیتا ہوں۔

7)......اگر آپ صلح کرنا چاہیں تو اس کے لیے اپنے نفس کو مارنا ہوگا اور چند باتوں کا التزام کرنا ہوگا:

۱۔ ایک یہ کہ آپ کی زبان سے خیر کے سوا کوئی بات نہ نکلے، کبھی کوئی ناگوار لفظ زبان پر نہ آنے پائے۔

۲۔ دوم یہ کہ اپنا حق کسی کے ذمہ نہ سمجھیے اور نہ کسی کی شکایت آپ کے دل میں پیدا ہو بلکہ اگر کوئی آپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو اس کو عطیہ الٰہی سمجھیے اور اگر کوئی بدخلقی یا سختی کے ساتھ پیش آئے تو یہ سمجھ کر میں اس سے بھی زیادہ کا مستحق تھا، مالک کا شکر ہے کہ اس نے میری بدعملیوں کی پوری سزا مجھے نہیں دی،

اس پر صبر کیجئے۔

۳۔تیسرا یہ کہ آپ کی ہر اَدا سے اولاد اور اہلیہ کے ساتھ شفقت و محبت کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔آپ کو ایک محبوب شوہر اور شفیق باپ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

8)......اولاد کو عاق یعنی وراثت سے محروم کرنا شرعاً حرام ہے اور اولاد عاق کرنے سے عاق ہوتی بھی نہیں۔اس لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس غلط اقدام سے باز رہیے۔دنیا کو تو آپ دوزخ بنا ہی چکے ہیں، خدارا آخرت میں بھی دوزخ نہ خریدیے۔جس لڑکے کو عاق کرنے کی دھمکی دی تھی، اسے بلا کر اس سے صلح صفائی کر لیجیے۔

9)......بعض اکابر کا ارشاد ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑتا اور مالک کی نافرمانی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو پہلی سزا یہ ملتی ہے کہ اس کے بیوی بچوں کو اس کے خلاف کر دیتے ہیں۔اس لیے اگر آپ اپنی بیوی بچوں کے رویہ کو قابل اصلاح سمجھتے ہیں تو اس پر بھی توجہ فرمائیے کہ مالک کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہے؟ اور کیا وہ بھی اصلاح کا محتاج نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ صحیح کر لیجیے۔حق تعالیٰ شانہ آپ کے ساتھ بیوی بچوں کا معاملہ درست فرما دیں گے۔حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے:

پانچ چیزیں آدمی کی سعادت کی علامت ہیں:

۱۔اس کی بیوی اس کے موافق ہو۔

۲۔اس کی اولاد نیک اور فرمانبردار ہو۔

۳۔اس کے دوست متقی اور خدا ترس لوگ ہوں۔

۴۔اس کا ہمسایہ نیک ہو۔

۵۔اور اس کی روزی اپنے شہر میں ہو۔

10)......ممکن ہے میری یہ تحریر آپ کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادہ گرامی کی نظر سے بھی گزرے۔میں ان سے بھی گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ معاملہ کو بگاڑنے سے احتراز کریں۔ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ نیک خاتون کی چھ علامتیں ہیں:

اول: نماز پنجگانہ کی پابند ہو۔

دوم: شوہر کی تابعدار ہو۔
سوم: اپنے رب کی رضا پر راضی ہو۔
چہارم: اپنی زبان کو کسی کی برائی، غیبت اور چغلی سے محفوظ رکھے۔
پنجم: دنیوی ساز وسامان سے بے رغبت ہو۔
ششم: تکلیف پر صابرہ ہو۔
اسی طرح اولاد پر لازم ہے کہ والدین کا احترام کریں۔

حدیث میں ہے:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے والدین کا میرے ذمہ کیا حق ہے؟ فرمایا وہ تیری جنت ہیں یا دوزخ۔'' (مشکوۃ ص ۴۲۱)

حضرت ابودارداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''انہوں نے ایک شخص سے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ باپ جنت کا بہترین دروازہ ہے، اب اگر تو چاہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اس کو ضائع کر دے۔'' (مشکوۃ ص ۴۱۹)

ایک اور حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔'' (مشکوۃ ص ۴۱۹)

ایک اور حدیث میں ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص والدین کا مطیع ہو اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر (والدین میں سے) ایک زندہ ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے، اور جو شخص والدین کا نافرمان ہو اس کے لیے دوزخ کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر (والدین میں سے) ایک ہو تو ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ کسی نے عرض کیا خواہ والدین اس پر ظلم کرتے ہوں؟ فرمایا خواہ اس پر ظلم کرتے ہوں، خواہ اس پر ظلم کرتے ہوں، خواہ اس پر ظلم کرتے ہوں۔'' (مشکوۃ ص ۴۲۱)(۱)

(۱) [آپ کے مسائل اور ان کا حل، از قلم، مفتی محمد یوسف لدھیانوی]

بچوں اور بیوی سے غلط سلوک کی سزا

[ایک عبرت ناک سچی کہانی]

میں ایک ایسا مرد ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا مگر میں نے نہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کیا نہ اس کی نعمتوں کو سنبھال کر رکھا۔ میرا باپ بچپن میں فوت ہو گیا تھا اور میری ماں نے مجھے بڑی محنت ومشقت سے پڑھا لکھا کر اس قابل کیا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ نوکری ملنے کے بعد جیسا کہ سب ماؤں کی آرزو ہوتی ہے کہ جلد بیٹے کا گھر بسا دیں، ماں نے مجھے بھی بہت سی لڑکیاں دکھائیں مگر میں کیونکہ اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس کو نہ صرف ایک اچھی لڑکی ملی تھی بلکہ خوش شکل اور چرب زبان بھی تھا اور لوگوں کو متاثر کرنے کے فن سے بھی آشنا تھا، اس کے علاوہ مغرور اور خودسر ہونے کے باعث میں اپنے غریب رشتے داروں کو منہ تک نہ لگاتا تھا۔ آخر ایک لڑکی کو دیکھ کر میں نے ہاں کر دی اور یوں میری شادی ہو گئی۔

اب اسے میری پسند کہیں یا نہ کہیں، لڑکی میری دیکھی بھالی تھی اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ سلیقہ شعار اور فرض شناس تھی، خوبصورت تو نہ تھی بس قبولِ صورت تھی، شمع محفل نہ بن سکتی تھی، نہ جانِ محفل بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ لہذا جلد ہی وہ میری نظروں سے گر گئی لیکن وہ میری زیادتیوں کا اپنے گھر والوں سے تذکرہ تک نہ کرتی۔ جس طرح شادی سے پہلے میرے کام ماں کرتی تھی، اسی طرح اس نے سنبھال لیے مگر جو رویہ میرا ماں کے ساتھ لاتعلقی کا تھا وہی بیوی کے ساتھ رہا، نہ میں نے کبھی ماں کا خیال کیا تھا نہ بیوی کا۔

جب کبھی میں اپنے دوستوں کے گھر جاتا اور ان کا اپنے خاندان والوں کے ساتھ پیار ومحبت کا سلوک دیکھتا تو اپنے رویہ کا فرق محسوس کرتا۔ حد سے زیادہ خودسر اور خود پسند تھا، جلد ہی بیوی نے میری طبیعت کا اندازہ کر لیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے احساس دلانے کے لیے دوسروں کی مثال دیتی تو میں چڑ جاتا۔ کوئی رشتہ دار

عورتیں میری بیوی کی تعریف کرتیں تو میں جل کر بیوی میں ہزاروں عیب نکال کر اس کو بددل کر دیتا اور اگر بیوی کسی دوست کی اس طرح تعریف کرتی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، کتنا خیال رکھتا ہے تو میں دوست میں کوئی بڑا عیب نکال کر اس کو برا بنا دیتا یا پھر ایسے دوستوں کے گھر بیوی کو لے جانا ہی چھوڑ دیتا۔

ابتداء میں تو وہ میرا بڑا خیال کرتی، گھر کے اندر باہر کے تمام کام خوش اسلوبی سے ہو جاتے، بچے بھی جلدی جلدی ہوئے۔ وہ میرے آرام کی خاطر الگ چھوٹے بچوں کو لے جا کر سوتی، جلدی جلدی بچوں کی پیدائش اور کام کی زیادتی کے باعث اگر اس سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جاتی تو اس کے بدلے اس کو نہ صرف اپنی ماں اور بچوں کے سامنے گالیاں دیتا بلکہ اس کے احتجاج پر اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہ آتا۔

آج ان حالات کو پہنچ کر اب میں سوچتا ہوں کہ لوگ جانور بھی پال لیتے ہیں تو اس سے پیار سے بات کرتے ہیں، ان کا خیال رکھتے ہیں مگر میں تو اپنی ذات کے خول میں بند تھا۔ ماں، بیوی بچوں سب سے خدمت لیتا، خود کسی کے کام نہ آتا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے کیسے بڑے ہوئے، کب بیمار ہوئے اور کیسے صحت یاب ہوئے مجھے نہیں معلوم ...... یہ بھی علم نہیں کہ گھر کیسے چلایا جاتا رہا اور کیا اور کس کس اشیاء کی قیمتیں کب بڑھیں؟

گھر والوں نے مجھے ہر فکر سے آزاد کر دیا تھا پھر بھی میں دفتر جانے اور پیسے کما کر لا کر دینے کو اپنے گھر والوں پر احسان سمجھتا۔ میرے سارے دوست دفتر کے ٹور پر جاتے تو بیویوں کو بھی اپنے پاس سے ٹکٹ لے کر لے جاتے مگر میں بیوی پر روپیہ خرچ کرنے کو فضول خرچی سمجھتا۔ اس کی بیماری کو وہم سمجھ کر نظر انداز کرتا بلکہ اس کے علاج سے بھی بے خبر ہو جاتا۔ اگر وہ بیماری یا تھک کر مجھ سے پہلے سو جاتی تو اس کو گالیاں دیتا۔ بڑھتی ہوئی عمر اور بیماری کے باعث اس نے اپنے کام بچوں میں تقسیم کرنا چاہے تو یہ بھی میں نے اس کی کام چوری تصور کی اور اسے سخت ملامت کرتا۔

وہ کہتی کہ میں مر جاؤں گی تو گھر کون سنبھالے گا، تو میرا جواب ہوتا کہ کل کی مرتی آج مر جاؤ۔ تمہارا پوچھنے والا کون ہے؟ جب بیوی بیمار ہوتی تو بجائے اس پر توجہ دینے کے دوسری شادی کے چکر میں گھر سے باہر رہتا۔ جب وہ مسلسل بیمار رہنے لگی تو میں نے دوسری شادی رچالی۔ دوسری بیوی بہت چالاک تھی، اس نے

گھر اور بچوں کے کاموں سے غفلت برتی مگر میرے ذاتی کام خود سنبھال لیے، اس طرح مجھے اس نے جورو کا غلام بنالیا اور میں اس کے اثر میں آ کر بچوں تک کو بھول گیا۔

اس کی سزا قدرت نے مجھے اس طرح دی کہ جب میری دوسری بیوی کے ہاں ولادت ہوئی تو دوسری بیوی مرگئی۔ پہلی نے اگرچہ طلاق نہ لی تھی مگر اپنے میکے جابیٹھی تھی، مجھے گھریلو کاموں اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے پھر اپنی پہلی بیوی کو بلانا پڑا مگر اس نے میرے پاس آنے سے انکار کردیا کہ جس گھر میں میرے بچے نہیں ہیں میں وہاں آ کر کیا کروں گی کیونکہ سوتیلی ماں کے سلوک اور شادی کے بعد میری بے رخی کے باعث میرا اکلوتا اور قابل بیٹا امریکا چلا گیا اور اپنی ماں کو بھی اپنے پاس بلالیا تھا۔ ایک لڑکی تھی جس کی سوتیلی ماں نے ایک بڈھے سے شادی کردی تھی جو اسے لے کر دبئی چلا گیا تھا۔

آج میں تنہا اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہوں۔ دوست احباب رشتے دار مجھ پر طنز کرکے چلے جاتے ہیں کہ یہ سب خدا کی ناشکری اور غرور وتکبر کا نتیجہ ہے۔

اب میں ہوں اور میری بیماریاں میری ساتھی ہیں مگر نہ اولاد میرے پاس رہنا گوارا کرتی ہے اور نہ کوئی رشتہ دار۔ نرس رکھنے کی مجھ میں استطاعت نہیں۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کا کرچکا ہوتا بس تنہائیوں کے عذاب جھیل رہا ہوں۔ (۱)



(۱) [ماخوذ،از: روزنامہ 'جنگ' بحوالہ: مثالی باپ(ص۳۱۳، ۳۱۵)]

باب۵:

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کی حدود

یادرہے کہ والدین کی اطاعت وفرمانبرداری اوران کے ساتھ حسن سلوک دوایسی چیزیں ہیں جن کا بعض حالات میں آپس میں گہرا تعلق ہے اور بعض حالات میں ان دونوں کی الگ الگ حدود ہیں۔اسے یوں سمجھیے کہ والدین اگر غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی خدمت گزاری ودلجوئی وغیرہ پھر بھی حسبِ استطاعت ضروری ہے مگر ان کا ایسا حکم قابلِ اطاعت نہیں سمجھا جائے گا جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو بلکہ اگر والدین مسلمان ہوں اور کوئی ایسا حکم دیں جو شریعت کے صریح منافی ہو تو پھر ان مسلمان والدین کی بھی اس حکم میں اطاعت نہیں کی جائے گی۔یہ ایک ایسی مسلمہ بات ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں۔

خلافِ شریعت کاموں میں اطاعت نہیں کی جائے گی:

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ [لقمان:۱۵]

''اگر وہ دونوں (یعنی والدین) تم پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مانو، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے رہو۔''

یہی بات قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام پر اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾[سورة العنكبوت:۸]

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔لیکن اگر والدین تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔''

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ والدین اگر کفر وشرک کا حکم دیں تو ان کی بات قطعاً نہیں مانی جائے گی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی والدہ حمنہ بنت سفیان نے غصے میں آ کر کہا:

" وَاللّٰهِ لَااَطْعَمُ طَعَامًا وَلَا اَشْرَبُ شَرَابًا حَتّٰى اَمُوْتَ اَوْ تَكْفُرَ "(۱)

''بخدا! میں اس وقت تک نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک کہ تم کفر کی طرف واپس نہ لوٹ آ ؤ، ورنہ میں اسی طرح جان دے دوں گی۔''

ان کی والدہ اپنے موقف پر اس قدر ڈٹ گئیں کہ زبردستی ان کا منہ کھول کر انہیں کھلایا پلایا جاتا جبکہ دوسری طرف بیٹے کو ان کی یہ دھمکی بھی تھی کہ جب تمہارا دین تمہیں کہتا ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرو، تو پھر تم میرا کہا کیوں نہیں مانتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایات میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

''میں اپنی والدہ سے بڑی محبت کیا کرتا تھا، جب میں نے اسلام قبول کرلیا تو میری والدہ کہنے لگی: ''نہ میں کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی، یہاں تک کہ تو اپنا دین چھوڑ دے یا میں اسی حال میں مرجاؤں گی۔'' چنانچہ (اس نے فاقہ شروع کر دیا اور) وہ مجھے عار دلاتے ہوئے کہتی: او! اپنی ماں کے قاتل! اسی طرح سارا دن گزر گیا حتی کہ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ چنانچہ میں نے بالآخر اپنی ماں کو یہ جواب دیا:

" يَا اُمَّاهُ لَوْ كَانَتْ لَكِ مِائَةُ نَفْسٍ فَخَرَجَتْ نَفْسًا نَفْسًا مَا تَرَكْتُ دِيْنِيْ هٰذَا فَاِنْ شِئْتِ فَكُلِيْ وَاِنْ شِئْتِ فَلَا تَاْكُلِيْ "(۲)

''اے اماں جان! [آپ کی تو ایک جان ہے] اگر آپ کی سو جانیں بھی ہوتیں اور وہ ایک ایک کر کے نکل جاتیں تو میں پھر بھی اپنا دین اسلام نہ چھوڑتا۔ لہذا آپ کچھ کھائیں یا نہ کھائیں، آپ کی مرضی!''

معلوم ہوا کہ کفر وشرک سے متعلقہ امور میں والدین کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ اسی کو بنیاد بناتے

---

(۱) [جامع ترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورة العنکبوت (ح ۳۱۸۹) [صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل سعد بن ابی وقاص (ح ۱۷۴۸)]

(۲) تفسیر القرطبی، بذیل آیت مذکورہ (ج ۱۳ ص ۲۹۱) تفسیر قرطبی کے محقق عبدالرزاق مھدی نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔]

ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کفر وشرک کے علاوہ بھی اگر والدین کوئی ایسا حکم دیں جو شریعت کے منافی ہو تو ان کا وہ حکم نہیں مانا جائے گا۔اس کی تائید کئی ایک صحیح احادیث سے بھی ہوتی ہے مثلاً:

۱۔((لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ)) (۱)

''جس کام میں اللہ کی نافرمانی ہو اس میں مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی۔''

۲۔((اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ)) (۲)

''اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔''

دیگر حالات میں والدین کی اطاعت فرض عین ہے!

خلافِ شرع امور کے علاوہ دیگر حالات میں والدین کی اطاعت فرض عین ہے،اس لیے اگر ایک طرف والدین کی اطاعت کا مسئلہ ہو اور دوسری طرف فرضِ کفایہ یا نوافل وغیرہ سے تعلق رکھنے والا کوئی معاملہ ہو تو ایسی صورت میں فرضِ کفایہ اور نوافل پر والدین کی اطاعت کو بہر صورت مقدم رکھا جائے گا۔فرضِ کفایہ سے متعلقہ بحث ہم آگے آٹھویں باب [جہاد اور والدین کی اجازت کا مسئلہ] میں بیان کریں گے تاہم نوافل کے مقابلہ میں والدین کی اطاعت کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں جس دلیل سے رہنمائی ملتی ہے،وہ درج ذیل حدیث نبویؐ ہے:

☆......حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جُرَیج ایک عابد (راہب) شخص تھا،اس نے عبادت کے لیے (شہر سے باہر جنگل میں) ایک کٹیا (عبادت گاہ) بنا رکھی تھی۔وہ اسی کٹیا میں رہتا تھا،ایک مرتبہ اس کی والدہ اس سے ملنے آئی تو وہ نماز (نفل) پڑھ رہا تھا،اس کی والدہ نے اسے پکارا: او جُرَیج......!

جریج نے (دل میں) کہا: اے میرے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ (کیا کروں؟) چنانچہ اس نے (والدہ کو جواب دینے کی بجائے) نماز جاری رکھی،حتی کہ اس کی والدہ واپس چلی گئی۔دوسرے دن اس کی والدہ دوبارہ آئی مگر اس دن بھی جریج عبادت میں مصروف تھا۔اس کی والدہ نے اسے پکارا: جریج! جریج نے (دل میں) کہا: اے میرے رب! ایک طرف میری

---

(۱) [مسند احمد (ج۵ص۶۶)]

(۲) [صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعة للامام......(ح۷۱۴۵) صحیح مسلم (ح۱۸۴۰)]

نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ اس نے (اس مرتبہ بھی والدہ کو جواب دینے کی بجائے) نماز کو ترجیح دی، چنانچہ اس کی والدہ واپس چلی گئی۔

تیسرے دن اس کی والدہ پھر آئی مگر اس دن بھی جریج عبادت میں مصروف تھا۔ اس کی والدہ نے اسے پکارا: جریج! جریج نے (دل میں) کہا: اے میرے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری والدہ؟ (کیا کروں؟) چنانچہ اس نے (والدہ کو جواب دینے کی بجائے) اب بھی اپنی عبادت کو ترجیح دی، حتی کہ اس کی والدہ نے (اس کے لیے بددعا کرتے ہوئے کہا) یا اللہ! جب تک جریج بدکارہ عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے، اسے موت نہ آئے۔

ادھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں اس جریج کی عبادت وریاضت کا چرچا ہونے لگا، تو ایک فاحشہ عورت، جس کے حسن کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے، نے ان لوگوں سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں جریج کو فتنہ میں مبتلا کر سکتی ہوں، چنانچہ وہ جریج کے پاس آئی اور اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کر دیا مگر جریج نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ چنانچہ وہ ایک چرواہے کے پاس چلی گئی جو جریج کی کٹیا کے پاس ٹھہرا کرتا تھا، اور اپنا آپ اس پر پیش کر دیا۔ اس چرواہے نے اس فاحشہ عورت کے ساتھ بدکاری کی جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ جب اس نے بچہ جنا تو لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ جریج کا بچہ ہے۔ لوگوں نے یہ سنا تو جریج کا محاصرہ کر لیا، اسے باہر نکالا اور اس کی کٹیا مسمار کر کے اسے مارنا شروع کر دیا۔

جریج نے کہا: ''ماجرا کیا ہے؟'' انہوں نے کہا: ''تم نے فلاں فاحشہ سے بدکاری کی ہے جس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوا ہے۔'' جریج نے کہا: ''وہ بچہ کہاں ہے؟'' لوگ وہ بچہ لے آئے۔ جریج نے کہا: ''مجھے مہلت دو، میں نماز پڑھ لوں۔'' چنانچہ اس نے نماز پڑھی اور فراغت کے بعد اس بچے کے پاس گیا اور اس کے پیٹ کو کچوکا دے کر کہا: ''اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟''

اس بچے نے کہا: ''فلاں چرواہا''......!

یہ کرامت دیکھ کر لوگوں نے جریج کے ہاتھ پاؤں چومنے شروع کر دیے، اور اس سے کہنے لگے کہ اب ہم تمہاری یہ کٹیا سونے کی بنا دیتے ہیں۔ جریج نے کہا: ''نہیں، بلکہ جس طرح یہ پہلے مٹی کی تھی اسی طرح یہ مٹی کی بنا دو۔'' چنانچہ لوگوں نے اس کی کٹیا دوبارہ مٹی کی بنا دی۔''[1]

(۱) [صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تقدیم بر الوالدین علی التطوع بالصلاة وغیرها (ح ۲۵۵۰)
نیز دیکھیے: صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب اذا هدم حائطا فلیبن مثله (ح ۲۴۸۲ـ ۳۴۳۶)]

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ والدین کی اطاعت وخدمت نوافل وغیرہ پر مقدم ہے۔ صحیح مسلم میں اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا گیا ہے:

((بَابُ تَقْدِيمِ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ عَلَى التَّطَوُّعِ بِالصَّلَاةِ وَغَيْرِهَا))

''یعنی نوافل وغیرہ پر والدین کی خدمت کو مقدم رکھنے کا بیان''

اختلاف کی صورت میں والد کی مانیں یا والدہ کی؟

اگر والد اور والدہ کی اطاعت وخدمت کے سلسلہ میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے یعنی ایک طرف والد ہو اور دوسری طرف والدہ تو اطاعت (یا دوسرے لفظوں میں نظم ونسق اور گھریلو انتظام وانصرام) سے تعلق رکھنے والے معاملہ میں والد کو والدہ پر ترجیح دی جائے گی جبکہ خدمت، اِحسان، سلوک وغیرہ سے تعلق رکھنے والے معاملات میں والدہ کو ترجیح دی جائے گی اور یہ بات غلط ہے کہ حقِ اطاعت اور حقِ خدمت کا فرق کیے بغیر یہ کہہ دیا جائے کہ ایسے کسی بھی اختلاف کی صورت میں والدہ کو ترجیح دی جائے گی۔

بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں ان احادیث، جن میں والدہ سے حسنِ سلوک کو والد کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ حق دیا گیا ہے، سے یہ استدلال کیا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں والدہ کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن یہ استدلال درج ذیل وجوہات کی بنا پر محل نظر ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان احادیث میں حقِ خدمت یعنی حسنِ سلوک کا ذکر ہے حقِ اطاعت کا نہیں۔ (اس سلسلہ میں جو احادیث گزشتہ سطور میں ذکر کی گئی ہیں، انہیں دوبارہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ نظم ونسق سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُس کی بات مانی جاتی ہے جو ناظم، والی، منتظم، سرپرست، حاکم ہو اور گھریلو انتظام وانصرام ہو یا حکومتی نظم ونسق، اس میدان میں انتظام و انصرام کی تمام تر ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے، عورت پر نہیں۔ بلکہ اگر گھریلو یا ملکی سطح پر یہ ذمہ داری عورت سنبھال لے یا اس کے سپرد کر دی جائے تو اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے معلوم ہوتا ہے:

((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ إِلَى امْرَأَةٍ))[1]

''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنا نظم ونسق کسی عورت کے سپرد کر دیا''۔

---

(۱) [صحيح بخاري: كتاب المغازي: باب كتاب النبى الى كسرى وقيصر (ح ٤٤٢٥)]

ایک اور حدیث نبویؐ ہے:

((اِذَا كَانَ اُمَرَآءُ كُمْ شِرَارَكُمْ وَاَغْنِيَآؤُكُمْ بُخَلَاءَ كُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰى نِسَآءِ كُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا)) (1)

''جب تمہارے بدترین لوگ تمہارے حکمران بن جائیں گے اور تمہارے غنی لوگ بخیل ہو جائیں گے، تو اس وقت تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہوگا......!'' [یعنی مرجانا بہتر ہوگا]

لہٰذا والد چونکہ گھر کا سرپرست اور والی ہے اس لیے گھریلو نظم ونسق سے تعلق رکھنے والے کسی بھی معاملہ میں اس کی رائے کو بحیثیت منتظم ترجیح دی جائے گی۔

۳۔ والدہ اور والد میں اختلاف رائے کی صورت میں والدہ چونکہ بیوی ہونے کے ناطے خود والد (یعنی اپنے شوہر) کی اطاعت کرنے کی پابند ہے لہٰذا اولاد کے معاملات میں اسے بھی اپنے شوہر (یعنی بچوں کے باپ اور گھر کے منتظم) ہی کی اطاعت کرنا ہوگی اور اگر وہ شوہر کی نافرمانی کرے اور اولاد کو اس نافرمانی میں شریک کرے تو اس کا یہ اقدام سخت قابلِ مذمت ہے الا یہ کہ شوہر (منتظم) کی بات خلافِ شرع ہو۔

۴۔ اگر والد فوت ہو جائے تو اس کی جگہ گھر کا انتظام وانصرام والدہ کے ذمہ نہیں بلکہ بیٹے کے ذمے ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ انتظام سے متعلقہ امور میں وہ والدہ سے مشاورت رکھے لیکن حتمی فیصلہ کے سلسلہ میں وہ مختار ہے بشرطیکہ بالغ اور صاحبِ شعور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایسی عورت نیا نکاح کرنا چاہے تو جمہور فقہاء کی رائے میں وہ ازخود نکاح نہیں کرسکتی بلکہ اس کا بیٹا اس کا ولی ہوگا جس کی ذمہ داری میں یہ نکاح انجام پائے گا۔ اور بعد از نکاح گھریلو نظم ونسق کے اختیارات بیٹے کی بجائے نئے شوہر کے سپرد ہو جائیں گے۔



(۱) [جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، باب متی یکون ظهر الارض خیرا من بطنها (ح ۲۲۶۶) اس کی سند اگرچہ کمزور ہے تاہم نفس مسئلہ پچھلی صحیح حدیث سے بھی ثابت ہو رہا ہے۔]

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری سے متعلقہ چند سوالات

والد کے حکم سے ان سے کی گئی زیادتی کا انتقام لینا:

سوال:

میرے بعض عزیزوں نے میرے والدین سے زیادتی کی اور اس کی وجہ سے انہیں شدید تکلیف پہنچی۔ درحقیقت اپنے عزیزوں کے ہاتھوں پہنچنے والی اس تکلیف کی وجہ سے انہیں شدید جذباتی صدمہ ہوا۔ جب میرے والد بسترِ مرگ پر تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس زیادتی کا بدلہ لوں اور اس طرح اپنے خاندان کے وقار کو بحال کروں، وہ چاہتے تھے کہ میں ان عزیزوں کی آئندہ نسلوں کو ایسا سبق سکھاؤں کہ آئندہ پھر کبھی اس زیادتی کو دھرایا نہ جائے۔ کیا مجھے اس معاملے میں اپنے والد کے حکم پر عمل کرنا چاہیے؟

جواب:

سب سے پہلی بات میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے مرحوم والد اور ان کے عزیزوں کے درمیان تنازعہ کا فیصلہ کرنے کے قابل ہیں؟ کیا آپ اس سلسلہ میں تمام حقائق سے واقف ہیں؟ یا آپ اس تنازعہ کی تفصیلات محض اپنے والد سے سنتے رہے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو یقینی طور پر آپ کی حیثیت جانبدارانہ ہے۔ اور ایسی صورت میں آپ کو منصف نہیں بنایا جاسکتا۔ چنانچہ اگر آپ اپنے والد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینے کی کوشش کریں گے تو آپ غلطی پر ہوں گے۔

دوسری جانب اگر آپ اپنے والد کے عزیزوں سے تنازعہ کے بارے میں دریافت کریں گے تو آپ کو پھر ایک، یک طرفہ تصویر دکھائی دے گی اور آپ اس کی تصدیق نہیں کرسکیں گے کیونکہ اب آپ کے والد بقید حیات نہیں ہیں۔ چنانچہ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اس جھگڑے میں ملوث نہ ہوں جو کہ آپ کا جھگڑا بھی نہیں ہے۔ اگر آپ پھر بھی ایسا کریں گے تو آپ بھی دوسروں کی طرح زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔

مزید یہ کہ آپ محض ایک خاندانی مسئلہ کو طول دیں گے اور اسے اپنی نسل تک منتقل کریں گے۔ اور اگر آپ اسے چھوڑ دیں گے تا کہ یہ اپنی موت آپ مرجائے تو آپ اپنے خاندان کو یہ موقع فراہم کریں گے

کہ وہ خلیجوں کو پاٹ لے اور اپنے لیے نئی راہ متعین کرے۔ یہ درست ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے والد کی خواہشات کے برعکس ہوگا لیکن اب تو والد صاحب کے حوالے سے آپ کا فرض یہ بنتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے زیادہ اجر وثواب کے حصول کی کوشش کریں۔ اس غرض سے آپ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں اور نیک کام کر کے ان کا ثواب والد کو پہنچائیں۔ اگر آپ والد کی جانب سے حج کر لیتے ہیں، ان کی طرف سے صدقہ کرتے ہیں، قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں، تو اس طرح یقیناً روزِ محشر آپ کے والد کا مقام بلند ہوگا۔ یہ آپ کے والد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے زیادہ بہتر عمل ہوگا۔ ان زیادتیوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔ اگر آپ کے والد کا نقصان ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے حساب لے لیں گے جن لوگوں نے آپ کے والد سے ناانصافی کی ہے۔

آپ کو تعمیری طرزِ عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔ فریقِ مخالف بھی آپ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ یہ بہتر ہوگا کہ آپ خاندانی تفرقوں کو ختم کریں۔ اس کی وجہ سے آپ کے والد روزِ محشر ناخوش نہ ہوں گے۔ (۱)

والدین کے آگے احترام سے جھکنا:

سوال:

ہم لوگ اپنے والدین کے احترام کے طور پر ان کے آگے جس طرح جھکتے ہیں، آپ نے اسے غیر اسلامی قرار دیا تھا۔ کیا ہمارے اس طرزِ عمل کا موازنہ حضرت آدم علیہ السلام کے آگے فرشتوں کے سجدے سے یا پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے آگے ان کے والد اور بھائیوں کے جھکنے سے نہیں کیا جاسکتا؟

جواب:

دنیا کے مختلف علاقوں میں والدین یا بزرگوں کے احترام کے طور پر جھک کر ان کے پاؤں چھوئے جاتے ہیں۔ اس طریقے پر میرا اعتراض اپنی جگہ اب بھی درست ہے۔ یہ انداز بڑی آسانی سے عبادت، پرستش اور پوجا کا روپ دھار سکتا ہے اور کوئی بھی طرزِ عمل جو اسی طرح کا تأثر دے، اسلام میں جائز نہیں ہے۔

آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کے آگے فرشتوں کے سجدہ کرنے کی مثال دی ہے۔ اسے نظیر نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ اس لیے کیا کہ انہیں ایسا کرنے کا حکم خود

(۱) [اسلامی طرزِ فکر، از عادل صلاحی (ج ۲ ص ۲۴۵، ۲۴۶)]

اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ فرشتے، اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم دیتے ہیں، وہ فوراً اسے بجالاتے ہیں، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے آگے سجدہ انہوں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا۔ یہ عبادت کا کوئی انداز نہ تھا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہر حال میں اطاعت کا ایک مظاہرہ تھا۔

اگر آپ کے پاس کوئی ایسی شہادت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، آپ کا اپنے والدین کے آگے سجدہ کرنا پسند کرتے ہیں تو آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں لیکن چونکہ ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ اس لیے آپ کسی کے آگے جھک نہیں سکتے۔ آپ صرف اللہ تعالیٰ کے حضور جھکیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال کے سلسلے میں، میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے میں اس قسم کے طرزِ عمل پر پابندی نہ تھی۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام پیغمبر تھے، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام بھی پیغمبر تھے اور پھر ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی پیغمبر تھے۔ اگر انسانوں کے سامنے جھکنے پر اس زمانے میں پابندی ہوتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کبھی ایک لمحے کے لیے بھی ایسا نہ کرتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی روش کی ممانعت بعد میں کی گئی۔ آپ کے علاقے میں والدین یا بزرگوں کے احترام کے اظہار کے طور پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کی تائید کے لیے ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعے پر انحصار نہیں کر سکتے۔ (۱)

ماں کے حوالے سے بیٹی کے فرائض:

سوال:

میں پوچھتی ہوں کہ ایک بیٹی پر اپنی ایسی ماں کے حوالے سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں جو اکثر و بیشتر غصے میں آجاتی ہے اور بلاسبب اسے جھڑکیاں اور گالیاں دیتی رہتی ہے۔ جب ایسا بار بار ہوتا ہے تو لڑکی کو اس سے بڑی مایوسی ہوتی ہے، اسے اپنی ناقدری کا احساس ہوتا ہے اور گمراہ کن خیالات اس کے ذہن میں آنے لگتے ہیں؟

جواب:

ہر بچے کو خواہ وہ بیٹی ہو یا بیٹا ہو، اپنے والدین کا نہایت فرمانبردار، فرض شناس اور ان کے لیے بے حد خلیق و مہربان ہونا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر والدین بچے کے لیے بلاوجہ سخت رویے کا اظہار کریں تب بھی بچے

(۱) [ایضاً (ج۲ ص۲۴۷)]

کو اپنے والدین کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اسے اپنے والدین کا ہمیشہ احترام کرنا چاہیے، جس کے وہ مستحق ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ والدین کو بھی اپنے بچوں کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔ انہیں بچے کو سمجھنا چاہیے اور یہ احساس کرنا چاہیے کہ ان کے بچے کی ضروریات اور ان کے اپنے بچپن کی ضروریات میں فرق ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ قدریں اور معیار تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات والدین غیر ضروری طور پر بچے کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ اگر نوبت جسمانی سزا تک نہ پہنچے تو بچے کو بدسلوکی کو صبر کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے۔ جب والدین کے غیر معقول سلوک کی وجہ سے والدین کا احترام کرنا دشوار ہو جائے اور پھر بھی بچہ والدین کا احترام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس عمل کا بہترین اجر عطا کریں گے۔

اگر کسی بچے کے والدین جلدی طیش میں آ جاتے ہیں تو بچے کو چاہیے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہونے ہی نہ دے لیکن اگر پھر بھی ایسا ہو جائے تو بچے کو چاہیے کہ اچھے طریقے سے بات کرے۔ اچھا رویہ اپنائے اور جواباً نکتہ چینی سے گریز کرے۔ اس طرح نہ صرف اس کی گھریلو زندگی خوشگوار ہو جائے گی بلکہ اسے اللہ تعالیٰ جل شانہ، کی طرف سے اجرِ عظیم بھی ملے گا۔[1]

والدہ اور اہلیہ..... کس کی مانی جائے؟

سوال:

میری والدہ کی عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ میری اور میری اہلیہ کی دو عادتوں پر اکثر ٹوکتی رہتی ہیں اور یہ بات وجہ تنازعہ بنی رہتی ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جب میں دفتر سے گھر واپس آتا ہوں تو میں اپنی اہلیہ سے پوچھتا ہوں کہ آج دن بھر میں کون کون ملنے کے لیے آیا اور جواب میں میری اہلیہ تمام آنے والوں کی تفصیل بتاتی ہیں اور ملاقاتیوں یا پڑوسیوں سے ہونے والی گفتگو سے مجھے آگاہ کرتی ہے۔ میری والدہ اس بات پر شدید اعتراض کرتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری والدہ کو شکایت ہے کہ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ زیادہ سختی کا رویہ نہیں رکھتا۔ براہِ کرم ان معاملات میں مجھے مشورہ دیجیے۔

---

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۲۴۹)]

جواب:

جہاں تک آپ کی پہلی عادت کا تعلق ہے، آپ کی والدہ صاحبہ کا اعتراض بالکل سچا ہے۔ آپ، خواتین کے مابین ہونے والی گفتگو کی تفصیل جان کر کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ممکن ہے کہ آپ کی پڑوسن اپنا کوئی نجی مسئلہ لے کر آئی ہوں اور انہوں نے محض مشورہ لینے یا اپنے ذہنی تناؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے آپ کی اہلیہ کو اس مسئلے سے آگاہ کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے بے حد نجی معاملات پر آپ کی اہلیہ سے صلاح مشورہ کر رہی ہوں۔ اگر انہیں یہ علم ہو جائے کہ آپ کی اہلیہ ان سے ہونے والی گفتگو کی تمام تفصیلات سے آپ کو آگاہ کر دیتی ہیں تو ممکن ہے کہ آئندہ وہ آپ کی اہلیہ سے ملنے کے بارے میں سوچنا تک پسند نہ کریں۔

مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے پڑوسیوں کے معاملات کی ٹوہ لینے کی بری عادت ہے اور یہ عادت برسوں پرانی ہے۔ اس غرض سے آپ اپنی اہلیہ اور پڑوسیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کی تفصیل معلوم کر لیا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی اہلیہ کے لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ پڑوسنوں سے ہونے والی گفتگو سے آپ کو آگاہ کر دیا کریں۔ نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دو افراد نجی نوعیت کی بات چیت کریں تو انہیں ایک دوسرے کے راز، دیگر افراد کے سامنے افشا نہیں کرنے چاہییں۔ آپ کی اہلیہ دوسروں کی باتوں سے آپ کو آگاہ کر کے نبی ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی کر رہی ہیں، اور جب آپ اس کام کے لیے اپنی اہلیہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو آپ دراصل رسول کریم ﷺ کے فرمان کی خلاف ورزی کے لیے، اپنی اہلیہ کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

آپ اس برائی کو، ضبطِ نفس کے ذریعے بڑی آسانی سے دور کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی اہلیہ کے ساتھ اس معاملے پر گفتگو کرنی چاہیے اور ان سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ لوگوں کے راز آپ کے سامنے افشا نہ کیا کریں، چاہے آپ خود انہیں ایسا کرنے پر مجبور کریں۔ اگر کسی دن اپنے دفتر سے واپسی پر آپ اپنی اہلیہ سے دن بھر کی ''روداد'' سنانے کی فرمائش کرتے ہیں اور وہ انکار کرتی ہیں تو آپ کو اس پر ناراض یا پریشان نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس بات پر اپنی اہلیہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ یہی درست رویہ ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس معاملے میں آپ کی والدہ صاحبہ کا نقطۂ نظر بالکل درست ہے۔

جہاں تک آپ کی والدہ محترمہ کی دوسری شکایت کا تعلق ہے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ ان کی مراد کس بات سے ہے۔ آپ نے صرف اتنا بتایا کہ آپ کی والدہ کو یہ اعتراض ہے کہ آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ سختی کا رویہ کیوں نہیں رکھتے۔ اگر اس اعتراض کا تعلق عمومی صورتِ حال سے ہے کہ آپ نے اپنی اہلیہ کو گھر کے روزمرہ کے کام اپنی مرضی کے مطابق انجام دینے کے لیے آزادی دے رکھی ہے تو آپ کی والدہ محترمہ کا اعتراض بے جا ہے اور آپ کا طرزِ عمل لائقِ تحسین ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔''

آپ کسی فرد کے ساتھ بے حد سخت رویہ اپنا کر اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کر سکتے، تاہم اگر آپ کی اہلیہ اپنے فرائض سے غفلت برتتی ہیں، تب آپ کی والدہ کا نکتۂ اعتراض بجا ہے۔

میرا جہاں تک خیال ہے، آپ کی والدہ یہ چاہتی ہیں کہ آپ گھر کے مالک بن کر رہیں اور گھر میں آپ کا حکم چلے۔ اگر ایسا ہے تو میں کہوں گا کہ آپ کا طرزِ عمل درست ہے کیونکہ خاندان کی خوشیاں صرف باہمی دیکھ ریکھ اور افہام و تفہیم کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ سخت گیری اور اطاعت گزاری کا ماحول پیدا کر کے یہ مسرتیں حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ (۱)

اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق:

سوال:

میں ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہوں اور آپ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں جماعت کا ہمہ وقتی کارکن ہوں اور کسی وجہ سے گھر سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔ والدین کا شدید اصرار ہے کہ میں ان کے پاس رہ کر تجارتی کاروبار شروع کروں۔ وہ مجھے بار بار خطوط لکھتے رہتے ہیں کہ تم والدین کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں ہمیشہ مشوش رہتا ہوں۔ ایک طرف مجھے والدین کے حقوق کا بہت احساس ہے، دوسری طرف میں محسوس کرتا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے میرا جماعت کا کارکن بن کے رہنا ضروری ہے، آپ اس معاملہ میں مجھے صحیح مشورہ دیں تاکہ میں افراط و تفریط سے بچ سکوں۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے گھر میں میری زندگی سخت تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن شرعاً اگر ان کا مطالبہ واجب التعمیل ہے تو پھر بہتر ہے کہ میں اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کروں۔ میرے

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۳۲۸ تا ۳۳۰)]

والد صاحب میری ہر بات کو موردِ اعتراض بنالیتے ہیں اور میری طرف سے اگر بہت ہی نرمی کے ساتھ جواب عرض کیا جائے تو اسے بھی سننا گوارا نہیں فرماتے۔

جواب :

والدین کی اطاعت اور دین کی خدمت کے درمیان توازن کا مسئلہ بالعموم ان سب نوجوانوں کے لیے وجۂ پریشانی بنا رہتا ہے جن کے والدین جماعتِ اسلامی اور اس کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اگر سرکاری ملازمت میں ہو یا کسی اچھے کاروبار میں لگا ہوا ہو تو والدین اس کے ہزاروں میل دور رہنے کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اس کو کبھی نہیں کہتے کہ تو ملازمت یا روزگار کو چھوڑ دے اور آ کر ہماری خدمت کر۔ بیٹے کے اطوار اگر فاسقانہ بھی ہوں تو اعتراض کی زبان کھولنے کی ضرورت انہیں بالعموم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے سارے حقوق انہیں صرف اسی وقت یاد آتے ہیں جب کوئی بیٹا اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے حتیٰ کہ اگر جماعت اسے معقول معاوضہ دے تب بھی وہ یہی ضد کرتے ہیں کہ بیٹا گھر میں بیٹھ کر ان کے ''حقوق'' ادا کرے بلکہ حقوق ادا کرنے پر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا، اس کی ہر بات انہیں کھٹکتی ہے اور اس کی کسی خدمت سے بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔ یہ صورتِ حال میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور جماعت کے بکثرت نوجوانوں کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فی الواقع کیا صورت حال ہے۔ اگر وہی کچھ ہے جو آپ کے بیان سے سمجھ میں آ رہی ہے تو یہ آپ کے والدین کی زیادتی ہے۔ آپ جہاں کام کر رہے ہیں وہیں کرتے رہیں، جو کچھ مالی خدمت آپ کے بس میں ہو وہ بھی کرتے رہیں بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنی مقدرت سے کچھ زیادہ ہی بھیجتے رہیں۔ اور حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً ان کے پاس ہو آیا کریں۔ لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہو اور فی الواقع آپ کے والدین اس بات کے محتاج ہوں کہ آپ کے لیے ان کے پاس رہ کر ہی خدمت کرنا ضروری ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں۔ (1)

والدین کے حقوقِ اطاعت:

سوال: ہمارے حلقہ احباب میں چند مسائل کے متعلق بحث و اختلاف کی صورت پیدا ہوگئی ہے. براہِ

(١) [ترجمان القرآن، جنوری ١٩٥٦ء، بحوالہ رسائل ومسائل (ج٤ ص ٢١٥، ٢١٦)]

کرم ان کی صحیح حقیقت سے آگاہ کریں۔وہ مسائل درج ذیل ہیں:

۱)......کیا حدیث میں یہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن انسان اپنی ماں کی جانب منسوب کیے جائیں گے؟ بعض اصحاب والدہ کی فضیلت اور اس کے حقوق کے سلسلے میں ایسی کوئی حدیث بیان کرتے ہیں۔

۲)......کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا؟ اور کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث ہے اور وہ اپنے آپ کو معاف کر سکتا ہے؟ جن جرائم کا حقوق العباد سے تعلق ہے، کیا ان کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جس فرد کی جان یا مال پر دست درازی ہوئی ہے اگر وہ معاف کر دے تو حق مارنے والے سے باز پرس نہ ہوگی؟

۳)......ماں باپ کی اطاعت کن امور میں اولاد پر جائز اور فرض ہے؟ کیا والدین کے حکم سے کوئی بیٹا شرعاً مجبور ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے؟

جواب:

۱)......اس امر میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے والدین کے حقوق و واجبات پر بہت زور دیا ہے' ان سے حسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق بیان کیے ہیں۔

بعض صحیح احادیث میں جہاں والدین سے صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے' وہاں ایک یا دو مرتبہ پہلے والدہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد والد کا ذکر ہے لیکن جس مضمون کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یہ کسی صحیح اور مستند حدیث میں وارد نہیں ہے اگر چہ بعض حدیث کے مجموعوں میں ایک روایت اس طرح کی مذکور ہے لیکن محدثین اور فنِ رجال کے ماہرین کے نزدیک یہ غیر صحیح ہے۔

اس کے الفاظ یہ ہیں:

((يُدْعَى النَّاسُ بِأُمَّهَاتِهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَتْرًا مِنَ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ))

''قیامت کے روز لوگوں کو ان کی ماؤں کے نسب سے پکارا جائے گا تاکہ اللہ کی جانب سے ان کی پردہ داری ہو۔''

امام ابن جوزی نے اسے [اپنی کتاب] **الموضوعات** میں شمار کیا ہے۔امام سیوطیؒ نے اپنی کتاب **التعقبات علی الموضوعات** میں اگر چہ بہت سی ان احادیث کو موضوعات سے خارج قرار دیا ہے جن

پر ابن جوزیؒ نے وضع کا حکم لگایا ہے، لیکن اس روایت کو **تعقبات، باب البعث** میں ابن عدیؒ کے حوالے سے منکر ہی لکھا ہے۔ منکر اس ضعیف روایت کو کہا جاتا ہے جس کا راوی فحش غلطی، شدید غفلت یا فسق و فجور کا مرتکب ہو۔

والدین اور بالخصوص والدہ کے اکرام واحترام پر دلالت کرنے والی واضح نصوص جب کتاب وسنت میں موجود ہیں تو اس کے بعد ایسی منکر یا موضوع روایت کا سہارا لینے کی کیا حاجت ہے، جس میں ماں کی فضیلت کا کوئی خاص پہلو نہیں نکلتا اور جو قرآن مجید (سورۂ احزاب) کی اس آیت سے بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں لوگوں کو ان کے باپوں کے نسب سے پکارنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

۲)...... یہ صحیح ہے کہ فقہا کی اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ باپ اولاد کو قتل کر دے، تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، لیکن یہ اس بنا پر نہیں کہ باپ بیٹے کا وارث یا ولیِ قصاص ہے اور وہ چاہے تو اپنے آپ کو معاف کر دے۔ اپنے جرم پر اپنے آپ ہی کو قابل معافی قرار دینے کا تصور بالکل لغو ہے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ ہر شخص جو مقتول کا وارث بن سکتا ہو یا مطالبۂ قصاص کا قانونی حق رکھتا ہو، وہ اگر خود ہی قاتل ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، باپ کو اولاد کے قتل کرنے پر قصاص سے صرف اسی وجہ سے مستثنیٰ سمجھا گیا ہے کہ اس کے حقوق اولاد پر بے حد وحساب ہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صحابی اور اس کے بیٹے کی ناچاقی کی خبر نبی ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمایا:

((أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ))

''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں اولاد کو والدین کی کمائی میں شمار کیا گیا ہے۔ اولاد کے بالمقابل والدین کی اس غیر معمولی مرتبت ومنزلت کی بنا پر یہ استنباط کیا گیا ہے کہ والدین سے اولاد کا قصاص نہ لیا جائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ اگر والد اولاد کو ناحق قتل کرے تو عنداللہ بھی اس سے باز پرس نہ ہوگی۔

والدین کے ماسوا دوسرے اعزہ جنہیں وراثت یا قصاص کی ولایت اور مطالبے کا حق پہنچتا ہے، وہ اگر خود اپنے مورث کے قاتل ہوں تو وارث ہونے کے باوجود ان سے قصاص لیا جاسکتا ہے اور اگر محض ورثہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے قتل کا ارتکاب کیا ہو تو وہ ارشاد نبویؐ کے مطابق محروم الارث بھی قرار پائیں گے۔

اسلامی شریعت کا یہ اصول بھی ہرگز نہیں ہے کہ جن جرائم کا تعلق حقوق العباد سے ہے، ان میں اگر مظلوم یا اس کا ولی معاف کر دے تو ریاست ظالم یا مجرم سے مواخذہ نہیں کر سکتی۔ بہت سے جرائم جن کا تعلق انسان کی جان و مال یا آبرو سے ہے وہ حکومت کی دست اندازی کے قابل اور احتساب کے لائق ہیں اور وہ فریقین کے مابین راضی نامہ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر زنا، چوری ڈاکہ ایسے جرائم ہیں جن پر ریاست ہر حال میں گرفت کرے گی اور سزا دے گی کیونکہ انفرادی قتل تو بسا اوقات ذاتی پرخاش یا وقتی محرکات پر مبنی ہوسکتا ہے جس میں مقتول کے ورثاء اگر دیت یا عفو ودرگذر پر راضی ہو جائیں تو مزید انتقامی کاروائی، خونریزی اور فساد کا سد باب ہوسکتا ہے، لیکن مذکورہ بالا اجتماعی جرائم کی نوعیت ایسی ہے جن میں نرمی یا چشم پوشی برتنے سے مزید شر اور فتنوں کے پھیلنے کا امکان قوی ہو جاتا ہے۔ قتل میں بھی اگرچہ مقتول کے اولیاء دیت لے لیں یا معاف کر دیں تو قصاص کی سزا تو نافذ نہ ہوگی لیکن بعض فقہاء کا یہ قول ہے کہ اولیاء کے راضی ہو جانے کے باوجود اگر اسلامی حکومت یہ سمجھے کہ فتنہ وفساد کے اسباب کا پوری طرح قلع قمع کرنے کے لیے قاتل کو کچھ تادیب وتعزیر ضروری ہے تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔

۳)...... جو افعال خدا اور رسول ﷺ کے نزدیک ممنوع یا مذموم ہیں ان میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، بقیہ امور میں والدین کی اطاعت جائز و مستحسن، بلکہ اکثر حالات میں لازم ہے۔ جہاں تک باپ کے کہنے پر بیوی کو طلاق دینے کا سوال ہے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ بیٹا صرف اسی صورت میں طلاق دے، جبکہ والد کا حکم کسی مصلحتِ شرعی پر مبنی ہو، ورنہ ناحق طلاق خدا کی نگاہ میں بہر حال ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔

دراصل یہ مسئلہ آغاز میں اس طرح پیدا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور انہوں نے تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے طلاق دے دی تھی، مگر ظاہر ہے کہ ہر باپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قائم مقام نہیں ہوسکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابیِ رسول اور صاحب اتقاء انسان تھے، ان کی پاکیزہ زندگی اور بے مثال سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے بجا طور پر یہی توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کسی معقول علت اور دینی مصلحت ہی کے تحت کیا ہو گا جس کی وضاحت مناسب یا ضروری نہ ہوگی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی اعتماد کی بنا پر آپ کا کہا مان لیا ہو گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ بیان کر دی ہو مگر وہ آگے نقل ہونے سے رہ گئی ہو۔ اس کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ ایک باپ جب چاہے، اپنے بیٹے سے بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کر سکتا ہے اور بیٹے کے لیے اس کی تعمیل کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے!''[1]

اطاعت والدین اور خدا تعالیٰ کی نافرمانی:

سوال:

میری والدہ مجھ سے اس لیے ناراض رہتی ہے کہ میں لوگوں کی برائیاں بیان نہیں کرتا۔ لوگوں کی بلاوجہ باتیں کرنا اور ان کی غیبت کرنا گناہ ہے، والدہ صاحبہ کی ناراضگی میں میری نجات ہو جائے گی؟...... [محمد اسماعیل، بھوانی پور]

جواب:

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾

''یعنی ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ احسان کی وصیت کی ہے اگر ماں باپ کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ کسی شے کو شریک کرے جس پر تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کا کہنا نہ مان۔ تمہارا لوٹنا میری طرف ہے پس میں تمہارے اعمال کی خبر دوں گا۔''

حدیث میں ہے:

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) [احمد]

''یعنی خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی تابعداری نہیں ہے۔''

اس آیت وحدیث سے معلوم ہوا کہ جب ماں باپ گناہ پر آمادہ کریں تو پھر ان کی کوئی تابعداری نہیں۔ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو ان کی ماں نے قسم کھائی جب تک سعد اسلام کو نہ چھوڑے نہ میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی نہ سایہ میں بیٹھوں گی یہاں تک کہ اس طرح جان دے دوں گی۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا اے ماں! اب تو تیری ایک جان اس طرح نکلے گی اگر سو (۱۰۰) جانیں ہوں اور اکیلی اکیلی اسی طرح نکلیں

---

(۱) [رسائل ومسائل (ج۶ ص ۱۴۴ تا ۱۴۷) جواب از قلم: جسٹس ملک غلام علیؒ]

لیکن سعد اسلام سے نہ پھرے گا۔آ خر ماں نے مجبوراً اپنی قسم توڑ دی ۔خدا تعالیٰ نے اس بارہ میں آیت مذکورہ:وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ ...... اتار دی۔

پس آپ بھی خدا کی نافرمانی کی صورت میں ماں کی ناراضگی کی کوئی پروانہ کریں،لوگوں کی باتیں چغلی، غیبت وغیرہ سب حرام ہیں۔ماں ناراض ہوتی ہے تو ہونے دیں،ان باتوں کا پرہیز ضروری ہے۔نیز ماں کو اتنا دو جتنا اس کے برتنے میں آ جائے ۔زیادہ دینے سے وہ گیارہویں وغیرہ میں خرچ کرے گی جو حرام ہے۔اگر تھوڑا دینے کی صورت میں بھی وہ اپنی ضروریات سے بچا کر گیارہویں وغیرہ میں خرچ کر دے تو پھر آپ پر کوئی گناہ نہیں،اس کا گناہ اسی کے ذمہ ہے۔آپ احسان کا دروازہ بند نہ کریں کیونکہ ماں باپ خواہ مشرک ہوں تو ان کے ساتھ بھی احسانِ سلوک ضروری ہے۔



باب ٦:

والدین کو نیکی کی تلقین اور اس کے آداب

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ والدین بے دین اور اولاد دیندار ہوتی ہے۔ایسی صورتحال میں اگر والدین خلافِ شرع اعمال کا ارتکاب کریں تو صاحبِ شعور اولاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں شریعت کی خلاف ورزی سے منع کریں۔انہیں اَحسن انداز سے نیکی ، بھلائی اور دین کی بات بتائیں اور دین کی خلاف ورزی کے دنیوی واُخروی نقصانات ان کے سامنے واضح کریں۔

والدین کو نیکی کی تلقین اور شریعت کی خلاف ورزی سے منع کرنے کے سلسلہ میں درج ذیل چند باتیں مدنظر رہنی چاہییں:

پہلی بات:

دوسری لوگوں کو نیکی کے کاموں کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے اجتناب کی تبلیغ ہر مسلمان پر بقدرِ استطاعت فرض ہے،اس سلسلہ میں قرآنی اصول الاقرب فالاقرب کالحاظ رکھتا ہے یعنی سب سے پہلے اسے تبلیغ کی جائے جو سب سے زیادہ قریبی ہے، پھر اسے جو اس کے بعد درجہ رکھتا ہے۔اس لحاظ سے والدین سب سے زیادہ قریبی ہونے کی وجہ سے اس بات کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں تبلیغ کی جائے، دین کی بات بتائی جائے ،خلافِ شریعت کاموں سے روکا جائے تاکہ انہیں بھی اللہ کی رضامندی اور اُخروی کامیابی حاصل ہوجائے۔

یہی اصول آنحضرت ﷺ کی دعوت وتبلیغ میں بھی دکھائی دیتا ہے چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾[الشعرآء۔۲۱۴]

''اپنے قریبی رشتہ داروں کو (جہنم سے) ڈرایئے!''

تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا اور فرمایا:

''اے قریش کے لوگو! میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا،لہذا اپنی جانوں کو اللہ کے حضور بیچ دو۔(یعنی اللہ کا دین قبول کر کے اس کے فرمانبردار بن جاؤ)

اے بنی عبد مناف! میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا۔(لہذا دینِ اسلام قبول کرلو)

اے عباس بن عبدالمطلب! میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں تمہارے کچھ کام نہیں آ سکوں گا۔(لہذا ایمان لے آؤ اور نیکی کی راہ اختیار کرلو)

اے میری پھوپھی،صفیہؓ! میں اللہ تعالیٰ کے حضور تمہارے کچھ کام نہیں آؤں گا۔

اے فاطمہؓ بنت محمدؐ! میرے مال میں سے جو چاہو مجھ سے لے لو مگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے کچھ کام نہیں آ سکتا۔''(۱)

اس کے بعد آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنے علاقے کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے دین کی دعوت پیش کی،پھر مکہ المکرمۃ کے گردونواح کا رخ کیا۔پھر ہجرت کر کے دوسرے علاقوں کی طرف بھی نکلے۔حتیٰ کہ وہی دعوت جو آپ کے گھر اور محلے سے شروع ہوئی تھی،رفتہ رفتہ اس کی گونج ساری دنیا میں سنائی دینے لگی!

دوسری بات:

دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آپ متعلقہ فرد کے ساتھ ادب و احترام اور حسنِ سلوک کا مظاہرہ کریں،اسے یہ باور کرائیں کہ آپ اس کے سچے خیر خواہ ہیں اور اسے جہنم سے بچانے کے لیے فکر مند ہیں اور آپ کا کام کسی دنیوی غرض تک محدود نہیں ہے۔

اسی طرح اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ متعلقہ فرد پر فوراً کفر و فسق کا فتویٰ لگانے سے وہ آپ سے نفرت کرے گا۔آپ کو اپنا دشمن سمجھے گا اور نتیجۃً آپ کی بات سننے،آپ کے قریب بیٹھنے اور آپ سے ملاقات کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہوگا۔اس لیے کبھی یہ نہ کہیں کہ تم جہنم میں جاؤ گے،تم کفر پر مرو گے وغیرہ وغیرہ۔

والدین کے سلسلہ میں یہی اصول مزید احتیاط کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ بندوں میں سے تمام بندوں سے بڑھ کر والدین کے حقوق ہیں اور ان کا ادب و احترام بھی دیگر لوگوں سے برتر ہے۔اس لیے والدین کو

(۱) [صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب وانذر عشیرتك الاقربین واخفض جناحك (ح ۴۷۷۰)]

خلافِ شرع امور سے روکنے کے لیے بڑے ادب واحترام سے اپنی بات پیش کریں۔اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام۔کے واقعہ پرغور کیا جائے تو کافی رہنمائی مل سکتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جبکہ آپ کے والد کافر ومشرک تھے۔آپ نے اپنے والد کو کفر وشرک کی برائی سے روکنے کے لیے نہایت ادب کے ساتھ انہیں تبلیغ کی۔یہ الگ بات ہے کہ آپ کے والد نے مرتے دم تک کفر وشرک کی برائی کو ترک نہ کیا مگر دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی تلقین وتبلیغ میں کوئی کوتاہی نہ کی۔آیئے قرآن مجید سے اس واقعہ کے متعلق چند آیات پیش کر کے ان سے حاصل ہونے والے نکات پر غور کرتے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا﴾ [سورۃ مریم۔٤١تا٤٨]

''(اے نبی ﷺ!) اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرو، یقیناً وہ بڑا سچا نبی تھا۔جب اس نے اپنے باپ سے کہا:

''اے میرے ابا جان! آپ کیوں اس چیز کی پوجا کرتے ہیں، جو نہ سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے اور نہ آپ کے کسی کام آ سکتی ہے۔''

''اے میرے ابا جان! بے شک میرے پاس ایسا علم آ چکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔لہذا آپ میری بات مانیں، میں سیدھی راہ کی طرف آپ کی رہنمائی کروں گا۔''

''اے ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، یقیناً شیطان تو رحمان کا بڑا ہی نافرمان ہے۔''

''اے ابا جان! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ پر رحمٰن کی طرف سے عذاب آ جائے، اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔''

اس (ابراہیم علیہ السلام کے باپ) نے کہا:

''اے ابراہیم! کیا تو ہمارے معبودوں سے منہ موڑ رہا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کر چھوڑوں گا۔ (ورنہ) لمبی مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا۔''

ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

''آپ پر سلام، میں اپنے رب سے آپ کی بخشش کی دعا کرتا رہوں گا، وہ رب مجھ پر حد درجہ مہربان ہے۔ میں آپ کو اور جن کو آپ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان سب کو چھوڑتا ہوں اور میں صرف اپنے رب کو پکارتا رہوں گا، مجھے یقین ہے کہ میں اپنے رب سے دعا مانگنے میں محروم نہ رہوں گا۔''

مذکورہ بالا آیات سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱)...... حضرت ابرہیم علیہ السلام کا والد کافر تھا مگر اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے مقامِ ابوّت کا پورا پورا خیال رکھا اور ہر بار انہیں ''یٰـاَبَتِ'' یعنی اے میرے والد صاحب! کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ اس کی جگہ ان کا نام لے کر یا تم، تو اور اوئے وغیرہ کہہ کر انہیں نہیں پکارا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود نبی ہونے اور والد کے کافر ہونے کے باوجود ان کے ادب واحترام کے منافی انداز اختیار نہیں کیا۔

۲)...... اس پوری گفتگو میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے کافر ومشرک اور جاہل ہونے کا فتوٰی صادر نہیں کیا اور نہ ہی اپنے آپ کو ان سے اونچا اور برتر ثابت کرنے کی کوشش کی بلکہ زیادہ سے زیادہ انہوں نے اتنی بات کہی کہ ''اے ابا جان! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ پر رحمٰن کی طرف سے عذاب آجائے، اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔''

اور اپنے متعلق انہوں نے صرف یہ کہا کہ ''اے میرے ابا جان! بے شک میرے پاس ایسا علم آچکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ لہذا آپ میری بات مانیں، میں سیدھی راہ کی طرف آپ کی رہنمائی کروں گا۔''

اور یہ حقیقت تھی اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی۔

۳)......اسی طرح جب ان کے والد نے غصہ میں آ کر ان سے یہ کہا کہ میں تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا اور انہیں گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے اس سخت رویہ کے بالمقابل سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ نہ ہی آگے سے بدتمیزی کی، نہ ہاتھ اٹھایا اور نہ ہی اپنے والد کی جائیداد سے کوئی حصہ مانگا بلکہ اگر انہوں نے کچھ کہا تو یہی کہا:

''آپ پر سلام، میں اپنے رب سے آپ کی بخشش کی دعا کرتا رہوں گا۔''

۴)......اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک آدھ مرتبہ اپنے والد کو تبلیغ نہیں کی کیونکہ ایک آدھ مرتبہ کی تبلیغ سے کوئی باپ بھی اپنے لخت جگر کو گھر سے نکال دینے کی دھمکی نہیں دیتا۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلسل اپنے والد کو ادب واحترام اور حکمت کے ساتھ تبلیغ کرتے رہے حتی کہ ان کے والد نے تنگ آ کر انہیں گھر سے نکال دیا۔

۵)......حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو تبلیغ کرتے وقت معقول دلائل کے ساتھ ان کی غلطی واضح کی مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ جب یہ بت نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی آپ کی کسی کام میں آ کر مدد کرتے ہیں تو پھر ایسے بے جان بتوں کو آپ نے معبود کیوں بنا رکھا ہے؟

بت پرستی کے رد میں یہ ایک ایسی معقول دلیل ہے جو ہر عام وخاص کو بخوبی قائل کر سکتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ والدین کو تبلیغ کرتے ہوئے قرآن وسنت کے مستند دلائل سے ان کی غلطی واضح کریں۔ ایسا نہ ہو کہ مسئلے کی خود پوری طرح سمجھ نہ ہو یا بندہ خود غلطی پر ہو اور خواہ مخواہ گھر میں جھگڑا کھڑا کر دے۔

تیسری بات:

ایک شخص عرصہ دراز سے ایک کام کرتا آیا ہو تو وہ کام اس کی عادت بن جاتا ہے اور ظاہر ہے جو چیز کسی کی عادت بن جائے اسے بدلنا یا ختم کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر والدین میں کوئی خامی یا غلطی ہو تو اسے دور کرنے کے لیے تبلیغ کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ یہ مسئلہ کتنے عرصہ سے ان کے ساتھ رہا ہے، اُسی لحاظ سے اسے ختم کرنے کے لیے محنت، وقت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے والدین کو تبلیغ کرنے کے سلسلہ میں خوب محنت اور صبر سے کام لیں اور یاد رکھیں کہ آنحضرت ﷺ اپنے

چچا ابو طالب کو ان کی موت تک تبلیغ کرتے رہے اور ان کے کفر کے باوجود آخر دم تک ان کے ساتھ رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب تک ان کے والد نے گھر سے نکال نہیں دیا، تب تک وہ مسلسل ان پر محنت کرتے رہے۔ گھر سے نکال دیئے جانے اور جائیداد سے عاق کر دیئے جانے کے باوجود انہوں نے صبر سے کام لیا اور صبر ہی میں خیر ہے جب کہ بے صبری اور جلد بازی میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اَلْاَنَاةُ مِنَ اللّٰهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ)) (۱)

''وقار (حوصلہ و بردباری) اللہ کی طرف سے ہے جبکہ جلد بازی (افراتفری) شیطان کی طرف سے ہے!''

چوتھی بات:

والدین کو خلاف شرع کاموں سے روکنے یا دوسرے لفظوں میں انہیں دیندار بنانے کے لیے جہاں انہیں تبلیغ کرنے، برائی سے روکنے اور گناہ کی اُخروی سزا یاد دلانے، اور ان کی طرف سے ہونے والی سختی پر صبر کرنے کی ضرورت ہے، وہاں ان کے لیے خلوصِ دل سے اللہ کی بارگاہ میں ہدایت کی دعا کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی کام نہیں ہو سکتا اور اللہ کے اذن سے جو کچھ ہوتا ہے، وہ پہلے سے تقدیر میں لکھا جا چکا ہے جبکہ دعا ایک ایسی چیز ہے جو تقدیر کو بدل دیتی ہے جیسا کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ)) (۱)

''تقدیر کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں بدلتی۔''

پانچویں بات:

دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں ایک مرحلہ وہ آتا ہے جہاں اللہ کی نافرمانی اور برائی کو مٹانے کے لیے ہاتھ یعنی قوت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے اور اس میں اہل علم کا اختلاف نہیں، البتہ اہل علم نے اس مسئلہ میں ضرور اختلاف کیا ہے کہ والدین کو خلاف شرع کاموں سے روکنے کے لیے اولاد سخت روی کا مظاہرہ کر سکتی

---

(۱) [ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء في التاني والعجلة (ح ۲۰۱۲) ترمذی کی اس روایت کی سند میں کچھ کمزوری ہے تاہم ترمذی ہی کے اگلے باب میں اسی مفہوم کی مؤید صحیح روایات بھی موجود ہیں۔]

(۲) [ترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء لا یرد القدر الا الدعاء (ح ۲۱۳۹)]

ہے یا نہیں، مثلاً اگر ایک شخص کا والد سودی لین دین کرتا ہے اور اسے گناہ سمجھنے کے باوجود اس سے باز نہیں آتا تو ایسی صورت میں اس کی اولاد اسے اس کام سے روکنے کے لیے زبردستی کر سکتی ہے یا نہیں؟

اسی طرح کے بیسیوں اور مسائل بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے اپنی کتاب: **والدین کا احتساب** میں تفصیل کے ساتھ اہل علم کے نقطہ ہائے نظر کو پیش کیا ہے اور آخر میں بطور نتیجہ اپنی رائے بھی پیش کی ہے۔ ہم یہاں ان کی رائے پیش کر رہے ہیں، موصوف فرماتے ہیں:

''احتساب کے متعلق عام ضابطہ اور اصول یہ ہے کہ سب لوگوں کا احتساب نرمی، مہربانی، ادب اور احترام سے کیا جائے، والدین تو اس طرزِ عمل کے دوسرے لوگوں سے کہیں زیادہ مستحق ہیں۔ ان کے احتساب کی ابتدا خیر وشر سے آگاہی، اور وعظ ونصیحت کے درجات ہی سے کی جائے۔ اور عام حالات میں دورانِ احتساب لطف ونرمی، تواضع اور ادب واحترام کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔

والدین پر مذکورہ بالا طریقہ سے احتساب بے اثر ثابت ہو تو کیا سخت روی استعمال کی جائے؟ اس سوال کے جواب میں درج ذیل باتیں پیش نظر رکھی جائیں:

۱۔ اگر والدین مسلمان ہوں اور محل نظر غلطی شرک یا نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی نہ ہو تو احتسابِ والدین میں سخت روی کا دائرہ انتہائی محدود کر دیا جائے۔

۲۔ سخت روی کے ساتھ احتساب کے آداب کے ضمن میں علمائے امت نے تحریر کیا ہے کہ دورانِ احتساب اپنی زبان کو قابو میں رکھا جائے اور کوئی لفظ بلا ضرورت استعمال نہ کیا جائے۔[1]

احتسابِ والدین میں سخت روی کے استعمال کے وقت اس ادب کی انتہائی توجہ اور اہتمام سے پاس داری کی جائے۔

۳۔ احتسابِ والدین میں درشتی کے متوقع نتائج کو پیش نظر رکھا جائے اگر غالب گمان یہ ہو کہ اس احتساب کے مفاسد حاصل ہونے والے مصالح سے زیادہ ہوں گے تو ایسی صورت مین سخت روی کا استعمال ناجائز ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق ایک عظیم ضابطہ بایں الفاظ ذکر کیا ہے:

"ان الامر والنهي ـ وان كان متضمنا لتحصيل مصلحة ودفع مفسدة ـ فينظر في المعارض

(۱) [ملاحظه هو: احياء علوم الدين، ازامام غزالیؒ (ج ۲ ص ۳۳۱)]

لہ ،فان کان الذی یفوت من المصالح اویحصل من المفاسد اکثر، لم یکن ماموراً بہ، بل یکون محرماً، اذا کانت مفسدتہ اکثر من مصلحتہ))[1]

''اگر چہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں یقیناً مصلحت کا حصول اور شر کا ازالہ ہے لیکن پھر بھی اس کے ردِ عمل پر غور و فکر کیا جائے گا۔ اگر اس کی بنا پر ضائع ہونے والے مصالح اور پیدا ہونے والی خرابیاں زیادہ ہوں تو مصلحت کے مقابلے میں خرابی کے زیادہ ہونے کی صورت میں یہ [احتساب] واجب نہیں، بلکہ حرام ہوگا۔''[2]

موصوف مزید رقم طراز ہیں:

۱)......بیٹا اپنے احتساب کی ابتدا باپ سے متعلقہ برائی کی قباحت اور سنگینی کے بیان سے کرے نیز نرمی، محبت، تواضع اور ادب واحترام سے واضح کرے کہ اس برائی کے ارتکاب کے نتائج کس قدر خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ خیر خواہی اور ہمدردی کے سچے جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور عذاب سے اپنے والد کو ڈرائے۔ اس کے احتساب میں کوئی ایسا لفظ یا اشارہ بھی نہ ہو جس سے اس کی بڑائی، علمیت، شیخی کا اظہار ہو، یا باپ کی ہتک اور توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ علاوہ ازیں اس ساری کارروائی میں حضرت ابرہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنائے رکھے کہ انہوں نے اپنے باپ کے احتساب کی ابتدا کیسے کی۔

۲)......علمائے احتساب نے بیان کیا ہے کہ ہاتھ کے ذریعے برائی کے ازالے کی صورت میں صرف بقدرِ ضرورت کارروائی کی جائے اور اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔ والد کے متعلقہ برائی کو بدلتے وقت اسی بات کا اور زیادہ شدت اور توجہ سے اہتمام کیا جائے۔

۳)......والد کے متعلقہ برائی کو ہاتھ سے بدلنے کی صورت میں متوقع نتائج کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے

(۱) ["الامر بالمعروف والنهي عن المنكر" (ص ۲۱) ہمارے نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اس ضابطہ کی تطبیق کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ایسی بعض مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب: "من صفات الداعية: مراعاة احوال المخاطبين" (ص ۸۷، ۱۰۰) سلف صالحین نے بھی دورانِ احتساب اس ضابطہ کو پیشِ نظر رکھا۔ اس بارے میں بعض شواہد کے لیے ملاحظہ ہو: المرجع السابق (ص ۱۴۲۔ ۱۴۹) نیز ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب: "من صفات الداعية: اللين والرفق" (ص ۵۹، ۶۰) حاشیہ از ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ]

(۲) [والدین کا احتساب، از پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب (ص ۱۰۹، ۱۱۰)]

اگر اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیاں زیادہ ہوں تو یہ کارروائی نہ کی جائے، بلکہ تب ایسا کرنا ناجائز ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمارے رسول کریم ﷺ کی سیرت طیبہ میں متعدد مثالیں موجود ہیں، جن میں ہمارے لیے بہترین راہ نمائی موجود ہے۔ کتنے ہی مواقع پر آنحضرت ﷺ نے احتساب کی وجہ سے پیدا ہونے والی متوقع خرابیوں اور مفاسد کے پیش نظر برائی کے ازالے کے لیے قوت استعمال نہ فرمائی۔ انہی شواہد میں سے سات درج ذیل ہیں:

۱: لوگوں کے اسلام سے بدظن ہونے کے خدشہ کے پیش نظر باوجود استحقاق کے عبداللہ بن اُبی کو قتل نہ کیا۔

۲: لوگوں کو اسلام سے متنفر ہونے کے اندیشہ کی بنا پر اپنی شان میں مقامِ جعرانہ پر گستاخی کرنے والے کا سر قلم نہ کیا۔

۳: لوگوں کے اسلام سے دور ہونے کے خوف کے سبب اپنی شان میں گستاخی پر عبداللہ بن ذی الخویصرہ کی گردن نہ اڑائی۔

۴: دشمن کے ساتھ مل جانے کے اندیشہ کے سبب دورانِ جنگ چور کا ہاتھ کاٹنے سے منع فرمادیا۔

۵: قریش کو اسلام کے متعلق بدگمانی سے بچانے کی غرض سے خانہ کعبہ کو سابقہ بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر نہ کیا۔

۶: بدو کو مسجد میں پیشاب کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔

۷: نماز کے مؤخر کرنے والے ائمہ کے خلاف بغاوت سے منع فرمادیا۔ (۱)

اسی بات کی تاکید متعدد علمائے امت نے بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر اس بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے تحریر کیا ہے:

((واذا كان الامر بالمعروف والنهي عن المنكر من اعظم الواجبات او المستحبات لابد ان تكون المصلحة فيها راجحة على المفسدة اذ بهذا بعثت الرسل و نزلت الكتب والله لا يحب الفساد فحيث كانت مفسدة الامر والنهي اعظم لم يكن مما امر الله به وان كان

(۱) [ان واقعات کے حوالہ جات اوران پر تعلیق کے لیے ملاحظہ ہو راقم السطور [فضل الٰہی] کی کتاب: من صفات الداعية: مراعاة احوال المخاطبين (ص ۹۱ تا ۱۰۰)]

قد ترك واجب وفعل محرم))[1]

''چونکہ امر المعروف اور نہی عن المنکر سب سے عظیم واجبات یا مستحبات میں سے ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس میں مصلحت خرابی پر غالب ہو، کیونکہ اسی کے ساتھ رسولوں کی بعثت ہوئی اور کتابوں کا نزول ہوا اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا، جہاں کہیں بھی امر و نہی کی [وجہ سے پیدا ہونے والی] خرابی زیادہ ہوگی، وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قائم کرنے کا حکم نہ ہوگا۔ اگرچہ ایسی حالت میں واجب کو چھوڑا جائے اور حرام کا ارتکاب ہو۔''

اسی سلسلے میں امام ابن قیمؒ نے قلم بند کیا ہے:

"فاذا كان انكار المنكر يستلزم ماهو انكر منه وابغض الى الله ورسوله فانه لايسوغ انكاره، وان كان الله يبغضه ويمقت اهله وهذا كالانكار على الملوك والولاة بالخروج عليهم، فانه اساس كل شر وفتنة الى آخر الدهر"

''اگر کسی ایک برائی سے منع کرنے کی وجہ سے اس سے زیادہ بڑی برائی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ناپسندیدہ چیز پیدا ہو، تو ایسی برائی سے روکنا جائز نہ ہوگا، اگرچہ وہ برائی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے ہاں قابلِ نفرت ہو۔ ایسی ہی برائی کی ایک مثال بغاوت کے ذریعے بادشاہوں اور حکام کا احتساب ہے، جو کہ درحقیقت قیامت تک ہر شر اور فتنے کی جڑ ہے۔''

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ اگر والدین سے متعلقہ برائی کو ہاتھ کے ساتھ بدلنے کی بنا پر اس سے زیادہ سنگین برائی پیدا ہونے کا غالب گمان ہو، تو ایسی صورت میں اس برائی کو ہاتھ سے نہ بدلا جائے۔[2]

عبداللہ بن اُبَی بن سلول کا واقعہ:

عبداللہ بن اُبَی بن سلول نے آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کی تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، جو سچے مسلمان تھے، انہوں نے اپنے باپ کی اس حرکت کا سختی سے نوٹس لیا حتیٰ کہ انہیں قتل کرنے پر آمادہ ہوگئے مگر آنحضرت ﷺ نے انہیں اس اقدام سے منع کر دیا، ورنہ انہوں نے دین کے معاملے میں اپنے باپ کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرنا تھا۔ روایات کی روشنی میں اس واقعہ کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

---

(۱) [ملاحظہ ہو: الامر بالمعروف والنهی عن المنکر، از ابن تیمیہؒ (ص ۱۷)]

(۲) [والدین کا احتساب، از ڈاکٹر فضل الٰہی (ص ۱۱۹ تا ۱۲۳)]

☆ ......حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كُنَّا فِي غَزَاةٍ فَكَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ: "يَا لَلْمُهَاجِرِيْنَ!" وَقَالَ الْاَنْصَارِيُّ: "يَا لَلْاَنْصَارِ!" فَسَمِعَ ذٰلِكَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟" قَالُوْا: "رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ كَسَعَ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ" فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ" فَسَمِعَ ذٰلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُبَيِّ ابْنُ سَلُوْلٍ فَقَالَ: "اَوَ قَدْ فَعَلُوْهَا؟ لَئِنْ رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلُّ" فقال عمرؓ: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دَعْنِيْ اَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ" فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: دَعْهُ يَتَحَدَّثُ النَّاسُ اِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ يَقْتُلُ اَصْحَابَهُ، فَقَالَ لَهُ اِبْنُهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ: وَاللّٰهِ لَا تَنْقَلِبُ حَتّٰى تُقِرَّ اَنَّكَ الذَّلِيْلُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْعَزِيْزُ، فَفَعَلَ)) (۱)

''ہم ایک جنگ میں تھے کہ ایک مہاجر شخص نے ایک انصاری شخص کی پیٹھ پر ٹھوکر لگائی۔اس مہاجر نے آواز دی:''اے مہاجرو!''ادھر اس انصاری نے بھی آواز دی:''اے انصاریو!''

نبی کریم ﷺ نے ان (آوازوں/بلاووں) کو سنا تو فرمایا:

''یہ جاہلیت کی آوازیں کیسی ہیں؟''

صحابہ نے عرض کیا:

''ایک مہاجر شخص نے ایک انصاری شخص کی پیٹھ پر ٹھوکر لگائی ہے۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ان (پکاروں/بلاووں) کو چھوڑ دو یہ تو گندے بلاوے (پکاریں) ہیں۔''

عبداللہ بن ابی بن سلول کو یہ معلوم ہوا تو کہنے لگا:

''کیا ان مہاجرین نے ایسے ہی کیا ہے؟! اگر ہم مدینہ پلٹے تو (ہم) معزز لوگ (ان) ذلیل لوگوں کو وہاں سے ضرور نکال دیں گے۔'' [معاذ اللہ اس منافق کا اشارہ اللہ کے رسول ﷺ کی طرف تھا اور یہ اللہ کے رسول کی گستاخی تھی اس لیے]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:''اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اس منافق کی گردن مارنے (کی اجازت) دے دیں۔''

(۱) [جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ المنافقین (ح۳۳۱۵)]

لیکن نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''رہنے دو، ورنہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو خود ہی قتل کراتا ہے۔''

عبداللہ بن اُبَی بن سلول کے بیٹے (اس کا نام بھی عبداللہ تھا، اور یہ سچا صحابیِ رسول تھا) نے باپ سے کہا: ''اللہ کی قسم! تو اس وقت تک (شہر کی جانب) لوٹ نہیں سکتا جب تک کہ تو اس بات کا اقرار نہ کرلے کہ تو ہی ذلیل ہے اور رسول اللہ ﷺ معزز ہیں۔''

چنانچہ اس نے اس بات کا اعتراف کیا۔

☆......ایک اور روایت میں ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کے سبب، اپنے باپ کے قتل کی اجازت طلب کی لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے اس بات کی اجازت نہ دی بلکہ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

((لَاوَلٰكِنْ بَرَّ اَبَاكَ وَاَحْسِنْ صُحْبَتَهُ)) (۲)

''نہیں! بلکہ اپنے باپ کے ساتھ نیک اور اچھا سلوک کرو۔''

معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت اولاد اپنے والدین کے ساتھ سخت رویہ اختیار کر سکتے ہیں مگر اس سلسلہ میں ان ہدایات کو ضرور مدنظر رکھا جائے جو پیچھے بیان ہوئی ہیں۔

والدین کو نیکی کی تلقین کیسے کی جائے؟

سوال: میں اپنے والدین اور عمر میں اپنے سے بڑے افراد کو کس طرح یہ مشورہ دوں کہ وہ نمازیں باقاعدگی سے ادا کیا کریں اور رمضان المبارک کے روزے رکھا کریں؟

جواب:

نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد گرامی کا مفہوم یہ ہے کہ اچھا مشورہ دینا نیک نیتی ہے۔ آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ اچھا مشورہ کس کو دیا جائے تو آپ ﷺ نے مسلم معاشرے کے رہنماؤں اور معاشرے کے ہر ایک فرد کو مشورہ دینے کی ہدایت فرمائی۔ کسی کو بھی باقاعدگی سے نماز ادا کرنے اور اسلامی فرائض انجام دینے کی ترغیب دینا، یقیناً اچھا مشورہ ہے۔

---

(۱) [مجمع الزوائد، کتاب المناقب، باب فی عبداللہؓ بن عبداللہ بن اُبی (ج۹ ص۳۱۸) حافظ ہیثمیؒ نے اس حدیث کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔]

اگر کسی کے والدین ان فرائض کوانجام دینے میں تساہل کا مظاہرہ کرتے ہیں تو یقیناً ان کے بیٹے کو چاہیے کہ وہ انہیں فرائض کوادا کرنے پر آمادہ کرے۔ایسا کرتے ہوئے اسے نرمی اوراخلاق سے کام لینا چاہیے اورانہیں یاددلانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ ،کی ناراضگی مول لینا کتنی بڑی بات ہے۔انہیں یہ بھی بتانا چاہیے کہ ان فرائض کی ادائیگی بہت آسان ہے۔یہ بھی خیال رہے کہ کسی کومشورہ دیتے ہوئے یہ نہیں جتانا چاہیے کہ ہم اس سے بہتر انسان ہیں۔خاص طور پر والدین یا بڑوں کے ساتھ یہ رویہ رکھنا جارحانہ ہوگا۔ (۱)

بے دین والدہ کی فرمانبرداری کرنا:

سوال:

میری والدہ صراط مستقیم پر گامزن نہیں۔میں نے اسے جب بھی نصیحت کی وہ مجھ سے ناراض ہوگئی۔کئی کئی دن گذر جاتے ہیں وہ مجھ سے بات نہیں کرتی۔میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ وہ مجھے پر ناراض بھی نہ ہو کہ اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے،یا پھر اسے سمجھانا ہی چھوڑ دوں تاکہ وہ مجھ سے راضی رہے اور پھر اللہ تعالیٰ بھی؟

جواب: اپنی والدہ کو بار بار نصیحت کریں اوراسے بتائیں کہ اس کا عمل باعثِ گناہ وعقاب ہے۔اگر وہ پھر بھی قبول نہ کرے تو اس کے خاوند باپ یا ولی کو اس سے آگاہ کریں،تاکہ وہ اسے سمجھائیں۔اگر آپ کی ماں کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتی ہے تو اس سے الگ ہوجانے میں کوئی حرج نہیں ہے،اس کی بددعائیں یا آپ پر قطعی رحمی اور نافرمانی کے الزامات آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے کیونکہ آپ نے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے غیرت اور منکر کا انکار کرنے کے پیش نظر کیا ہے،اوراگر وہ کسی کبیرہ گناہ کی مرتکب نہیں ہوئی تو پھر آپ کو قطع تعلقی کا حق حاصل نہیں ہے۔ (۲)



(۱) [اسلامی طرزفکر،ازعادل صلاحی(ج۲ص۲۴۳،۲۴۴]

(۲) [فتاوی برائے خواتین(ص۳۵۸تا۳۵۹)فتوی از،شیخ محمد بن صالح عثیمین]

باب ۷:

والدین کی فرمانبرداری کا صلہ اور نافرمانی کی سزا......دنیا میں

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری اوران سے حسنِ سلوک کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ انہوں نے اولاد کو بڑی محنت ومشقت سے پالا پوسا ہے۔لیکن اگر اسے اللہ تعالیٰ کا حکم بھی سمجھ لیا جائے تو پھر والدین کی اطاعت اوران سے حسنِ سلوک پر ہمیں آخرت میں بھی اجرعظیم سے نوازا جائے گا اور دنیا میں بھی۔جبکہ اس کے برعکس ان کی نافرمانی کرنے پر آخرت میں بھی سزا دی جائے گی اور دنیا میں بھی۔جیسا کہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَامِنْ ذَنْبٍ اَجْدَرُ اَنْ یُّعَجِّلَ اللّٰہُ لِصَاحِبِہٖ الْعُقُوْبَۃَ فِی الدُّنْیَا مَعَ مَایَدَّخِرُلَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْبَغْیِ وَقَطِیْعَۃِ الرَّحِمِ))(۱)

’’اللہ کی حدود کو پامال کرنے اور قطع رحمی کرنے کے علاوہ اور کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے مرتکب کو دنیا میں بھی اس کا عذاب دے اور آخرت میں بھی اس کے عذاب کو اس کے لیے جمع رکھے۔‘‘

معلوم ہوا کہ بلاوجہ قطع رحمی کرنا گناہ کا کام ہے اور یہ اللہ کو اتنا ناپسند ہے کہ اس پر دنیا میں بھی انسان کی پکڑ ہو جاتی ہے۔اور یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ انسان کے سب رشتوں ناتوں میں سے بہترین اور قریب ترین رشتہ والدین کا ہے۔لہٰذا جو شخص اپنے والدین سے بے رخی کرے گا، ان کے حقوق نظرانداز کرے گا، ان سے حسنِ سلوک نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اسے اس کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور دیں گے۔درج ذیل روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

☆...... ((عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم : کُلُّ الذُّنُوْبِ یَغْفِرُاللّٰہُ مِنْھَامَاشَاءَ اِلَّا عُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ فَاِنَّہٗ یُعَجِّلُ لِصَاحِبِہٖ فِی الْحَیَاۃِ قَبْلَ الْمَمَاتِ))

(۱) [ابو دائود، کتاب الادب، باب فی النھی عن البغی (۴۸۹۴) ترمذی (ح ۲۵۱۱) ابن ماجہ (ح ۴۲۱۱)]

حضرت ابوبکرة رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''والدین کی نافرمانی کے علاوہ اگر اللہ چاہے تو ہر گناہ معاف کردے،[سوائے شرک کے] جبکہ والدین کے نافرمان کو موت سے پہلے دنیا ہی میں عذاب میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔''(۱)

علاوہ ازیں بے شمار تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ والدین کی فرمانبرداری کرنے والی اولاد اس دنیا میں ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے اور نافرمان اولاد کو اس دنیا میں اس کے کیے کی سزا ملتی ہے۔

میری ذاتی معلومات میں ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ فرمانبردار اولاد کو والدین کی دعاؤں سے دنیا میں بہت کچھ ملا اور نافرمان اولاد کو والدین کی نافرمانی کی دنیا میں بھی سخت سزا ملی۔ چند واقعات آئندہ سطور میں اس غرض سے پیش کیے جارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں والدین کا فرمانبردار بننے اور نافرمانی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پہلا واقعہ:

میرے ایک قریبی دوست نے مجھے بتایا کہ ایک بوڑھا شخص ہمارے ہاں عرصہ دراز سے خاندانی خدمت گار کے طور پر کام کرتا رہا ہے اور اب بھی وہ اپنے خاندان سمیت ہماری رہائش گاہ کے احاطے میں آباد ہے۔ اس شخص کے تین بیٹے ہیں۔

☆...... پہلا بیٹا اس وقت کم وبیش چالیس سال کا ہوگا۔ شادی شدہ ہے، مناسب دنیوی تعلیم حاصل کرکے ایک سرکاری محکمے میں اچھے خاصے عہدے پر فائز ہے۔ شادی اور نوکری کے بعد سے اس نے اپنی رہائش الگ کرلی ہے۔ لیکن نوکری کے بعد سے اس کا رویہ والدین کے ساتھ تلخ رہا ہے، یہ معلوم نہیں کہ ایسا شادی کے بعد اس کی بیوی کی وجہ سے ہوا یا خود اس کا اپنا قصور ہی زیادہ ہے۔

والدین کی نافرمانی میں وہ اس حد تک دور جاچکا ہے کہ والدین اس سے اب ناراض ہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف اسے بھی والدین کی صحت، معاش اور دیگر ضروریات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کی غفلت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ اسے اپنے سرکاری عہدے کی بنیاد پر اس بات کی قانونی اجازت حاصل ہے کہ اپنے والدین کا ہر طرح کا علاج معالجہ مفت کرواسکے، مگر اس نے اپنے والدین کی بے

(۱) [شعب الایمان از امام بیهقی، باب فی برالوالدین (ج٦ ص ٢٠٢) اس کی سند اگرچہ کمزور ہے مگر اس میں بیان ہونے والا مسئلہ پچھلی صحیح حدیث سے ثابت ہورہا ہے۔]

شمار بیماریوں کے باوجود آج تک کبھی انہیں اس سہولت سے مستفید ہونے کا موقع نہیں دیا، حالانکہ اس میں اس کی ایک پائی بھی خرچ نہیں ہوئی تھی!

یہ ایک معمولی سی مثال ہے ورنہ والدین کے حوالے سے اس کے رویے کو مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ والدین کے بارے میں سوچنا اپنے لیے ایک 'بوجھ' سمجھتا ہے۔ معاذ اللہ!

والدین کے ساتھ اس طرح کا گستاخانہ رویہ مسلسل اختیار کیے رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے دنیوی وسائل دینے کے باوجود اب اس پر سختی شروع کر دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اب اسے اپنے کیے کی سزا ملنا شروع ہوگئی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ اب وہ اکثر بیمار رہتا ہے، اور بیماری بھی کوئی خطرناک ہے۔ اچھی نوکری کے باوجود بہت زیادہ مقروض ہو چکا ہے۔ بیوی کے ساتھ تعلقات بھی خوشگوار نہیں۔ آئے دن گھر میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے اور اولاد میں سے بڑا بیٹا سخت نافرمان ثابت ہو رہا ہے۔

ابھی اس کے بوڑھے والدین زندہ ہیں اور اپنی آنکھوں اور کانوں سے اپنے اس نافرمان بیٹے کی تلخ زندگی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اور خود بیٹے کو بھی لازماً اس بات کا احساس ہو چکا ہوگا کہ یہ سب کچھ بوڑھے والدین کی خدمت نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کسی تعصب کا شکار نہ ہو اور والدین سے اب بھی معافی مانگ کر انہیں راضی کر لے تو میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پر آئی ہوئی سختیاں ایک ایک کر کے اس طرح دور ہو جائیں گی جس طرح سورج کی روشنی سے رات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اللہ اسے سمجھ دے۔ آمین!

☆......دوسرا بیٹا چھبیس سال کے لگ بھگ ہوگا۔ افسوس کہ وہ بھی بڑے بھائی کی طرح بدزبان اور والدین کا گستاخ ہے۔ ذہن اچھا تھا، پڑھائی بھی مناسب حد تک کر چکا ہے، مگر والدین کے ساتھ بدزبانی اور ان کی نافرمانی کی سزا اسے یہ مل رہی ہے کہ میرے والد، چچا اور دیگر رشتہ داروں کی سفارشوں اور کوششوں کے باوجود اسے کہیں نوکری نہیں مل رہی۔ اگر کہیں ملتی ہے تو نامعلوم کیوں اس کا جی ہی نہیں چاہتا کہ نوکری کرے چنانچہ چند دنوں بعد پھر گھر بیٹھا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کی یہ بھی والدین کی نافرمانی کی سزا ہے!

☆......تیسرا بیٹا تقریباً چوبیسویں سال میں ہے، اور دونوں بھائیوں کے مقابلہ میں حد درجہ والدین کا فرمانبردار اور اطاعت گزار ہے۔ روزانہ صبح سویرے ہماری گاڑیاں وہ خود صاف کرتا ہے تاکہ والد صاحب

کا ان کے کام میں ہاتھ بٹا دے۔اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ باقاعدہ والدین کے پاؤں دباتا اور انہیں جسمانی راحت پہنچانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔یہی نہیں بلکہ وہ پکا نمازی اور نہایت خوش اخلاق بھی ہے۔غیرت مند اتنا کہ آج تک کبھی کسی کے سامنے اس نے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ ٹاٹ سکولوں سے پڑھتا ہوا آج وہ BSC CHEMISTRY کا ڈگری ہولڈر ہے اور آگے MSC میں اس کا داخلہ ہو چکا ہے۔کچھ عرصہ ہوا کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بڑی اچھی تنخواہ پر اسے ملازمت بھی مل چکی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ بہت ترقی کرے گا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی کمال فرمانبرداری کا صلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں دیا ہے۔ورنہ دوسرے بھائیوں کی طرح اگر وہ بھی چاہتا تو اپنے بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھ کر آوارگی کی زندگی اختیار کر لیتا لیکن اس نے اپنا من مارنا منظور کر لیا مگر والدین کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑنا پسند نہ کیا۔اگر بالفرض وہ بھی پہلے بھائیوں کا سا رویہ اختیار کرتا تو اس کا انجام بھی وہی ہوتا جو دوسرے بھائی بھگت رہے ہیں۔

سچ ہے کہ والدین کی نافرمانی کی سزا جس طرح دنیا میں ملتی ہے اسی طرح ان کی فرمانبرداری کا انعام بھی دنیا میں ملتا ہے اور آخرت میں تو ضرور ملے گا۔ان شاء اللہ!

دوسرا واقعہ:

میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ میں ایک شخص سے ذاتی طور پر واقف ہوں جو معاشی اعتبار سے اتنا مضبوط ہے کہ پاکستان کے صف اول کے امیروں میں اس کا شمار ہو۔دینی حالت بہت بہتر تو نہیں تاہم نماز، روزے اور رزقِ حلال کا اہتمام کرتا ہے۔ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ ٹھیک ہے آپ ذہین ہیں، ہوشیار اور محنتی بھی ہیں، لیکن ذہانت اور محنت کے باوجود بے شمار لوگ بھوکے مرتے ہیں مگر آپ اتنے بڑے بزنس مین کیسے بن گئے؟

میں نے سوچا کہ شاید وہ کوئی لمبی چوڑی کہانی سنائے گا جس میں خیال چوہدری حقیقت کی دنیا میں نظر آ رہا ہوگا مگر جب میں نے اس کا جواب سنا تو سخت حیران ہوا۔اس نے میرے سوال پر کہا:

دوست! یہ سب والد کی اطاعت کا نتیجہ ہے، والد صاحب نیک صفت انسان تھے، انہوں نے زندگی

میں مجھے جو کہا، میں نے اس پر انکار تو دور کی بات کبھی ٹال مٹول اور تاخیر بھی نہیں کی۔اللہ کو میری یہی اُدا پسند آ گئی ہے،اس کے علاوہ باقی سب یونہی باتیں ہیں۔

تیسرا واقعہ:

ایک شخص کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔افسوس کہ وہ چاروں والدین کے حد درجہ نافرمان ثابت ہوئے۔بہت بڑی رہائش اور لمبا چوڑا کاروبار تھا مگر بڑھاپے میں والدین کو نوکروں کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا تھا۔ان چاروں بہن بھائیوں کو اپنی زندگی میں والدین کی نافرمانی کی سزا ملی۔

بہن سب سے بڑی تھی مگر اس نے والدین کی قدر نہ کی اور ہمیشہ ان کے خلاف شاکی رہی۔عرصہ ہوا طلاق ہو چکی ہے،اولاد منتشر اور گھر ٹوٹ چکا ہے۔زندگی کی آخری تلخیاں جھیلنے کے لیے ابھی زندہ ہے۔

سب سے بڑے بھائی کی عمر اس وقت 61 سال ہے۔اس کا بھی گھر ٹوٹ چکا ہے۔اور خود ایک نوکر کے ساتھ زندگی کی آخری تنہائیوں کا عذاب برداشت کر رہا ہے۔

دوسرے بھائی کی حالت بھی اسی رخ پر ہے۔قریب ہے کہ اس کا گھر بھی ٹوٹ جائے۔اس کی اولاد اس سے اتنا توہین آمیز سلوک کر رہی ہے کہ اس کا دسواں حصہ بھی شاید اس نے اپنے والدین سے نہ کیا ہوگا۔

پہلے تین تو معاشی اعتبار سے کچھ نہ کچھ ساخ رکھتے ہیں،البتہ ان کی زندگی میں کوئی اطمینان نہیں ہے جبکہ چوتھے کی حالت معاشی اعتبار سے بھی سخت نا قابلِ بیان ہے۔

ان چاروں نے بوڑھے والدین کے ساتھ جو سلوک کیا وہی سلوک آج ان کے ساتھ ہو رہا ہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے اور ہمیں اپنے والدین کا فرمانبردار بننے اور ہماری اولاد کو ہمارا فرمانبردار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

چوتھا واقعہ:

☆......میرے ایک دوست نے بتایا کہ یونیورسٹی میں ان کے ساتھ ایک نہایت ذہین لڑکا پڑھتا تھا۔ہمیشہ ممتاز پوزیشن حاصل کرتا اور ہر طرح کے امتحان میں سب سے آگے رہتا۔اللہ نے ذہانت اس قدر وافر دے رکھی تھی کہ پوری یونیورسٹی میں سبھی اس کی ذہانت کی مثالیں دیا کرتے تھے۔لیکن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ آخری سیمسٹر میں وہ بری طرح ناکام ہو گیا۔ہم سب حیران تھے کہ صحت اور محنت کے باوجود وہ کیوں امتحان

میں ناکام ہوا۔تحقیقات پر اور تو کچھ پتہ نہ چلا البتہ یہ ایک بات سامنے آئی کہ امتحان سے چند روز پہلے اس نے اپنے بوڑھے والد کو جو یونیورسٹی میں اسے ملنے آیا تھا، برا بھلا کہا اور اپنے دوستوں کی موجودگی میں اس کو مارا پیٹا ہے۔

جب مجھے اس بات کا پتہ چلا تو میں نے کہا اور کچھ نہیں، یہ صرف اسی وجہ سے ناکام ہوا کہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا ہے۔اگر یہ باپ کا احترام کرتا تو اسے یہ سزا نہ ملتی۔

پانچواں واقعہ:

یہ واقعہ ایک بچے کا ہے جو نوائے وقت کے ہفتہ وار میگزین میں شائع ہوا۔آیئے اسے اس بچے کے چھوٹے بھائی کی زبانی سنتے ہیں:

میرا نام محسن ہے۔میں چھٹی کلاس میں پڑھتا ہوں۔میرے بڑے بھائی کا نام احمد ہے اور وہ دسویں کلاس میں پڑھتا ہے۔ہماری رہائش بہادلنگر میں ہے۔امی ابو مجھ سے زیادہ احمد سے پیار کرتے ہیں کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ لاڈلا ہے لیکن وہ والدین کا حکم کم مانتا ہے۔سارا سارا دن دوستوں کے ساتھ کھیلنے اور آوارہ گردی میں گزار دیتا ہے۔پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا۔امی اسے بہت سمجھاتی ہیں کہ بیٹا کھیل کود میں اپنا وقت ضائع نہ کرو اور دل لگا کر پڑھا کرو۔وہ آگے سے جواب دیتا کہ ماں! یہی تو کھیل کود کی عمر ہے، اب انجوائے نہیں کرنا تو کب کریں گے!

امی اسے کہتیں: میں مانتی ہوں کہ کھیل کود کی یہی عمر ہے مگر پڑھائی کی بھی یہی عمر ہے۔اگر تم کھیل کود اور آوارہ دوستوں کو توجہ دو گے تو پڑھائی میں ناکام ہو جاؤ گے اور پھر ساری عمر اپنے کیے پر پچھتاؤ گے۔

احمد ایک کان سے امی ابو کی باتیں سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ایک دن ابو مجھے پڑھا رہے تھے کہ احمد چپکے سے گھر سے باہر نکل گیا اور ساری رات گھر واپس نہ آیا۔امی ابو بہت پریشان تھے،انہوں نے احمد کے تمام دوستوں اور رشتہ داروں سے پتہ کروایا مگر احمد کا کہیں پتہ نہ چلا۔ہم نے پولیس میں بھی رپورٹ درج کروائی مگر ایک ہفتہ گزر گیا اور احمد کی کہیں سے کوئی اطلاع نہ آئی۔احمد کی الماری دیکھنے سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ اس کے کچھ کپڑے اور پیسے وہاں نہیں ہیں۔

امی کا رو رو کر برا حال ہو گیا اور ابو بھی حد سے زیادہ پریشان تھے۔ایک دن اچانک احمد گھر پہنچ گیا۔امی

نے اسے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ابو نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں گئے تھے؟

احمد نے بتایا: میں اپنے دوست علی کے ساتھ اس کے ماموں کے پاس پشاور گیا تھا علی کہتا تھا کہ ہم وہاں جا کر محنت مزدوری کر کے اپنا کما کر جو چاہیں گے کھائیں پییں گے اور موج کریں گے۔ لیکن ابو اس نے وہاں جا کر مجھ سے پیسے چھین لیے اور اور مجھے کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ ابو میں بڑی مشکل سے اس سے بچ کر بھاگ نکلا، ایک آدمی کو میں نے اپنی داستان سنائی تو اسے رحم آ گیا اور اس نے مجھے بہاولنگر کی بس کی ٹکٹ اور کچھ کرایہ دے دیا۔

ابو جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں اب وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بات مانوں گا اور ایسے تمام دوستوں کو چھوڑ دوں گا۔ میں دل لگا کر پڑھائی کروں گا اور آئندہ کبھی گھر سے بھاگنے کی حرکت نہیں کروں گا۔

چھٹا واقعہ: باپ دریا برد!

یہ واقعہ مجھے میرے دوست نے سنایا۔ اس نے کہا کہ ہمارے محلے میں ایک آدمی رہتا ہے، ابھی وہ زندہ ہے۔ اس نے خود یہ بتایا کہ ہمارے خاندان میں یہ رسم تھی کہ باپ یا ماں جب انتہائی بوڑھے اور قریب المرگ ہو جاتے تو انہیں زندہ لے جا کر دریا میں پھینک دیا جاتا۔ میرے دادا پردادا بھی اسی رسم کی وجہ سے دریا برد ہوئے، اس لیے ان کی کہیں قبریں نہیں ملتیں۔ خود میں نے اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ یہ حرکت کرنے کی کوشش کی۔ ہوا یہ کہ جب میرا باپ نہایت بوڑھا ہو گیا اور اس کے زندہ رہنے کی امید باقی نہ رہی تو میں نے ایک دن صبح سویرے اسے گاڑی میں ڈالا اور دریائے راوی کے پرانے پل پر لے گیا۔ منہ اندھیرے جب میں نے اطمینان کر لیا کہ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں تو میں اپنے بوڑھے باپ کو اٹھایا اور دریا میں ڈالنے کے لیے کنارے پر آ گیا مگر جب میں انہیں دریا میں ڈالنے لگا تو انہوں نے نحیف سی آواز میں کہا: بیٹا! مجھے کسی اور جگہ پھینکو، کیونکہ اسی جگہ میں نے اپنے باپ کو پھینکا تھا!

جب میں نے ان کی یہ بات سنی تو میرے بدن پر اچانک لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے انہیں دریا میں پھینکنے کا ارادہ ترک کیا اور واپس گھر لے آیا۔ اس کے بعد وہ بستر مرگ ہی پر طبعی موت مرے۔ اگر خدانخواستہ میں انہیں دریا میں پھینک دیتا تو کل کو میرے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا!

باپ 'اولڈ ہوم' میں..... مغربی معاشروں کی رسمِ بد!

مغربی تہذیب نے انسانیت کو ایک تحفہ یہ دیا ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انہیں گھر سے نکال کر 'اولڈ ہوم' میں بھیج دیا جاتا ہے تا کہ وہ جوان اولاد کی عیاشانہ زندگی میں بوجھ نہ بنیں۔ 'اولڈ ہومز' دراصل ایسے ادارے ہیں جہاں تمام بوڑھوں کو زندگی کے آخری دن گزارنا ہوتے ہیں۔ اولاد ان کی خدمت گزاری نہیں کرتی بلکہ ان اداروں میں تنخواہ پر نرسیں ان کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہیں۔ جب کوئی بوڑھا مرتا ہے تو اس کی اولاد یا قریبی لواحقین کو خبر دے دی جاتی ہے۔ اگر کوئی آ جائے تو ٹھیک ورنہ اسے دفن کر دیا جاتا ہے اور اس کے اولڈ ہوم کے اخراجات اس کے لواحقین سے وصول کر لیے جاتے ہیں۔

ایک بوڑھے کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹے کو اطلاع دی گئی کہ تمہارا باپ فوت ہو گیا ہے۔ بیٹے نے پہلے آنے کا وعدہ کر لیا لیکن بعد میں معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے تو اس وقت دفتر کی فلاں ضروری میٹنگ میں جانا ہے، اس لیے آپ براہِ کرم ان کے کفن دفن کا بندوبست کر دیں، اور بل مجھے بھیج دیں، میں بعد میں بل کی ادائیگی کر جاؤں گا.....!

بوڑھے والدین کو آخری عمر میں گھر سے نکال کر اولڈ ہوم یا نرسنگ ہوم میں داخل کروا دینا، ان کے ساتھ نہایت توہین آمیز سلوک ہے۔ مغربی معاشروں کی یہ روایت وہاں کے بوڑھوں کے لیے قیامت خیز ہے مگر ان کا کلچر ایسا بن چکا ہے کہ اس کی وجہ سے اب وہاں یہ روایت دن بدن پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ غیر مسلموں کی دیکھا دیکھی اب مسلم معاشروں میں بھی یہ روایت نفوذ کر رہی ہے۔ سنا ہے پاکستان کے بعض بڑے شہروں میں اس طرح کے 'اولڈ ہومز' کا اہتمام کیا جا رہا ہے جہاں بوڑھوں کی رہائش کا انتظام ہو گا۔

اسلام اس طرزِ عمل کو قطعاً پسند نہیں کرتا بلکہ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ جس طرح بچپن میں والدین نے تمہیں پالا پوسا، اسی طرح بڑھاپے میں تم ان کا سہارا بنو۔ اس حالت میں والدین کی خدمت کرنے کا صلہ جنت بتایا گیا ہے۔ اور اس شخص کو نہایت بدبخت قرار دیا گیا جو والدین دونوں یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی عمر میں پائے اور ان کی خدمت نہ کرے۔ اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے: البرکة مع اکابرکم [صحیح الجامع الصغیر] ''بڑوں اور بزرگوں کے ساتھ برکت ہے۔'' ..... چاہیے کہ بڑھاپے میں والدین کو اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ ہے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا فرق.....!

والدین کے اعمال کا اولاد پر اثر

سوال:

کیا یہ صحیح ہے کہ والدین کی نیکیوں کی وجہ سے اولاد پھلتی پھولتی ہے اور اگر والدین کے اعمال ٹھیک نہ ہوں تو ان سے اولاد متاثر ہوتی ہے؟

جواب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مواقع پر فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک شخص کے گناہوں کی وجہ سے دوسرا شخص متاثر نہیں ہوگا۔ ہر شخص صرف اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔اس اصول کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ والدین کے برے اعمال سے اولاد متاثر نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ جو سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے، کے نزدیک ایسے والدین کی اولاد صرف اپنے اعمال کی بنیاد پر قابلِ جزا یا سزا ہوگی۔

البتہ والدین کی نیکیوں کے اولاد پر اثرات کے بارے میں ہمارے سامنے قران مجید میں مذکور درج ذیل مثال موجود ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کائنات کے نظام کو چلانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور طریقہ کار کے مطالعے کے بارے میں ایک برگزیدہ شخص کے ہمراہ سفر پر نکلے۔اس سفر میں اللہ تعالیٰ کے اس بندے کے بعض افعال حضرت موسیٰ کے نزدیک اس قدر حیرانی کا باعث بنے کہ آپ سوال نہ کرنے کے وعدہ کے باوجود ان کا سبب دریافت کرنے پر مجبور ہوگئے۔اس قسم کے تیسرے واقعہ میں یہ بزرگ اور حضرت موسیٰ جب ایک گاؤں میں داخل ہوئے تو دونوں بھوکے تھے،گاؤں والوں نے انہیں کھانا کھلانے سے انکار کردیا،اس کے باوجود بزرگ شخص نے گاؤں کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی مرمت کی۔حضرت موسیٰ کا خیال تھا کہ دیوار کی مرمت کرنے کے عوض انہیں کچھ ملنا چاہیے۔اس سوال پر یہ بزرگ حضرت موسیٰ سے الگ ہوگئے،لیکن روانہ ہونے سے پہلے اس بزرگ نے اپنے کاموں کے اسباب بتادیے۔دیوار کی مرمت کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ دیوار دو یتیم بچوں کی ملکیت ہے جن کا باپ ایک نیک آدمی تھا اور اس نے

دیوار کے نیچے اپنے بچوں کے لیے خزانہ چھپا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ ہے کہ بڑے ہو کر یہ یتیم بچے اس خزانے سے فائدہ اٹھائیں، اس لیے اللہ نے اپنے اس بندے (یعنی حضرت خضر) کو حکم دیا کہ دیوار کی مرمت کر دی جائے۔

والدین کے اچھے کاموں سے اولاد کو فائدہ پہنچنے کی یہ ایک واضح مثال ہے۔ (۱)

کیا ماں کے قدموں تلے جنت ہے؟

سوال:

اسلام والدین کے رتبہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ والدین کی ہمیشہ عزت کی جانی چاہیے۔ کیا یہ درست ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کسی شخص کی والدہ زندہ ہو تو وہ اپنی دعاؤں کے ذریعہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ کی سزاؤں سے بچا سکتی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب کسی کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو یہ حفاظتی چھتری ہٹ جاتی ہے۔ براہِ کرم تبصرہ فرمایئے؟

جواب:

یہ بات کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔" دراصل اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں کہی جاتی بلکہ یہ ایک تمثیلی اندازِ بیان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فرض شناس اور فرماں بردار بیٹے کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ اگر اس شخص کی والدہ اس کے لیے مسلسل دعا کرتی رہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے ہر عمل میں اس کی رہنمائی فرمائیں، تو یہ اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اس کے علاوہ اپنی ماں کو خوش رکھنے کی کوشش ایک بیٹے یا بیٹی کو اچھا انسان بنائے گی۔ وہ اپنی ماں کی خوشی کو اپنی خوشی پر فوقیت دیں گے۔ یہ وہ کم سے کم حق ہے جس کی ایک ماں مستحق ہے جس نے اپنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال میں اپنی زندگی کے کئی برس لگا دیے۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ کوئی ماں اپنی دعاؤں کے ذریعے اپنی اولاد کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی سزا سے بچا سکتی ہے۔ اگر اس کے بچے اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں تو کوئی بھی انہیں نہیں بچا سکتا۔ صرف ان کی نیکیاں ہی اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحم وکرم سے انہیں ان کے گناہوں کی سزا سے بچا سکتی ہیں۔

---

(۱) [اسلامی طرزفکر، ازعادل صلاحی (ج ۱ ص ۴۳۶)]

اس بات میں شک نہیں کہ والدین کی فرمانبرداری ایک بڑی نیکی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم ملے گا لیکن لوگ اس نیکی کو بیان کرتے ہوئے مبالغہ کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا غلط ہے کہ ایک چھتری ہماری اس وقت تک حفاظت کرتی ہے جب تک ہماری والدہ بقید حیات ہیں۔

یہ بات تو قابلِ فہم ہے کہ ایک فرض شناس بیٹے یا بیٹی کے لیے ان کی ماں کی دعائیں، برائیوں سے انہیں محفوظ رکھیں گی لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکال لینا چاہیے کہ کوئی بھی فرد آزادی کے ساتھ گناہ کرتا پھرے اور یہ امید رکھے کہ اس کی والدہ صاحبہ کی دعائیں اسے مالک یوم الدین کی سزاؤں سے بچالیں گی۔ (۱)

ایک عبرت ناک واقعہ☆......!

ایک نوجوان کو حج کا شوق تھا۔ اس کی ماں اس کو سفر کی اجازت نہ دیتی تھی، چنانچہ وہ بغیر اجازت ہی حج کو چلا گیا۔ راستے میں چوروں نے اسے پکڑا، اس کا زادِ راہ سب چھین لیا اور اس کے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹ کر وہیں اسے چھوڑ دیا۔ بیت اللہ کے مؤذن کو خواب میں اشارہ غیبی ہوا کہ اٹھو اور فلاں جنگل میں جا کر فلاں جوان کی خبر لو کیونکہ مجھے اس پر رحم آتا ہے (یعنی اس نے گو ایک بہت بڑی غلطی کی ہے مگر چونکہ میرے ہی دربار میں آرہا تھا، اس لیے مجھے بھی اس کی خاطر منظور ہے۔)

مؤذن نیند سے بیدار ہوا اور ہتاتے ہوئے جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان پڑا ہے اور اس کے ہاتھ پیر کٹے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا: ''اے شخص! یہ تیرا کیا حال ہے؟''

اس نے کہا: ''میں نے والدین سے اجازت لیے بغیر راہِ کعبہ میں قدم رکھا' اس لیے میرا حال یہ ہوا جو تیرے سامنے ہے تاکہ بندگانِ خدا کو عبرت ہو کہ والدین کا بڑا حق ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر حج کے لیے جانے میں بھی ایسا معاملہ پیش آسکتا ہے، ان کو ناحق ایذا دینا اور برا بھلا کہنے کا تو انجام ہی بہت برا ہے۔''

---

(۱) [اسلامی طرزِ فکر (ج ۲ ص ۲۵۱)]

[☆...... یہ واقعہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ والدین کی نافرمانی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کہ ایسا ہوتا ہے اور اس کی تفصیلات میں ہم بعض سچے واقعات پیچھے پیش کر آئے ہیں۔ مگر یہاں ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (عظیم مسائیں نمبر، جلد ۱ صفحہ ۲۵۵، ۲۵۶) کے حوالے سے جو واقعہ پیش کیا جا رہا ہے اس کا کوئی مستند حوالہ دستیاب نہیں۔ بعض عربی کتابوں میں بھی بغیر تحقیق کے یہ واقعہ درج ہے۔ خود اس واقعہ کا سیاق و سباق بھی اس کی کمزوری کو واضح کر رہا ہے۔ اس کی تاکید ثانی کے لیے ہم اسے یہاں درج کر رہے ہیں۔ (مؤلف)]

یہ سن کر اس مؤذن نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب اس سے توبہ کرو۔ اس نے صدق دل سے توبہ کی اور مؤذن سے درخواست کی کہ مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو تا کہ میں اس کو راضی کروں اور جس طرح حماقت کر کے اپنے حج کے سفر کو کھوٹا کیا ہے اور ہاتھ پاؤں سے محروم ہو گیا ہوں ...... ایسا نہ ہو کہ دمِ آخر ایمان سے ہی محروم ہو جاؤں اور سفرِ آخرت کو کھوٹا کر لوں۔

مؤذن نے یہ سن کر اس کو اٹھایا اور اس کے وطن پہنچا کر اس کی ماں کے دروازے کے پاس بٹھا دیا اور خود واپس ہو گیا۔ اس کی ماں اندر بیٹھی تھی۔ نوجوان نے سنا کہ وہ یوں دعا کر رہی تھی کہ الٰہی! معلوم نہیں کہ اس سفر میں میرے بچے کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا کیونکہ وہ میری اجازت کے بغیر چلا گیا ہے، اب تو اس کو مجھ تک پہنچا دے کہ میرا دل اس کے لیے بے قرار ہے۔

نوجوان بھی ماں کے ان کلمات کو سن کر بلبلا گیا اور اپنے کٹے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا، ماں اندر سے بولی:

''ارے یہ کون ہے جو بیوہ اور غمزدہ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔''

پھر خیال کیا شاید کوئی میرے مسافر بچے ہی کی خبر لایا ہو۔ یہ خیال کر کے اٹھ کر باہر آئی تو دیکھا کہ ایک غریب فقیر سا آدمی بیٹھا ہے۔ کہا: ''اے غریب مسافر آگے آ اگر تجھ کو روٹی کی ضرورت ہے تو روٹی دوں؟''

اس نے کہا: ''میں روٹی کیسے لوں؟ میرے تو ہاتھ ہی نہیں''۔ اس نے کہا: ''اچھا ذرا آگے آ''۔ اس نے کہا: ''آؤں کس طرح؟ میرے تو پاؤں بھی نہیں''۔ اس غریب کی یہ بات سن کر بیوہ کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس نے کہا: ''اے غریب نوجوان! تیری آواز تو میرے بیٹے سے بہت ملتی جلتی ہے۔'' چنانچہ وہ دوڑ کر چراغ لائی اور آگے پیچھے سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کو دیکھ کر اس کی آنکھ ٹھنڈی ہوئی۔ وہ کہتی جاتی تھی:

''تیری ہی طرح میرا ایک بچہ تھا۔ میری اجازت کے بغیر وہ حج کے لیے چلا گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ سفر میں اس کا کیا حال ہوا۔''

ماں کے منہ سے یہ کلمات سن کر وہ جوان صبر نہ کر سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہا: ''اے ماں! تیرا وہ بیٹا میں ہی ہوں۔ تیری حق تلفی میں نے کی اس کا یہ انجام ہوا۔'' ماں نے جب یہ سنا تو ایک ہائے کی اور بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو آسمان کی جانب منہ کیا اور دعا کی:

''الٰہی! تو نے اس کو کیسی سزا دی [illegible] پروردگار! اس کو ہلاک نہ کر اور اسے ایمان کی سعادت سے محروم نہ رکھ......!''

حِصّہ دوم

والدین اور اولاد کے باہمی مسائل

اس حصے میں چند ایک ان ضروری
مسائل کو زیر بحث لایا جارھا ھے جن
میں اولاد اور والدین کا باھمی تنازعه
پیدا ھو جاتا ھے. ایسے متنازعه
معاملات میں اسلامی تعلیمات کی
روشنی میں منصفانه حل پیش کرنے
کی کوشش کی گئی ھے، تاکه نه
اولاد کی حق تلفی ھو اور نه والدین
پر ظلم ھو. اور افھام وتفھیم سے
زندگی کی گاڑی چلتی رھے.



باب ۸:

شادی بیاہ کا مسئلہ

[والدین اور اولاد کا شادی بیاہ کے مسئلہ میں باہمی اختلاف اور اس کا منصفانہ حل]

پیدائش سے بلوغت تک اولاد کی کفالت وحضانت، تعلیم وتربیت اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی فراہمی والدین کے فرائض میں شامل ہے۔ بلوغت تک کی عمر چونکہ ناپختگی اور محتاجی کی عمر ہوتی ہے، اس لیے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب وقوانین میں بھی اس عمر تک بچوں کے معاملات کی تمام تر ذمہ داریاں والدین ہی پر ڈالی جاتی ہیں۔

مغربی طرزِ زندگی اور اسلام:

البتہ مغربی قوانین کی رو سے بلوغت کے بعد اولاد کو اس بنیاد پر مکمل طور پر آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ اب صاحبِ شعور ہیں اور اپنا اچھا برا خود سمجھتے ہیں۔ اور ان کے معاملات میں اگر والدین کسی بھی اعتبار سے مداخلت کریں تو اسے قابلِ سزا جرم شمار کیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں بلوغت کے بعد اولاد کو اس انداز کی آزادی نہیں دی گئی کہ وہ اپنے مشفق ماں باپ کی ہدایات سے بے پرواہ ہو کر جیسے چاہیں اپنے معاملات کے خود ہی فیصلے کرتے چلے جائیں بلکہ بلوغت کے بعد بھی والدین کی جائز خواہشات کی تکمیل اور معروف حکموں کی تعمیل اولاد پر فرض کی گئی ہے۔ اور اس میں خود اولاد ہی کی بہتری ہے اس لیے کہ بلوغت کے بعد انسان ذہین وفطین ہونے کے باوجود اپنے ہر اہم کام میں رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے کہ اس نے زندگی کے سرد وگرم نہیں دیکھے، اور بے شمار ان تلخ حقائق سے ابھی اسے واسطہ نہیں پڑا جس کا تجربہ والدین نے عمر بھر کیا ہوتا ہے۔ اور ایسے اہم معاملات اور مشکل حالات میں والدین سے بڑھ کر کوئی اور مخلصانہ مشورہ دینے والا نہیں ہوتا۔

پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بچہ والدین سے قطع نظر ہو کر کوئی ایسا فیصلہ کر لے جس سے اسے تو ذاتی طور پر بڑا فائدہ پہنچ جائے مگر اس کے بوڑھے اور بے سہارا والدین کا اس میں نقصان ہو۔ اسلام اس یک طرفہ

صورتحال کو پسند نہیں کرتا مثلاً ایک لڑکا لالچ میں اپنی مرضی سے شادی کر کے بیوی سمیت وطن سے دور چلا جاتا ہے اس طرح وہ خودتو اپنی زندگی کو پرعیش بنالیتا ہے مگراس کے وہ والدین جنہوں نے ساری عمر اس کی پرورش کی ہے، اب بڑھاپے میں وہ خود اپنے اس بیٹے کی خدمت اور حسن سلوک کے محتاج ہیں، مگر وہ پیچھے بے سہارا اور کسمپرسی کی حالت میں بیٹھے رہ جائیں تو یہ سراسر غیر اخلاقی طرزِ عمل ہے، جس کی اسلام حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ مغربی معاشروں میں اگر چہ یہ طرزِ عمل رواج پاچکا ہے مگر اسلام ایسے طرزِ عمل کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔

اسلام کا متوازن لائحہ عمل:

دراصل اسلام نے والدین اور اولاد کے مابین ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس طرح کہ جب تک اولاد محتاج ہے والدین پر ان کی ضروریات کی فراہمی کو فرض قرار دے دیا اور جب والدین بوڑھے اور محتاج ہونے لگتے ہیں، اس وقت جوان اولاد کے لیے ان کی خدمت واحسان کو فرض کر دیا۔ گویا اولاد کی پیدائش سے والدین کی وفات تک ایک خاندانی نظام کو قائم رکھنے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا ہے اور اس کی بہتری کے لیے ان مواقع پر افہام وتفہیم کا رویہ اپنانے کا حکم دیا گیا ہے جہاں والدین اور اولاد کے حقوق میں بظاہر تصادم وتنازع پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

بالغ اولاد اور شادی کا مسئلہ:

بلوغت کے بعد اولاد کی شادی ایک اہم ترین مسئلہ ہے اس مرحلہ پر اولاد صاحب شعور ہونے کی وجہ سے اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے خود بھی تحفظات رکھتی ہے تو دوسری طرف اولاد کے رشتہ کے انتخاب میں بہت سی ایسی باتیں بھی والدین کے پیش نظر ہوتی ہیں جن کا تذکرہ اولاد کے سامنے مناسب نہیں ہوتا۔ اس موقع پر والدین اور اولاد دونوں اگر اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر قدم اٹھائیں تو وہ برکت سے خالی نہیں ہوسکتا۔

لڑکے اور لڑکی کا فرق:

شادی کے سلسلہ میں لڑکی کا معاملہ بعض پہلوؤں سے لڑکے سے بہت مختلف ہے۔ (جیسا کہ آئندہ تفصیل سے واضح ہوگا) گھر سے باہر کے معاملات میں لڑکوں کا عمل دخل چونکہ لڑکیوں کے برعکس براہِ

راست ہوتا ہے، اس لیے معاشرتی رویوں اور حالات کی تبدیلیوں اور نزاکتوں کا انہیں کسی حد تک علم واحساس ہوتا رہتا ہے۔ بلکہ بعض معاملات میں لڑکوں کی معلومات اپنے بوڑھے والدین سے بھی زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے کہ بدلتے حالات کو جتنا قریب سے وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں ان کے بوڑھے والدین کے لیے اتنا قریب سے انہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں لڑکے کے لیے کسی ولی یا سرپرست (والد یا چچا وغیرہ) کی موجودگی شادی کی شرائط میں شامل نہیں۔

لڑکا خود اکیلا اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی کرسکتا ہے اس لیے کہ شادی کے بعد ایک نیا خاندان تشکیل پائے گا اور اس نئے خاندان کا ذمہ دار خود لڑکا ہے اس کا والد نہیں۔ لیکن اگر لڑکے کا انتخاب کردہ رشتہ اس کے والدین پسند نہ کریں تو یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جس کا منصفانہ حل ضروری ہے۔

شادی کے تنازعہ کا پیشگی انسداد:

سب سے پہلے تو خود والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کے جوان ہوتے ہی خود ان کے لیے مناسب رشتے تلاش کریں اور ان کی رضامندی کے بعد ان کی بروقت شادی کردیں تاکہ اس طرح کا کوئی جھگڑا اولاد اور والدین کے درمیان راہ نہ پاسکے۔ کیونکہ عام طور پر اس طرح کے جھگڑے اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ والدین بالغ اولاد کے لیے رشتہ تلاش کرنے میں تاخیر کرتے ہیں، اور دوسری طرف اولاد اپنے لیے شریکِ حیات کا از خود انتخاب کرچکی ہوتی ہے۔ بعض والدین اس حقیقت کو خیالی کہانی سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے اب وہ زمانہ نہیں رہا جو نصف صدی پہلے تھا۔ مخلوط تعلیم، میڈیا کے آزادانہ استعمال، انٹرنیٹ کی سہولت اور اس جیسی دیگر چیزوں نے بڑی تیزی سے اثر انداز ہوکر مشرقی ممالک کے مسلمانوں کا رہن سہن خطرناک حد تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ جو والدین اپنی اولاد پر اندھا اعتماد کریں گے اور ان کی سرگرمیوں سے بے خبری کا مظاہرہ کریں گے، وہ مستقبل میں ضرور نقصان دہ صورت حال سے دوچار ہوں گے۔ اس لیے بچوں کی شادی بیاہ کے سلسلہ میں شروع ہی سے ان کی ایسی ذہن سازی کریں کہ وہ انتخابِ رشتہ میں آپ کے حکم کو دل وجان سے تسلیم کریں۔

لیکن اگر والدین کے انتخاب سے پہلے لڑکا خود رفیقۂ حیات کا انتخاب کرلے یا والدین کے انتخاب کو ٹھکرانے پر اصرار کرے تو ایسی صورتحال میں یہ بات تو اسلامی نقطۂ نظر سے طے ہے کہ آپ لڑکے کو مجبور

نہیں کر سکتے۔اور اگر وہ والدین کی ناراضگی مول لے کر از خود شادی کر لے تو اس کی شادی شرعی اعتبار سے منعقد بھی ہو جائے گی مگر والدین کی ناراضگی مول لینے سے اس خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اللہ کی طرف سے بطور سزا کسی نقصان میں مبتلا ہو جائے۔

علاوہ ازیں اگر والدین اس شادی کے بعد اصرار کریں کہ لڑکا اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو بعض صورتوں میں والدین کا یہ مطالبہ پورا کرنا اسلامی تعلیمات کی رو سے اس پر فرض ہو جائے گا بشرطیکہ ان کا مطالبہ کسی معقول دلیل پر قائم ہو۔اس کی تفصیلات اگلے باب [والدین کے اصرار پر بیوی کو طلاق] میں آئیں گی۔

یہاں والدین کو اس حقیقت کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ اگر ان کا مطالبہ معقول وجوہات پر مبنی ہو تو ان کے حق میں از روئے شریعت تو فیصلہ ہو سکتا ہے مگر موجودہ حالات اور ملکی دستور کی وجہ سے اس بات کی توقع تقریباً بے سود ہے!

شادی کے مسئلہ میں جھگڑا پیدا کیوں ہوتا ہے؟

شادی کے موقع پر اولاد اور والدین میں جھگڑا عام طور پر دو وجوہات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے:

☆......ایک وجہ تو خود والدین کی طرف سے بنتی ہے وہ یہ کہ بعض والدین اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور خاندانی عصبیت وغیرہ کو مدنظر رکھ کر بچوں کے لیے رشتے تلاش کرتے ہیں اور اس بات کو مدنظر نہیں رکھتے کہ ان کے بچے بھی اب باشعور اور حالات کو سمجھنے والے ہیں اور آئندہ زندگی بچوں نے خود ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے گزارنی ہے۔ چنانچہ جب ایسے والدین اپنے مفادات کو اولاد کے مفادات پر ترجیح دینے لگتے ہیں تو اولاد اور والدین کے درمیان جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا ہے حتی کہ اگر والدین کی ضد کی وجہ سے لڑکا شادی کر بھی لے تو اکثر و بیشتر ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔اس لیے اگر لڑکے کی شادی کے موقع پر انسان ہونے کے ناطے والدین کے دل میں میل ہو تو انہیں فوراً اس میل کو صاف کر دینا چاہیے۔اس میں جہاں اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگی وہاں خود ان کی اولاد بھی خوش ہوگی اور اپنے والدین کے لیے ہمیشہ دعا گو رہے گی۔

☆......اس جھگڑے کی دوسری وجہ خود اولاد بنتی ہے وہ اس طرح کہ اگر اولاد کی صحیح اسلامی تربیت نہ ہو یا

جوانی کے جذبات انہیں مدہوش کر رہے ہوں تو وہ اپنے مشفق والدین کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی رضامندی کو اپنے لیے باعثِ ہلاکت خیال کرتے ہیں چنانچہ جذبات کی مغلوبی یا تربیت کی کمی کی وجہ سے اولاد ضدی بن جاتی ہے اور والدین کے ساتھ جھگڑا شروع کر دیتی ہے حالانکہ والدین کا فیصلہ ہر لحاظ سے ان کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر وہ بچے نقصان اٹھاتے ہیں جو والدین کا کہا نہیں مانتے اور جو بچے بظاہر نقصان سمجھتے ہوئے بھی محض والدین پر بھروسہ کر کے ان کی اطاعت کر لیتے ہیں وہ بعد میں اس کا اچھا نتیجہ خود ہی دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ایسے موقع پر اولاد کو چاہیے کہ والدین کے ساتھ سمجھوتہ کر لے کیونکہ ایسے موقع پر ان کا فیصلہ ذاتی اغراض و مقاصد پر مبنی نہیں، اور والدین اگر راضی ہیں تو رب راضی ہے اور والدین اگر ناراض ہیں تو رب بھی ایسے بندے سے ناراض ہے۔

لڑکی کی شادی اور والدین:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَأَدَّبَهُنَّ وَزَوَّجَهُنَّ وَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ))(۱)

''جس شخص نے تین بچیوں کی پرورش کی، انہیں تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا، پھر ان کی شادیاں کیں اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کا مظاہرہ کیا، تو اس شخص کے لیے جنت کا انعام ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکی کی شادی کی ذمہ داری براہِ راست والدین پر ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی بچیوں کے لیے مناسب رشتے خود تلاش کریں اور بروقت ان کی شادیاں کر دیں۔ بچیوں کی شادی کے سلسلہ میں والدین کو درج ذیل باتیں مدنظر رکھنی چاہییں:

باپ (ولی) کے لیے ہدایات:

۱)......ایک شفیق باپ کی طرح پورے خلوص سے بچی کے لیے دیندار شخص کا رشتہ تلاش کریں تاکہ کل کو وہ نیک بیوی اور نیک ماں بن کر خوشگوار زندگی گزار سکے۔ اگر آپ نے ذاتی مفادات کے لیے اس کا شریکِ حیات تلاش کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو اللہ کی عدالت میں بھی اس کی جواب دہی ہوگی اور دنیا میں بھی وہ بچی آپ کے لیے بد دعائیں کرتی رہے گی۔

---

(۱) [ابو داؤد: کتاب الأدب باب فی فضل من عال یتامیٰ (ح۵۱۳۸)]

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں برادری ازم کی بنیاد پر، بعض میں علاقائی وقبائلی رسومات کے بل بوتے پر اور بعض میں مال کے لالچ میں والدین اپنی بیٹیوں پر ظلم کرتے ہوئے ان کا نکاح غیر مناسب جگہ پر کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو بچیوں کے نکاح کا معاملہ ایسی صورتحال اختیار کر جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں بازار کا مال سمجھ کر بیچا جا رہا ہے۔ مہر میں بڑی رقم طلب کی جاتی ہے اور اس رقم پر باپ یا بھائی خود قبضہ جما کر بچی دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بچیوں پر ہونے والے اس ظلم کا ردِعمل یہ ہے کہ بچیاں اپنے والدین اور بھائیوں کو اپنا مشفق سمجھنے کی بجائے دشمن سمجھنے لگی ہیں اور نکاح جیسے اہم معاملے میں آشناؤں کے ساتھ گھروں سے راہِ فرار اختیار کر رہی ہیں۔ اگر والدین سنگدلی کا مظاہرہ نہ کریں تو ایسے معاملات پیش نہ آئیں!

۲)...... بچی کی شادی کے سلسلہ میں اس کی ماں سے ضرور مشورہ کریں۔ کیونکہ بچیاں والد کے مقابلہ میں والدہ کے ساتھ آسانی کے ساتھ بات چیت کر لیتی ہیں اور خود ماں کو بھی اپنی بچیوں کی نفسیات کا علم ہوتا ہے۔ اس طرح بچی کی ماں کے مشورہ کے بعد آپ صحیح قدم اٹھا سکیں گے۔ ہمارے ہاں اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط موجود ہے۔ بعض حضرات بچیوں کی ماں یا دادی نانی سے مشورے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور بعض حضرات اس معاملے میں سارا اختیار گھر کی عورتوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ تمام انتظامی معاملات میں سربراہی اور حتمی فیصلے کا اختیار مردوں کو دیا گیا ہے، تاہم کسی بھی اہم معاملے میں فیصلے سے پہلے اس معاملے سے متعلقہ افراد سے مشورے کا اسے حکم بھی دیا گیا ہے۔ اگر ہمارے گھرانوں میں اختیارات کی تقسیم درست ہو جائے اور مشورے کی سنت پر بھی عملدرآمد شروع ہو جائے تو شادی بیاہ سمیت دیگر حساس معاملات بھی نہایت خوش اُسلوبی سے طے پائیں گے۔ اللہ کرے ہم اسلام کے بتائے ہوئے طور طریقوں پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو جائیں!

۳)...... بچی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہ کریں اور نہ ہی اسے خلافِ مرضی فیصلہ پر مجبور کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی کے سلسلہ میں بچی کی رضامندی شرعی واخلاقی ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ افسوس کہ بعض گھرانوں میں اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے والدین اپنی پسند پر بچیوں کو مجبور کرتے ہیں۔ حالانکہ والدین جس شخص کا انتخاب کرتے ہیں، شادی کے بعد بچیوں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے نہ کہ والدین نے۔ والدین اپنے مشوروں اور تجربوں کو تو ضرور مدنظر رکھیں لیکن وہ محض اپنی ضروریات

اورمسائل ہی کوسامنے رکھ کرفیصلہ نہ کردیں بلکہ بچیوں کی ضروریات اورمسائل کوترجیح دینے کی کوشش کریں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ))(۱)

''ولی کی اجازت کے بغیر نکاح جائز نہیں۔''

اس حدیث کی بنیاد پر بعض والدین اس بات کو شرعاً درست سمجھتے ہیں کہ شادی کے معاملے میں جو وہ چاہیں گے وہی ہوگا اور لڑکی کا کام بس ان کی اطاعت ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے مگر اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ والدین اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے لڑکی کا مستقبل تباہ کرتے ہیں تو کردیں، انہیں کوئی پوچھنے اور روکنے والا نہیں......! بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کی اصل ذمہ داری لڑکی کے سرپرست (ولی) پر ہے، اور اس کی اجازت کے بغیر لڑکی کو ازخود اپنا نکاح نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جس باپ اور سرپرست نے نہایت شفقت ومحبت اور محنت سے پالا پوسا ہے، شادی جیسے اہم ترین موقع پر بغیر کسی معقول وجہ کے اسے نظرانداز کردیا جائے۔

لڑکی کے نکاح کے سلسلہ میں اسلام نے جس طرح ولی کی اجازت کو نہایت اہمیت دی ہے اسی طرح دوسری طرف بالغ لڑکی کی رضامندی کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ ایک تو حقوق وفرائض میں توازن رہے اور دوسرا یہ کہ اگر کسی لڑکی کا باپ یا سرپرست اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے لڑکی کے مستقبل کو تباہ کرنے کی حماقت کررہا ہو تو قانونی طور پر اسے اس کی اس حماقت سے روکا جاسکے۔ اور یہ اسلام کی خوبی ہے کہ وہ ہر معاملے کو حسنِ اعتدال بخش کر معقول بنادیتا ہے۔ آیئے چند ایک ان احادیث کا بھی مطالعہ کرلیا جائے جن میں لڑکی کی رضامندی کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے:

❶ ...... حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تُسْتَأْمَرُ الْيَتِيمَةُ فِي نَفْسِهَا فَإِنْ سَكَتَتْ فَهُوَ إِذْنُهَا وَإِنْ أَبَتْ فَلَا جَوَازَ عَلَيْهَا))(۲)

---

(۱) [ابوداؤد: کتاب النکاح: باب فی الولی (ح۲۰۸۵) ترمذی: کتاب النکاح (ح۱۱۰۱) ابن ماجه (ح۱۸۸۱) احمد (ج٤ ص۳۹٤ ص٤۱۳) حاکم (ج۲ ص۱۷۹)]

(۲) [ابوداؤد: کتاب النکاح: باب فی الاستئمار (ح۲۰۹۳) ترمذی (ح۱۱۰۹) احمد (ج۲ ص۲۵۹) حاکم (ج۲ ص۱٦٦) بیهقی (۱۲۰/۷) ابن ابی شیبه (۱۳۸/٤) ابن حبان (ح٤۰۷۹) عبدالرزاق (ح۱۰۲۹۷)]

''کنواری لڑکی سے اس کے نکاح کے لیے پوچھا جائے،اگر وہ (جواب میں) خاموش رہے تو یہ (خاموشی بھی) اس کی اجازت ہے۔اور اگر وہ انکار کر دے تو اس پر زبردستی نہ کی جائے۔''

❷ ...... حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''بیوہ کے نکاح سے پہلے اس سے مشورہ کیا جائے اور باکرہ کے نکاح سے پہلے اس سے اجازت لی جائے۔لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! باکرہ کی اجازت کس طرح ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی خاموشی ہی اس کی طرف سے اجازت ہے۔''(۱)

❸ ......حضرت خنساء بنت خذام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں بیوہ تھی اور میرے والد نے میرا نکاح کر دیا مگر مجھے وہ نکاح پسند نہ تھا۔چنانچہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور اپنا شکوہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے میرا نکاح فسخ کرا دیا۔(۲)

❹ ......حضرت قاسمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جعفرؓ کی اولاد میں سے ایک عورت کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اس کا ولی (جس کی وہ زیر پرورش تھیں) اس کا وہاں نکاح کر دے گا جہاں اس (عورت) کو پسند نہیں۔چنانچہ اس نے قبیلہ انصار کے دو بزرگوں یعنی عبدالرحمٰن اور مجمع بن جاریہ کو اپنے اس خطرے سے آگاہ کیا۔ان دونوں نے اسے تسلی دی کہ تم ڈرو نہیں کیونکہ خنساء بنت حذام کا نکاح اس کے والد نے وہاں کر دیا تھا جہاں اسے پسند نہ تھا،تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس نکاح کو فسخ قرار دے دیا تھا۔(۳)

مراد یہ ہے کہ تمہاری رضامندی کے بغیر تمہارا ولی یہ نکاح نہیں کر سکتا۔اگر اس نے کر بھی دیا تو رخصتی سے پہلے ہی قاضی کے ذریعے اسے فسخ کروایا جا سکتا ہے،جس طرح حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے کروایا تھا۔

❺ ......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک نوجوان کنواری لڑکی اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد نے میرا نکاح کر دیا ہے مگر مجھے یہ نکاح پسند نہیں۔تو نبی اکرم ﷺ نے اسے اختیار دیا (کہ چاہو تو نکاح رد کر دو اور چاہو تو اسے برقرار رکھو)(۴)

(۱) [بخاری: کتاب النکاح: باب لاینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الابرضاھما (ح۵۱۳٦) مسلم (ح۱٤۱۹) ابوداؤد (ح۲۰۹٤) ترمذی (ح۱۱۰۹) ابن ماجہ (۱۸۷۱) نسائی (۸۷/٦) بیهقی (۱۲۰/۷)]

(۲) [بخاری: کتاب الاکراہ: باب لا یجوز نکاح المکرہ (ح٦۹٤۵) ابوداؤد (۲۱۰۱) ابن ماجہ (ح۱۸۷۳) نسائی (۸٦/٦) احمد (۳۲۸/٦)] (۳) [بخاری (ح٦۹٦۹)]

(٤) [سنن ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی البکر...... (ح۲۰۹٦) احمد (ج۱ص۲۷۳) ابن ماجہ (ح۱۸۷۵)]

6 ..... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''ایک نوجوان لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے باپ نے میرے ذریعہ اپنی ذلت مٹانے کے لیے یہ کام کیا کہ اپنے بھائی کے بیٹے کے ساتھ میرا نکاح کر دیا ہے حالانکہ مجھے یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس لڑکی سے کہا کہ یہاں بیٹھی رہو حتی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں۔ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس نے اپنا ماجرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ آپؐ نے اس لڑکی کے والد کو بلایا اور اس کے سامنے اس کا معاملہ اس لڑکی کی رضامندی کے ساتھ مشروط کر دیا (کہ اگر اسے یہ نکاح پسند ہے تو ٹھیک ورنہ اسے فسخ کیا جائے گا) اس پر وہ لڑکی کہنے لگی: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے والد کے کئے ہوئے اس نکاح کو برقرار رکھتی ہوں۔ میں نے تو اس لیے آپؐ سے مسئلہ پوچھا تھا کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ نکاح کے معاملے میں لڑکی کی رضامندی بھی شامل ہے یا نہیں۔ (اور اسے معلوم ہو گیا کہ واقعی نکاح کے لئے لڑکی کر رضامندی بھی ضروری ہے)''[1]

7 ..... ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی کو اختیار دیا تو وہ کہنے لگی:

((قَدْاَجَزْتُ مَاصَنَعَ اَبِیْ وَلٰکِنْ اَرَدْتُ اَنْ تَعْلَمَ النِّسَآءُ اَنْ لَیْسَ اِلَی الْاٰبَاءِ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ))[2]

''میں اپنے والد کے کئے ہوئے اس نکاح کو برقرار رکھتی ہوں، میں تو اس لئے آپؐ کے پاس آئی تھی تا کہ میں دیگر عورتوں کو باخبر کر سکوں کہ نکاح کے معاملہ میں سارا اختیار اولیاء ہی کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔''

۴)..... اگر لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ تاخیر سے کام لیا جائے اور ہر آنے والے رشتہ کو بغیر معقول وجہ کے ٹھکرایا جاتا رہے تو بچیاں احساس کمتری کا شکار ہو کر ضدی بن جاتی ہیں اور عین ممکن ہے کہ کسی رشتے پر وہ آپ کے اس رویہ کی وجہ سے ضد میں آ کر گھر میں جھگڑا کھڑا کر دیں۔ اس لیے اگر کوئی معقول رشتہ بروقت میسر آ جائے تو کسی چھوٹی موٹی بات پر اسے ٹالنے کی کوشش نہ کریں بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ

((اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْا تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ

(۱) [سنن نسائی: کتاب النکاح: باب البکر یزوجها ابوها وهی کارهة (ح۳۲۷۱) احمد (ج۶ ص۱۳۶)]

(۲) [سنن ابن ماجه: کتاب النکاح: باب من زوج ابنته وهی کارهة (ح۱۸۷٤)]

عَرِيضٌ)) (۱)

''جب کوئی ایسا شخص تمہارے پاس نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین واخلاق سے تم راضی ہوتو اسے رشتہ دے دو لیکن اگر تم ایسا نہیں کروگے تو پھر بڑا فساد پیدا ہوگا۔''

۵)...... جولڑکیاں کالجوں، یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہیں، عام طور پر وہ شادی کے معاملہ میں اپنے والدین کے ساتھ جھگڑا پیدا کرتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کی وجہ سے جنسِ مخالف سے بات چیت سے لے کر دوستانہ تعلقات تک ہر معاملہ ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔اور جوانی کی عمر میں جب جنسی جذبات عروج پر ہوں اور تعلیمی ماحول بھی مخلوط ہو تو دوستانہ تعلقات سے بچاؤ تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سی لڑکیاں اُپنے تعلیمی مراحل میں گھر والوں سے چھپ چھپا کر اپنے شریکِ حیات کو منتخب کر لیتی ہیں اور اپنا انتخاب جب وہ والدین کے سامنے رکھتی ہیں تو والدین بالعموم اس پر مطمئن نہیں ہوتے۔اس لیے نہیں کہ انہیں کوئی ذاتی دشمنی ہے بلکہ اس لیے کہ ان کے تجربات کی روشنی میں لڑکی کا انتخاب کئی پہلوؤں سے خود اس لڑکی ہی کے لیے نقصان دہ معلوم ہو رہا ہوتا ہے۔کیونکہ لڑکیاں تو لڑکوں کی ملمع سازیاں نہیں سمجھتیں اور نہ ہی وہ لڑکوں کے بارے میں ٹھوس شواہد کے ساتھ تحقیقات کر سکتی ہیں، چنانچہ وہ تو ان کے دامنِ فریب کا شکار ہونا چاہتی ہیں مگر والدین کسی صورت بھی اپنی لختِ جگر کی تباہی نہیں دیکھ سکتے، اس لیے وہ انہیں بچانے کے لیے سختی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، نتیجۃً گھر میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔

اس جھگڑے کا اصل حل تو یہ ہے کہ بچیوں کو تعلیم کے سلسلہ میں مخلوط ماحول میں نہ بھیجا جائے۔اگر کوشش کی جائے تو یہ کوئی ناممکن بات نہیں،تاہم اعلیٰ تعلیم کے تمام اداروں میں چونکہ مخلوط ماحول ہے اس لیے وہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا کیا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ لڑکیوں کے لیے اول تو تمام علوم وفنون میں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی نہیں۔اور اگر کہیں بڑی اشد ضرورت پڑ جائے تو کوشش کریں کہ شروع ہی سے بچی کی دینی خطوط پر تربیت کر دیں اور اعلیٰ تعلیم کے مراحل کے آغاز ہی میں اس کی شادی بھی کر دیں۔ورنہ وہ مسائل ضرور پیدا ہوں گے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

---

(۱) [جامع ترمذی: كتاب النكاح: باب ماجاء في من ترضون دينه...... (ح١٠٨٤) سنن بيهقي (ج٧ص٧٢) بعض اہل علم اس روایت کی سند کو صحیح اور بعض کمزور قرار دیتے ہیں تاہم مجموعی تجربات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیان ہونے والی بات بالکل درست ہے۔]

لڑکیوں کے لیے ہدایات...... [والدین (ولی) کی اطاعت]

لڑکیوں کی طرف سے یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکے کی بجائے صرف لڑکی کے لیے ولی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے؟ اور اسے والدین کا اس قدر پابند کیوں بنایا گیا ہے؟

اس کا اصل جواب تو یہی ہے کہ یہ ایک خدائی فیصلہ ہے جس کی تعمیل ہمارے لیے ازبس ضروری ہے اور اللہ کی شریعت پر عملدر آمد کرنے میں نہ صرف یہ کہ اُخروی نجات مضمر ہے بلکہ دنیاوی کامیابی کا دارومدار بھی اسی میں ہے۔ تاہم اگر اس شرعی حکم کی حکمت و مصلحت پر غور کیا جائے تو اس کی درج ذیل وجوہات سمجھ میں آتی ہیں:

❶...... اسلام نے مردوزن کے منفی جذبات واحساسات کی بنا پر انہیں جن دو الگ اور مختلف دائروں میں تقسیم کیا ہے، اس کے مطابق عورت کا بنیادی کام گھریلو ذمہ داریوں کا قیام ہے جب کہ مرد کے ذمہ گھر سے باہر کے امور ہیں، خواہ یہ وسائلِ رزق سے متعلقہ ہوں یا دیگر معاشرتی معاملات سے۔ اسلام کی تجویز کردہ اس تقسیم کی وجہ سے عورتوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شریکِ حیات کو معروف و باعزت طریقے سے تلاش کرنے اور فیصلۂ انتخاب سے پہلے ہر طرح کی چھان پھٹک کرنے میں کامیاب و مطمئن ہوسکیں۔ جبکہ مردوں کے لیے اس مسئلہ میں کوئی بڑی مشکل آڑے نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام عورتوں کی خیر خواہی کرتے ہوئے ان کے نکاح کی ذمہ داری ان کے اولیا پر ڈالتا ہے تا کہ معاشرے کے سرد و گرم سے بچشیدہ اور آزمودہ و تجربہ کار اولیاء اپنے زیرولایت لڑکیوں کے لیے مناسب رشتے تلاش کرسکیں۔

❷...... مردوں کے لیے بذاتِ خود اپنے رشتۂ ازدواج کی بات چیت کرنا کوئی مشکل امر نہیں جبکہ عورتوں کے لیے فطری شرم وحیا کے سبب یہ انتہائی مشکل امر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی سے نکاح کے لیے پیش کریں۔ اگر بالفرض کوئی عورت اتنی جرأت کر بھی لے اور دوسری طرف سے مرد اس کی پیش کش کو ٹھکرا دے تو ردِ عمل کے طور پر اس عورت کی کیا کیفیت ہوگی، اہل خرد و دانش اسے بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے عورت کے نکاح کو ولی کی اجازت و رضامندی کے ساتھ مشروط ٹھہرا دیا ہے۔ اور یقیناً یہ عورت پر اسلام کا احسان ہے۔

❸......علاوہ ازیں مرد کے مقابلہ میں عورت، قوتِ فیصلہ، قوتِ برداشت، توازن واعتدال اور ایسی ہی

بے شمار صفات میں فطرتی طور پر ناقص ہوتی ہے۔اس لیے شادی بیاہ جیسے اہم ترین اور زندگی کے فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھنے والے معاملے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے لڑکی کی رضامندی کے ساتھ اس کے اولیاء کی رضامندی کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔

اس لیے لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین پر اعتماد کریں اوران کی اطاعت وفرمانبرداری سے منہ نہ موڑیں۔اسی میں ان کے لیے عافیت ہے۔شادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اب والدین سے آپ کے تمام تعلقات منقطع ہوگئے ہیں بلکہ شادی کے بعد بھی والدین کی ضرورت باقی رہتی ہے۔اگر بالفرض کوئی لڑکی والدین کو ناراض کر کے اوران کی عزت خاک میں ملا کر اپنی مرضی سے شادی کرلے،مگراس کی شادی ناکام ہوجائے جیسا کہ اکثر پسند کی شادیوں میں ہوتا ہے،تو پھر بتایئے اسے کہاں پناہ ملے گی؟

باغیرت والدین تو ایسی لڑکی کو دوبارہ کم ہی قبول کرتے ہیں۔لیکن اگر والدین کے مشورے سے کی گئی شادی خدانخواستہ ٹوٹ جائے،تو لڑکی کے والدین اور بھائی اسے دوبارہ سہارا دینے کے لیے پوری طرح آمادہ ہوتے ہیں۔اس لیے لڑکی کو چاہیے کہ شادی جیسے اہم ترین معاملے میں اپنے والدین سے چھپ کر کوئی قدم نہ اٹھائے۔اگر اسے کوئی لڑکا پسند ہوتو اس کا اظہار مناسب طریقے سے اپنے والدین سے کر دے۔والدین اس معاملے پر ضرور غور کریں گے۔ہوسکتا ہے وہ آپ کو بتائے بغیر ساری تحقیقات کر کے اس نتیجے تک پہنچیں کہ اس سے شادی آپ کے لیے مفید نہیں ہوگی اور وہ آپ کے اس انتخاب سے اتفاق نہ کریں۔اگر آپ کی بات نہیں مانی جاتی تو آپ حوصلے سے کام لیں اور اللہ کے حضور یہ دعا کریں کہ یااللہ! میں نے والدین کی اطاعت کو ترجیح دی ہے اس لیے تو میرے لیے مناسب شریک حیات کا بندوبست کردے۔

اسی طرح والدین آپ کے لیے جو انتخاب کریں آپ اس پر سنجیدگی سے غور کریں،اگر والدین کے انتخاب پر آپ کو کوئی معقول اعتراض نہیں ہے تو خواہ مخواہ ان کی حکم عدولی نہ کریں۔اسی میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔



شادی اور والدین...... چند ضروری سوالات

بیرون ملک ملازمت اور والدین کا شادی پر اصرار:

سوال:

جب سے میں ملازمت کے سلسلہ میں سعودی عرب آیا ہوں، میرے والدین اس بات پر اصرار کررہے ہیں کہ میں شادی کرلوں لیکن دو وجوہات سے میں اب تک والدین کے اس دباؤ کی مزاحمت کرتا رہا ہوں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ موجودہ ملازمت میں مستقبل کا تحفظ نہیں ہے اور تنخواہ بھی اتنی نہیں ہے کہ میں ایک پورے خاندان کی کفالت کرسکوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا اپنا مکان نہیں ہے، ہمارا خاندانی گھر بڑے بھائی کے تصرف میں ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اگر میں نے بھی شادی کے بعد وہاں رہنا شروع کردیا تو مسائل پیدا ہوجائیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مجھے پہلے اپنے مکان کا بندوبست کرنا چاہیے جہاں میں شادی کے بعد اپنے والدین کے ساتھ منتقل ہوجاؤں۔ میری عمر ۲۸ سال ہوچکی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد شادی کرلوں لیکن مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر شادی میں تاخیر پر مجبور ہوں۔ از راہِ کرم مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟

جواب:

آپ کے والدین کا رویہ اور اصرار قابل فہم ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ۲۸ برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوجانی چاہیے اور اس میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم آپ نے جن وجوہات کی نشاندہی کی ہے ان کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے والدین آپ کے اس اندیشے کو زیادہ اہم نہ سمجھتے ہوں کہ اگر شادی کے بعد آپ نے بھی اپنے خاندانی گھر میں بڑے بھائی کے ساتھ رہنا شروع کردیا تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات کو آسان جانتے ہوں کہ اگر ایک گھر میں دونوں کے رہنے سے کسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے تو وہ انہیں آسانی سے حل کرلیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ حالات کا بغور جائزہ لیں اور اس کے مطابق فیصلہ کریں۔

میری رائے ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ انسان کو شادی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اسلام بھی اسی بات کی ہدایت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اوائل عمر میں شادی کرنا انسانی جذبات وضروریات کے بھی عین مطابق ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کی عمر ۲۸ برس ہو چکی ہے میرے خیال میں یہ وہ زیادہ سے زیادہ عمر ہے جس میں شادی ہو جانی چاہیے لیکن اگر حالات اس قسم کے ہوں کہ شادی مؤخر کرنا ضروری ہو تو ایسی صورتحال میں سوچے سمجھے بغیر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

اگر آپ شادی کے بعد اپنی شریک حیات کو سعودی عرب لانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ امکان بھی ہے کہ موجودہ ملازمت چند برس اور جاری رہے گی تو آپ کو معمولی تنخواہ کے باوجود شادی کر لینا چاہیے۔ اپنے بندوں کو رزق کی فراہمی کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اس کے برخلاف، اگر آپ شادی کے بعد بیوی کو وطن میں رکھنا چاہتے ہیں تو اس صورت میں آپ کو شادی مؤخر کر دینی چاہیے۔ اس دوران آپ کو کوشش کرنی چاہیے کہ آپ اپنے مکان کے حصول کے لیے ابتدائی کام شروع کر دیں اور اس کوشش میں والدین کو شامل رکھیں۔ تنخواہ کا معمولی ہونا شادی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ ممکن ہے کہ آپ شادی کے بعد فاضل وقت میں خود کو اضافی کام کے لیے آمادہ پائیں۔

ممکن ہے کہ آپ اپنے والدین کی خواہش کی تکمیل نہ کرنے کی وجہ سے پریشان ہوں لیکن اس قسم کے حالات میں اسلام یہ پابندی عائد نہیں کرتا کہ کوئی شخص لازماً وہی کرے جو اس کے والدین کہیں۔ آپ کا مقصد اپنے والدین کی حکم عدولی نہیں ہے بلکہ حالات کے پیش نظر موزوں وقت پر صحیح فیصلہ کرنا ہے۔ شادی میں تاخیر کر کے آپ اپنے والدین کی حکم عدولی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ (۱)

والدین کی رضا کے بغیر شادی:

سوال: کیا ایک شخص کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی شریک حیات کا انتخاب کرے خواہ والدین اس کی پسند کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں؟ اگر ایک شخص نے کسی لڑکی سے وعدہ کر لیا ہو کہ وہ اس سے شادی کرے گا تو کیا وہ اپنے والدین کا حکم ماننے کی صورت میں لڑکی کے ساتھ وعدہ خلافی اور فریب کا مرتکب ہوگا؟ ازراہِ کرم بتائیے کہ اس معاملے میں کون سی بات اہم ہے، وعدہ کی تکمیل یا والدین کی اطاعت؟

---

(۱) [اسلامی طرز فکر، از عادل صلاحی (ج ۱ ص ۲۵۵، ۲۵۶)]

جواب:

اس سوال میں فرائض کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کی اطاعت کرے بشرطیکہ والدین اس سے غیر معقول قسم کے مطالبات نہ کریں۔اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات بھی اہم ہے کہ ہر شخص کو اپنا وعدہ ایفا کرنا چاہیے۔اس کے ساتھ ہی ایک شخص پر اپنی ذات کا اور اپنے بچوں کا یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ شریکِ حیات کے طور پر ایک اچھی خاتون کا انتخاب کرے۔یہ تمام فرائض جو عام طور پر بغیر کسی دشواری کے ادا ہو جاتے ہیں، بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر بحرانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ جب اس قسم کی صورتحال پیدا ہو تو کس فرض کو دوسرے پر فوقیت دینا چاہیے؟

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شریکِ حیات کے طور پر بہتر خاتون کا انتخاب،سب سے زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔یہ انتخاب نہایت غور وفکر کے بعد متعدد باتوں کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیے۔اچھی شخصیت ، ذہانت، تعلیم اور ظاہری حسن وصورت وہ خصوصیات ہیں جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے قابل ترجیح ہو سکتی ہیں،لیکن چونکہ ہم میں سے کوئی بھی مکمل انسان نہیں ہے،اس لیے ممکن ہے کہ جسے ہم شریک حیات کے طور پر منتخب کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں،اس میں بعض خصوصیات موجود ہوں اور بعض نہ ہوں۔کن خصوصیات کو دوسری خصوصیات پر ترجیح دینا چاہیے؟اس سوال کا جواب ہر شخص کے نزدیک مختلف ہوگا۔بعض حضرات حسن وصورت کو اہم سمجھیں گے جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ کم اہم ترجیح ہوگی۔بعض کے نزدیک ہونے والی شریک حیات کو ذہین اور عقلمند ہونا چاہیے،جبکہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کم تعلیم یافتہ لڑکی کو پسند کریں گے۔

مختصر یہ کہ ہر شخص کی پسند کا اپنا معیار ہے جس کے مطابق وہ اپنی ہونے والی شریک حیات میں چند خصوصیات کو ترجیح دے گا۔اس ضمن میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔لڑکی اور لڑکے کی رضامندی کے بغیر شادی عمل میں آئی ہو تو اس صورت میں جلد ہی مختلف مسائل پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے اور عام طور پر اس قسم کی شادی کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاتی۔بالکل واضح طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لڑکی کا انتخاب کون کرتا ہے،اس بات کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں جب تک اس معاملے کے دونوں فریق ،یعنی لڑکے اور لڑکی کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔تاہم ان باتوں سے

صرف نظر کرتے ہوئے شریکِ حیات کے انتخاب کے معاملے میں اللہ کے رسول ﷺ کی ہدایت پیش نظر رکھنی چاہیے۔اس ہدایت میں جو دانائی پوشیدہ ہے،صدیوں سے لوگ اسے تسلیم کرتے آرہے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ شادی کے لیے ایک عورت کا انتخاب چار باتوں میں سے کسی ایک کے پیشِ نظر کیا جاسکتا ہے،مال ودولت،حسنِ صورت،حسب ونسب یا ایمان کی پختگی اور اگر تم پھلنا پھولنا چاہتے ہوتو اس عورت کا انتخاب کرو جس کا ایمان راسخ ہو۔اس حدیث مبارک کی روشنی میں،ہونے والی شریک حیات میں دیگر خصوصیات کے ساتھ سب سے زیادہ اہمیت اس خصوصیت کو دینی چاہیے جس کی ہدایت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا انتخاب درست ہوگا۔

یہی اصول ان والدین کے لیے بھی ہے جو اپنے بیٹے کے لیے لڑکی منتخب کرنے جارہے ہیں اور یہی ہدایت ان والدین کے لیے بھی ہے جو اپنی بیٹی کے لیے آئے ہوئے رشتوں پر غور کررہے ہوں۔ممکن ہے کہ ایک دولت مند شخص سے شادی کرکے ان کی بیٹی خوش نہ رہ سکے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کی ہدایت کی روشنی میں کی گئی شادی کے بعد وہ خوش وخرم اور مطمئن زندگی گزار سکے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"اگر ایک شخص جس کا ایمان راسخ ہے اور وہ دیانت دار ہے،رشتہ لے کر آتا ہے تو اسے قبول کرلو،اگر تم ایسا نہ کروگے تو معاشرے میں بے حیائی پھیلے گی۔"

میں یہ بات پھر دہراؤں گا کہ شادی کے معاملے میں حتمی انتخاب جو کوئی بھی کررہا ہو اسے اِن خصوصیات کو ترجیح دینی چاہیے۔جب لوگ ان ہدایات پر عمل کریں گے تو ان کا فیصلہ درست ہوگا۔

جب لڑکے کی پسند اور اس کے والدین کی پسند میں اختلاف ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس قسم کے معاملات میں والدین کا حکم کس حد تک قابلِ قبول ہے۔

جب ایک لڑکا بالغ ہوجاتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کی عزت کرے،ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور صلہ رحمی کا مظاہرہ کرے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹے کو اپنے والدین کے ساتھ محبت واحترام سے پیش آنا چاہیے،ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہر وہ کام کرنا چاہیے

جس کی ایک فرمانبردار بیٹے سے توقع کی جاتی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کم عمر بچے کی طرح والدین کا ہر حکم مانے۔ جہاں تک ممکن ہے وہ والدین کی خواہشات کا احترام کرے بشرطیکہ وہ معقول ہوں۔بعض اوقات والدین اپنی بالغ اولاد سے بھی بچوں کی طرح پیش آتے ہیں اوران سے ایسے مطالبے کرتے ہیں جنہیں معقول نہیں کہا جاسکتا۔جس بچے کی انہوں نے پرورش کی ہے، بڑا ہونے پر اسے بچے کے بجائے ایک ساتھی سمجھنا ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔اولاد خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے وہ اس سے ''مکمل اطاعت'' کی توقع کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ''بچوں کے لیے کیا اچھا ہے، یہ ہم بہتر جانتے ہیں''۔اس قسم کے والدین اولاد کے ذاتی معاملات میں ان کی رائے اور پسند کو اہمیت دینے کے بجائے اپنی رائے اور پسند ہی کو حتمی قرار دیتے ہیں۔

جب اس قسم کی صورتحال پیش آئے اور والدین کے مطالبات کسی حد تک غیر معقول ہوں تو انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ ان کی خواہش پر عمل نہ کرنے کا مطلب نافرمانی قطعی نہیں ہے۔صرف اتنی سی بات ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لیے بہتر سمجھ رہا ہے، اسے اختیار کر رہا ہے۔والدین کی پسند پر معقول وجوہات کے ساتھ اعتراضات کیے جاسکتے ہیں اور ایسا کرنے سے بیٹا نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوگا۔

اس کے ساتھ اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ جس لڑکی سے اس نے شادی کا وعدہ کیا ہے اسے کن خصوصیات کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔اگر اس لڑکی کا ایمان راسخ ہے اور اس کے اخلاق اچھے ہیں تو والدین محض بودے دلائل پر اس انتخاب کو آسانی سے رد نہیں کر سکتے۔اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے دانشمندی کی ضرورت ہے۔

کوئی بھی اس معاملے میں شرعی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ والدین کی اطاعت اور شادی کے لیے وعدے کی تکمیل میں سے کس کو دوسرے پر ترجیح دی جانی چاہیے۔مختلف پہلوؤں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے اور ان پر غور و فکر کیا جائے۔اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا انتخاب درست ہے اور آپ نے شادی کے لیے جس لڑکی سے وعدہ کیا ہے وہ آپ کے لیے بہترین بیوی ثابت ہوگی تو آپ کوشش کریں کہ آپ کے والدین اسے قبول کرلیں۔اگر والدین اس کے باوجود غیر معقول رویہ قائم رکھیں تو آپ اپنی پسند کے مطابق شادی کرنے پر نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔[1]

---

(۱) [ایضاً(ج۱ص۳۱۶تا۳۱۹)]

مغربی معاشرے میں پیدا ہونے اور تربیت پانے والی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ اور والدین:

سوال:

میں ان ہزاروں نوعمر مسلمان لڑکیوں میں سے ایک ہوں جن کی پیدائش انگلستان میں ان والدین کے یہاں ہوئی جو ایشیا کے مسلم ملکوں سے ہجرت کر کے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ہماری تعلیم برطانیہ کے اسکولوں میں ہوئی، جس کے نتیجہ میں متعدد غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں میرے ہم جماعت اور قریبی دوست بن گئے۔ ہم نے تھوڑی بہت اسلامی تعلیم حاصل کی ہے اور نماز، روزہ اور عربی میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا سیکھ لیا ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم شادی کی عمر کو پہنچتی ہیں۔ والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی ماں باپ کی پسند کے لڑکے سے شادی کرے۔ میں والدین کی طے کی ہوئی شادی کے خلاف نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے کہ شادی کے وقت دونوں فریقوں کا رضامند ہونا ضروری ہے۔ آپ کے سوال و جواب پڑھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسلام میں مسلمان مرد کو عیسائی عورت سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ یہ بات جانتے ہوئے کہ اسلام، مرد اور عورت کے ساتھ مساوی سلوک رکھتا ہے، میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا ایک مسلم عورت بھی عیسائی مرد سے شادی کر سکتی ہے؟

برطانیہ میں پرورش پانے والی نوعمر مسلم لڑکیوں کے بہت سے عیسائی دوست ایسے ہوتے ہیں جو اچھے شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک مسلم خاتون عیسائی مرد سے شادی کرتی ہے تو دونوں کے درمیان یہ واضح معاہدہ ہوگا کہ ان کے بچوں کو مکمل آزادی ہوگی کہ وہ جس مذہب کو چاہیں اختیار کریں۔ کیا اس قسم کی شادی صحیح ہوگی؟

یہاں میں یہ بھی واضح کرنا چاہوں گی کہ میری طرح بیشتر نوعمر مسلمان لڑکیوں کے لیے یہ بہت آسان ہے کہ وہ گھر چھوڑ دیں، ملازمت کریں اور مناسب وقت پر سول میرج کر لیں، لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتی کیونکہ اس سے میرے والدین، جن سے میں بہت محبت کرتی ہوں، پریشان ہوں گے۔ دوسری طرف صورت یہ ہے کہ میرے والد اکثر دھمکی دیتے ہیں کہ وہ مجھے اپنے وطن واپس بھیج دیں گے۔ یہ تصور ہی میرے لیے ناقابل برداشت ہے، کیونکہ وہاں جا کر میں بالکل اجنبی ہوں گی، وہاں مجھے ملازمت بھی آسانی سے نہیں ملے گی اور مجھے میری مرضی کے خلاف شادی پر مجبور کیا جائے گا! آپ کے مشورے کے لیے شکر گزار ہوں گی۔

جواب:

آپ نے ایک نہایت اہم مسئلہ کی نشاندہی کی ہے۔لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت کرتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے معاشی وجوہ کی بنا پر ہجرت کی اور روزگار کی تلاش میں برطانیہ چلے گئے۔ ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ وہ چند برس ملازمت کر کے کچھ سرمایہ جمع کرلیں گے اور پھر اپنے وطن واپس جا کر وہاں کوئی کاروبار شروع کرلیں گے۔لیکن وقت گزرتا گیا،ان لوگوں نے یا تو وہاں شادیاں کرلیں یا اپنے بیوی بچوں کو بھی بلالیا اور اس جگہ ان کے قدم جمتے چلے گئے اور جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ان کے بچے برطانیہ کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے تو انہوں نے کوشش کی کہ اپنے بچوں کو گھر پر مذہبی تعلیم دی جائے یا اگر علاقہ میں مسجد ہے تو وہاں بھیجا جائے۔

ان بچوں کو آج جن مسائل کا سامنا ہے،اس کے لیے ان کے والدین کو زیادہ ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان سے جو بھی ممکن تھا،انہوں نے اپنے بچوں کے لیے کیا۔یہ والدین خود جن حالات میں پرورش پا کر بڑے ہوئے تھے،انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش اس سے بہتر حالات میں کی،ان کا خیال تھا کہ غیر مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے جو تھوڑی بہت اسلامی تعلیم وہ اپنے بچوں کو فراہم کر رہے ہیں،وہ انہیں (بچوں کو) اچھا مسلمان بنانے کے لیے کافی ہوگی۔بیشتر بچے اپنے اسلامی تشخص سے خوش ہیں، خصوصاً وہ جنہیں اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا ہے۔تاہم اکثریت اپنی اسلامی شناخت کو اپنے مجموعی تشخص کا حصہ سمجھتی ہے۔اگر ان کے والدین کا تعلق پاکستان سے ہے تو وہ پاکستان نژاد برطانوی مسلمان ہیں۔انہوں نے اس تشخص کو اسی طرح قبول کرلیا ہے جس طرح اپنے رنگ اور قد وغیرہ کو۔

جب ان بچوں کے والدین کو احساس ہوتا ہے کہ ان کے بچے ایسے خیالات اپنا رہے ہیں جو ان کے لیے ناقابلِ قبول ہیں تو مسئلہ کو سمجھنا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لیے جو تعلیم وتربیت انہوں نے فراہم کی وہ کافی تھی۔ایسے والدین نے قرآن مجید کو عربی میں بغیر سمجھے پڑھا اور وہ اس سے مطمئن تھے۔وہ قرآن کو اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد بھی ایسا ہی کرے،لیکن برطانوی معاشرے میں تعلیم وتربیت پانے والے بچے اس کو صحیح طریقہ سے نہیں سمجھتے۔وہ سوالات کرتے ہیں اور ان کے جوابات چاہتے ہیں۔والدین اس بات کو نہیں سمجھ پاتے کہ ان کے بچے باغی کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ والدین اس تبدیلی کا ادراک نہیں کر پاتے

جوان کے بچوں میں وہاں کی تعلیم وتربیت اوراس معاشرے میں ہوش سنبھالنے کی وجہ سے ان کے اندازِ فکر اوران کے عمومی رویہ میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ والدین اپنے بچوں کے اس رویہ کو بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ اپنے طور پر سوچیں اوراپنی رائے قائم کریں۔ چنانچہ وہ مغربی معاشرے کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اوراپنے بچوں کو بھی موردِالزام گردانتے ہیں۔

ان بچوں کو اسلام کے بارے میں جونا کافی معلومات ہوتی ہیں، اس کے پیشِ نظر یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ وہ حلال وحرام کے بارے میں خود ہی رائے قائم کرلیتے ہیں اوراسلام کے غیرواضح تصور کے ساتھ خود ہی یہ طے کرلیتے ہیں کہ کس بات کی اجازت ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ بچے روزمرہ زندگی میں دوسرے مذاہب کے بچوں کے ساتھ گھلتے ملتے ہیں، اسکولوں میں ایک ہی جماعت میں، ایک ہی استاد سے پڑھتے ہیں اوردوسری سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کے لیے، اپنے والدین کی طرح ان لگے بندھے خیالات پرکاربند رہنا، جووہ اپنے وطن سے ساتھ لے کرآئے تھے، قطعی ممکن نہیں ہے۔

اس پس منظر کے ساتھ، کسی مسلمان لڑکے یالڑکی کا کسی غیرمسلم سے شادی کرنے کا تصور، والدین کے لیے جتنا ہولناک ہوتا ہے، اولاد کے لیے نہیں ہوتا۔ اولاد کو یہ بات بالکل فطری نظر آتی ہے۔ پھرایک مسلمان لڑکے کے لیے تو یہ اجازت ہے کہ وہ عیسائی لڑکی سے شادی کرلے، لیکن اس کے برخلاف صورتحال کا تصورنا قابلِ قبول ہوتا ہے۔ اگرکوئی مسلم لڑکی اپنے والد سے اس شادی کے امکان کے بارے میں بات کرے تو یہ بالکل فطری ہوگا کہ والد اسے وطن واپس بھیجنے پرغورشروع کردے کیونکہ وہاں رہ کروہ (لڑکی) کم سے کم ایسے فعل سے بچی رہے گی جونہ صرف اس کی اخلاقی اقدار کے خلاف ہوگا بلکہ اس (لڑکی) کو دائرہ اسلام سے خارج بھی کردے گا۔

آپ کو چاہیے کہ اپنے والدین کے نقطۂ نظر کو بہترطور پر سمجھنے کی کوشش کریں، کیونکہ ان کا رویہ جذبات پر یا فرسودہ تصورات پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کے والد یہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایک مسلم عورت، غیرمسلم مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ اب اگرآپ اس شادی کے امکان پراصرار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ایک غیرمسلم مرد سے ناجائز تعلق قائم کرنا چاہتی ہیں۔ آپ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اسلام نہایت اعلیٰ اخلاقیات کا مذہب ہے۔ یہ آپ کے والد کے اخلاقیات کا احساس ہی ہے کہ اس شادی کے امکان کو رد کئے

کے لیے وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے اور آپ کو وطن واپس بھیجنے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئے۔ میری رائے میں یہ مسئلہ دو نسلوں کے درمیان بہت زیادہ تفاوت (جنریشن گیپ) کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور ثقافتی تفاوت اور ابلاغ کے فقدان نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے ایک دوسرے کے موقف کو اچھی طرح سنا جائے اور سمجھا جائے۔

میں یہاں واضح کرنا چاہوں گا کہ گو کہ اسلام عورت اور مرد کے ساتھ یکساں سلوک پر زور دیتا ہے، لیکن بین المذاہب شادی کی اجازت، نہایت واضح اور سخت شرائط کے ساتھ دی گئی ہے۔ ایک مسلمان مرد ایک عیسائی یا یہودی خاتون سے شادی کر سکتا ہے، لیکن مسلمان عورت، غیر مسلم مرد سے شادی ہرگز نہیں کر سکتی۔

مسلم خاتون کو کسی غیر مذہب کے پیروکار سے شادی کی اجازت نہیں دی گئی، اس کے متعدد اسباب ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ شادی کے بعد مرد یا شوہر کا کردار سرپرست کا ہوتا ہے۔ وہ خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ کسی غیر مسلم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کا سرپرست یا نگران بنے۔

دوسری جانب جب ایک مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے مذہب اور عقائد کا احترام کرے اور اسلام قبول کرنے کے لیے اس پر کوئی دباؤ نہ ڈالے۔ اگر عورت اسلام قبول کرنا چاہے تو یہ اس کی اپنی پسند اور اختیار ہوگا۔ اسلام ہی یہ ضمانت دیتا ہے کہ مسلمان مرد سے شادی کرنے والی عیسائی یا یہودی عورت (کے مذہب) کی اصلاح کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اگر ایک مسلم خاتون ایک غیر مسلم مرد سے شادی کرتی ہے تو اسے اپنے عقیدے کی آزادی کی کیا ضمانت دی گئی ہے؟ آپ کہہ سکتی ہیں کہ آپ جس مرد سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں، وہ ہر قسم کی آزادی دینے کو تیار ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن اصول وقوانین فرد واحد کو پیش نظر رکھ کر نہیں ترتیب دیئے جاتے۔ ان کی بنیاد عمومی حالات ہوتے ہیں۔ اس قسم کی ضمانت دیگر مذاہب میں نہیں دی گئی۔ اس لیے اسلام نہیں چاہتا کہ مسلم خاتون کو ایسی صورتحال میں مبتلا کیا جائے جہاں اسے اپنے گھر میں اپنے مذہبی عقیدے کی آزادی نہ ہو۔ چنانچہ مسلم خاتون، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔

اس معاملے میں بچوں کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ ایک وسیع الذہن شوہر آپ سے اس بات پر اتفاق کر سکتا ہے کہ بچوں کو مکمل آزدی ہونی چاہیے کہ وہ جو بھی مذہب چاہیں اختیار کریں۔ اس

کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے، وہ ہر قسم کی مذہبی تعلیم وتربیت سے محروم رہیں گے۔ یہ بات بچوں کے ساتھ ظلم کے مترادف ہے، کیونکہ اس طرح انہیں اپنے اور کائنات کے پیدا کرنے والے کے بارے میں جاننے کی فطری خواہش کی تسکین کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ وہ یہ نہ جان پائیں گے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے کیا کیا نعمتیں فراہم کی ہیں، وہ کتنا رحمٰن ہے اور مشکل وقت میں مدد چاہنے کے لیے اس سے کیسے رجوع کیا جائے۔

علاوہ ازیں بین المذاہب شادی میں اصول یہ ہے کہ بچے، ماں اور باپ کے مذاہب میں سے اس مذہب کی پیروی کریں گے جو دوسرے کے مقابلے میں اعلیٰ ہو۔ مذاہب کی درجہ بندی میں اسلام سب سے اعلیٰ مذہب ہے۔ اس کے بعد عیسائیت ہے اور پھر یہودیت اور اس کے بعد دیگر مذاہب۔ فرض کریں کہ ایک عیسائی ایک بدھ مت کے ماننے والے سے شادی کرتا ہے اور یہ لوگ مسلم معاشرے میں رہتے ہیں۔ اگر ان کے درمیان کوئی اختلاف ہوگا اور مسئلہ قاضی کی عدالت میں جائے گا تو قاضی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ان کے بچے بڑے ہو کر عیسائی ہوں گے۔ اس اصول کی روشنی میں جب، ایک مسلمان، عیسائی یا یہودی سے شادی کرتا ہے تو اس کے بچے مسلمان سمجھے جائیں گے۔

میرے خیال میں آپ کے مسئلہ کے حل کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں۔ ہمارا مذہب محض چند رسومات اور عبادات کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ زندگی کا بھرپور نظام ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ انسان نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکوۃ ادا کرے، قرآن مجید کی تلاوت کرے اور حج ادا کرے، یہ عبادات بھی اہم ہیں، لیکن ان کا تعلق زندگی کے ایک چھوٹے سے حصے سے ہے۔ جب کہ اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر سرگرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسے شعوری طور پر اختیار کریں، صرف اس لیے مسلمان نہ ہوں کہ وہ ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہو گئے ہیں۔

جب آپ اسلام سے بہتر طور پر واقف ہو جائیں گی تب آپ اسلامی عقائد، اصولوں اور تعلیمات کو بہتر طور پر اپنے دوست کے سامنے واضح کر سکیں گی۔ اگر وہ یہ بات سمجھ لیں اور تسلیم کر لیں کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے اور وہ مسلمان ہونا چاہیں تب یہ بالکل درست ہوگا کہ وہ ایک مسلمان عورت سے شادی کر سکیں۔

آپ کے والد کا یہ انتباہ کہ اگر آپ نے اس قسم کا کوئی قدم اٹھایا تو وہ آپ کو وطن واپس بھیج دیں گے، نہ تو غیر معقول ہے اور نہ متشددانہ۔ آپ اس مسئلہ کو اپنے والد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ اگر ایک بیٹی سول میرج کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے تو باپ کے نزدیک اس کی بیٹی کا اس کے ''شوہر'' سے ناجائز تعلق ہوگا اور ایک مسلمان کے نزدیک یہ قطعی ناقابلِ قبول ہے۔ باپ کے لیے یہ بالکل فطری امر ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس ظلم سے بچانے کی تدبیر کرے۔ انہیں علم ہے کہ برطانیہ میں رہتے ہوئے ان کے وسائل محدود ہیں، لہٰذا وہ بیٹی کو کسی محفوظ جگہ بھیجنے کے امکان پر غور کریں گے اور یہ محفوظ مقام ان کا اپنا وطن ہوسکتا ہے جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد رہتے ہیں۔ اگر یہ صورتحال آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو پھر آپ اپنے والد کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کے سامنے دو راستے ہیں یا تو آپ اسلام کا اتباع کریں یا اس سے باغی ہوجائیں۔ آپ کے والد کے سامنے بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یا تو آپ اسلام کا حکم مانیں اور دوسری یہ کہ وہ آپ کو خود آپ سے محفوظ رکھنے کی تدبیر کریں۔ میرے خیال میں یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے والد کے ساتھ افہام و تفہیم سے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ (۱)

والد کے حقوق:

سوال: ہمارے والدین کے درمیان خاصہ عرصہ قبل علیحدگی ہوچکی ہے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو ہمارے والد، والدہ کو ہر ماہ ہماری پرورش کے لیے کچھ رقم دیتے رہے تاہم یہ رقم ہماری ضروریات پوری کرنے کے لیے کبھی بھی کافی نہ تھی۔ ہماری والدہ ایک ٹیچر ہیں۔ انہوں نے اپنی تنخواہ کی مدد سے گھر کے اخراجات چلانے کی کوشش کی۔ ہم پانچ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے انہیں بڑی جدوجہد اور بہت سخت محنت کرنا پڑی۔ جب ہمارے والد نے دوسری شادی کرلی اور ان کے بچے پیدا ہوگئے تو انہوں نے ہماری والدہ کو ہر ماہ ادائیگی کرنا بند کردی۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب والد کے حوالے سے ہمارے کیا فرائض ہیں؟ کیا یہ لازمی ہے کہ جب ہماری شادیاں ہوں تو ہم اپنے والد کی رضامندی حاصل کریں؟

جواب:

یہ بات بلاشبہ قابلِ فہم ہے کہ آپ اپنی والدہ سے گہری وابستگی رکھتی ہیں جنہوں نے آپ کی سرپرستی کی ذمہ داری لی اور تمام پریشانیوں کے باوجود انہیں جدوجہد کرنا پڑی۔ تاہم مجھے نہیں محسوس ہوتا کہ آپ کے

(۱) [ایضاً (ج۱ ص۳۹۸ تا ۴۰۳)]

والد نے اپنی ذمہ داریوں سے انکار کیا ہے۔ وہ آپ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلسل ادائیگی کرتے رہے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے ادا کیا، ممکن ہے کہ وہ کافی نہ تھا لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ مزید تفصیلات جانے بغیر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہیں آپ کے لیے اس سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔

جو بات اہم ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کے بھائی بہنوں کو والد کے بارے میں تلخ نہیں ہونا چاہیے۔ بلاشبہ آپ کے والد اب بھی آپ کے والد ہونے کی حیثیت سے ادب واحترام کے حق دار ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے والد سے اچھے تعلقات قائم رکھیں جن کی بنیاد آپ کی جانب سے والد کے احترام اور آپ کے والد کی جانب سے مہربانی اور نگہداشت پر ہو۔ اگر آپ کی والدہ اور والد کے درمیان ابھی تک ناچاقی ہے تو آپ اور آپ کے بھائی بہنوں کو چاہیے کہ وہ تعلقات کی تلخی کو ختم کرنے یا کم کرنے کی کوشش کریں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب آپ اپنے والد سے اتنا ہی اچھا سلوک کریں جتنا کہ ایک والد کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

اگر آپ کی نسبت طے ہونے والی ہے تو آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے والد کو اس فیصلے میں شریک کریں کہ نکاح کا پیغام قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ آپ یوں کریں کہ جس فرد کا پیغام آیا ہو اس کے بارے میں تحقیقات کی ذمہ داری آپ اپنے والد کو سونپ دیں۔ پھر آپ کے والد آپ اور آپ کی والدہ سے تبادلہ خیال کر سکتے ہیں کہ مذکورہ فرد آپ کے لیے اچھا شوہر ثابت ہو سکے گا یا نہیں۔

جب آپ کی شادی ہونے لگے تو آپ کے والد کو آپ کے سرپرست کے طور پر سامنے آنا چاہیے۔ انہیں ان کے اس حق سے کوئی بات محروم نہیں کر سکتی، یہ بات اہم ہے کہ جن گھرانوں میں مذہب پسند اور خدا ترس بچے ہوتے ہیں، وہاں والدین کے درمیان علیحدگی کو ایک ایسا واقعہ سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ سے دائمی نفرت اور تلخیوں کو پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ (۱)

والدین کی رضامندی کے بغیر ہونے والی شادی کا حکم:

سوال:

ایک صاحب اپنے گھر سے دور ملازمت کرتے ہیں، انہیں اپنی بیوی کی طرف سے ایک خط کے ذریعے

(۱) [ایضاً (ج۲ ص ۲۴۵، ۲۴۶)]

اطلاع ملتی ہے کہ ان کی ۱۷ سالہ بیٹی نے ایک شخص سے شادی کرلی ہے جس نے اسے یقین دلایا ہے کہ اس طرح کوئی ان کی شادی میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اس موقع پر اس شخص کا صرف ایک دوست اور بہت سی خواتین موجود تھیں۔ لڑکی کی طرف سے کوئی رشتہ دار شریک نہیں ہوا، وہ اکیلی شریک ہوئی۔ براہِ کرم یہ بتائیے کہ یہ شادی درست ہوئی یا نہیں؟ یاد رہے کہ شادی کے بعد ان دونوں نے ابھی تک کوئی تعلقات قائم نہیں کیے۔

جواب:

سوال میں جس لڑکی کا ذکر ہے، اس نے اپنے والد یا سرپرست کی شرکت کے بغیر شادی کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اسلام میں شادی ایک بہت سنجیدہ معاملہ ہے کیونکہ اس سے عورت اور مرد میں ایک جائز رشتہ قرار پاتا ہے، جس سے ایک خاندان وجود میں آتا ہے جو بچوں کی تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسلام میں عورت کی حیثیت اور عزت کو تسلیم کرنے کے لیے نکاح کے وقت لڑکی کے والد یا ان کی غیر موجودگی میں لڑکی کے سرپرست کا ہونا ضروری ہے۔

اکثر فقہاء جن میں شافعی، حنبلی اور مالکی شامل ہیں، نکاح کے درست ہونے کے لیے نکاح کے موقع پر لڑکی کے والد یا سرپرست کی موجودگی لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت خود اپنے نکاح کا معاہدہ نہیں کرسکتی۔ صرف حنفی فقہ کے مطابق عورت اپنے نکاح کا معاہدہ خود کرسکتی ہے۔ میں اس موقع پر مختلف فقہوں کے درمیان اختلافات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں آراء معقول دلائل کی بنا پر قائم کی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ غلط ہے۔

آپ نے بتایا کہ شادی کے بعد اس خاتون اور مرد نے کوئی تعلقات قائم نہیں کیے، جبکہ وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے خاندان کی طرف سے اس شادی کی مخالفت ہوگی۔

اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو اس جلد بازی سے کوئی خرابی بھی واقع نہیں ہوئی، ہمیں فقہاء کی اکثریت کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس شادی کو کالعدم قرار دینا چاہیے۔ ایسا کرتے وقت ہمیں ٹھوس دلیل کو بنیاد بنانا چاہیے جیسا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

''کوئی نکاح نہیں کیا جاسکتا سرپرست اور دو گواہوں کے بغیر۔''

بہرصورت اس شخص اور اس خاتون کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی اس شادی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

لڑکی کے والد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے ہیں اور وہاں سے اس شادی کو فسخ کروا سکتے ہیں۔ اگر مرد شادی کے درست ہونے پر اصرار کرے یا وہ کسی ایسے ملک میں رہتا ہے جہاں حنفی فقہ کے مطابق قانون نافذ ہے تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

اس وقت لڑکی کے والد کو اچھا مشورہ دیا جانا چاہیے کہ وہ اس معاملہ کا معروضی انداز سے جائزہ لیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص عمدہ صفات کا مالک ہو اور اچھا شوہر ثابت ہو اور وہ صرف اس خاص معاملہ میں غلط رہنمائی کا شکار ہو گیا ہو، بحیثیتِ مجموعی وہ اچھا انسان ہو اور وہ لڑکی کے خاندان سے بہتر طریقے پر تعلقات استوار کرلے۔ اگر ایسا ہے تو لڑکی کے والد شادی کی منظوری دے سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ نئے سرے سے اس شادی کے عمل کو دہرائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی کا انتظام اور رسمِ نکاح کا اہتمام دوبارہ ہونا چاہیے، جس میں لڑکی کے والد لڑکی کی طرف سے معاہدۂ نکاح میں شریک ہوں۔

دوسری طرف اگر لڑکی اور اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ ازدواجی تعلقات قائم کر چکے ہیں تو پھر ان میں حنفی فقہ کے مطابق فیصلہ کردینا چاہیے۔

عملی اقدام کا انحصار مقامی صورت حال اور ماحول پر ہوتا ہے۔ بہرحال یہ شادی خفیہ طریقہ پر ہوئی اور ضروری ہے کہ اس کا اعلان کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ والد چاہتے ہوں کہ شادی مقررہ طریقہ پر ہو اور وہ لڑکی کی شادی کا انتظام کریں۔ اس میں لڑکی، اس کے خاندان اور پورے معاشرے کے مفادات سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

میرے قاری کے خط میں اس لڑکی اور اس شخص کو سزا دینے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ کوئی اسلامی عدالت ہی ان امور پر صحیح فیصلہ کرسکتی ہے۔ اگر اس شخص کے خلاف کوئی شکایت درج کی جائے تو عدالت تمام پہلوؤں پر غور کر کے سزا کا تعین کرسکتی ہے۔ اگر اس شخص نے اس لڑکی اور اس کے خاندان کو دھوکا دیا ہے تو سزا سخت بھی ہوسکتی ہے، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس شخص نے نیک نیتی سے کام کیا اور اس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں تھا، تو یہ سزا ہلکی بھی ہوسکتی ہے۔ [1]

(۱) [ایضاً (ج۲ ص ۳۵۰، ۳۵۱)]

خاندان کی رضامندی کے بغیر شادی کرسکتی ہوں؟

سوال:

مجھ سے ایک لڑکے کی ملاقات ہوئی جو مجھ سے ۴ سال بڑا تھا جب کہ اس کی عمر صرف ۲۲ سال تھی۔ ہم وقتاً فوقتاً ملتے رہے لیکن میں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی، کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرے والدین کبھی بھی اس سے شادی کی منظوری نہیں دیں گے۔ پھر بھی وہ اصرار کرتا ہے کہ ہم شادی کرلیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے لیے انگوٹھی خریدنے کی غرض سے اس نے اپنا خون فروخت کیا ہے۔ اس سلسلے میں، میں آپ کی رائے لینا چاہتی ہوں؟

جواب:

کیا اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والی آپ جیسی لڑکی ایک اجنبی سے چھپ کر اس لیے ملتی ہے کہ کسی دن اس کی بیوی بن جائے گی؟ مجھے ڈر ہے کہ وہ شخص اتنا سنجیدہ نہیں جتنا کہ آپ اس سے اپنے تعلق کے بارے میں سنجیدہ ہیں، ورنہ وہ آپ کے والد سے آکر ملتا اور آپ سے شادی کی درخواست کرتا۔

آپ نے وجہ بتائے بغیر کہا ہے کہ آپ کے والدین کبھی بھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔ کیا اس کی سماجی حیثیت کی وجہ سے یا اس کی کسی ذاتی خامی کی وجہ سے؟ جو بھی صورت ہو، آپ کو جاننا چاہیے کہ شادی ایک خاندانی معاملہ ہے اور آپ کے والد کی رضامندی سے اس کو عمل میں آنا چاہیے۔ آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عورت کی عزت اور وقار کے لیے اسلام اس قسم کی ضرورت پر بہت زور دیتا ہے۔ کیونکہ عورت کے لیے یہ زیادہ قابلِ عزت بات ہے کہ اس کی شادی اس کے خاندان والے طے کریں۔ اس طرح وہ خاندان کے مجموعی تجربہ سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ تنہا اس معاملے میں کود پڑے جو اس کی زندگی میں بے حد اہم تبدیلی کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کا خط پڑھا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ لڑکپن کی محبت کی روایتی کہانی ہے۔ بدقسمتی سے آپ کی عمر کی اکثر لڑکیاں محبت کے اظہار کو سنتی ہیں اور نوجوان ہمیشہ اظہارِ محبت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ محبت کے میٹھے بول اکثر اِن لڑکیوں کو حقیقت سے بے خبر کردیتے ہیں اور انہیں بہت جلد، ایک غلط آدمی پر بھروسا کرلینے پر پچھتاوا ہوتا ہے۔

آپ کہتی ہیں کہ آپ نے چھپ کر تنہائی میں جو ملاقاتیں کیں، ان میں آپ کسی خطرناک مرحلے تک نہیں پہنچیں مگر آپ جس راستے پر جارہی ہیں وہ لازمی طور پر آپ کو کسی خطرناک موڑ پر پہنچائے گا۔ میں آپ کو بتلاؤں کہ وہ شخص آپ کے اعتماد سے فائدہ اٹھارہا ہے ورنہ وہ آپ کو کیوں بتلاتا کہ آپ کو تحفہ دینے کے لیے اس نے بلڈ بینک کو خون بیچا ہے۔ آپ نے بتایا کہ یہ بات میں نے اس سے زبردستی اگلوائی ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہوجائے خواہ یہ صحیح ہو یا غلط، تاکہ آپ اس کی محبت پر یقین کرلیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مکمل جھوٹ ہے جب کہ اس نے آپ کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی ہے۔

آپ کو چاہیے کہ آپ اس شخص سے اکیلے میں ملنا ترک کردیں، چاہے وہ آپ پر کتنا بھی زور ڈالے آپ کو اس پر واضح کردینا چاہیے کہ آپ سے رشتہ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ آپ کے خاندان سے رابطہ کرے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ آپ کے گھر والوں کے پاس آکر سنجیدگی سے شادی کا رشتہ مانگے۔ اگر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں تو آپ کو چاہیے کہ فوری طور پر اس شخص سے تعلقات توڑ لیں۔ یہی واحد باعزت طریقہ ہے جس کو اپنا کر آپ اپنے آپ کو کسی پریشانی میں مبتلا ہونے سے بچا سکیں گی اور خدا خوفی کی راہ پر چل سکیں گی۔ [1]

لڑکی کو اس کے غیر پسندیدہ شخص سے شادی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا:

سوال:

کیا باپ اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور کرسکتا ہے جسے وہ ناپسند کرتی ہو؟

جواب:

باپ ہو یا کوئی اور شخص اپنے زیر کفالت بچی کو اس کے غیر پسندیدہ شخص سے شادی کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، بلکہ اس بارے میں لڑکی سے اجازت لینا ضروری ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَلَا تُنكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ، وَلَا تُنكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ، قَالُوا: يَارَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَيْفَ اِذْنُهَا؟ قَالَ: اَنْ تَسْكُتَ ـ وَفِي لَفْظٍ اٰخَرَ ـ قَالَ: اِذْنُهَا صُمَاتُهَا ـ وَفِي اللَّفْظِ الثَّالِثِ ـ وَالْبِكْرُ يَسْتَاْذِنُهَا اَبُوهَا وَاِذْنُهَا سُكُوتُهَا)) [رواه مسلم فی کتاب النکاح باب ۹ ـ والدارمی فی کتاب النکاح باب ۱۳ ـ واحمد (جلد ۲ ص ۲۳۴)]

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۳۵۴، ۳۵۵)]

''جب تک بیوہ عورت سے مشورہ نہ کر لیا جائے اس کا نکاح نہ کیا جائے اور جب تک کنواری لڑکی سے اجازت نہ لی جائے اس کا نکاح نہ کیا جائے۔ اس پر لوگوں نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس کے اذن کی کیا صورت ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی خاموشی۔''

دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ: ''اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔''

تیسری روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''کنواری لڑکی سے اس کا باپ اجازت لے اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے۔''

اگر لڑکی کی عمر نو برس یا اس سے زیادہ ہو تو باپ کے لیے اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے دوسرے سرپرست بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتے۔ سب لوگوں پر ایسا کرنا واجب ہے اور اگر کسی نے اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کر دیا تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوگا کیونکہ نکاح کے لیے میاں بیوی دونوں کی رضامندی شرط ہے۔

اگر انہوں نے اس کی مرضی کے بغیر، زبردستی مار پیٹ کر یا سنگین نتائج کی دھمکی دے کر اس کا نکاح کر دیا تو بھی ایسا نکاح صحیح نہ ہوگا۔ ہاں اگر لڑکی کی عمر نو سال سے کم ہو اور اس کا باپ اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح کر دے تو صحیح مذہب کی رو سے اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی اجازت کے بغیر شادی کی، جبکہ اس وقت ان کی عمر نو سال سے کم تھی۔

اور اگر لڑکی کی عمر نو سال یا اس سے زائد ہو تو باپ سمیت کوئی بھی شخص اس کی مرضی کے بغیر اس کا نکاح نہیں کر سکتا۔ شادی کا پیغام دینے والے شخص کو اگر لڑکی کی ناپسندیدگی کا علم ہو جائے تو اسے ایسے اقدام سے باز رہنا چاہیے۔ اگرچہ لڑکی کا باپ بھی اس معاملے میں لچک رکھتا ہو۔ باپ پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور بیٹی کی مرضی کے برعکس کوئی قدم نہ اٹھائے۔ اگر باپ کو یہ دعویٰ ہو کہ اس نے لڑکی پر زبردستی نہیں کی تو پھر بھی شرعی محرمات کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے لڑکی سے اجازت لینے کا حکم دیا ہے۔

ہم لڑکی کو بھی نصیحت کریں گے کہ وہ بھی اللہ سے ڈرے۔ اس کا باپ اگر اس کی شادی کرنا چاہتا ہو اور منگنی کا پیغام دینے والا شخص دینی اور اخلاقی طور پر پسندیدہ اوصاف کا حامل ہو تو اسے چاہیے کہ اس پر موافقت کا اظہار کر دے۔ اگر باپ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی اس کی شادی کرنا چاہے تو بھی اسے

ایسا کرنا چاہیے کیونکہ نکاح میں بڑی برکتیں اور مصلحتیں پنہاں ہوتی ہیں، جبکہ مجرد زندگی بسر کرنے میں بے شمار خطرات پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ہم تمام نوجوان لڑکیوں کو نصیحت کریں گے کہ وہ مناسب رشتے آنے پر اپنی موافقت کا اظہار کر دیں اور درس و تدریس وغیرہ کو بہانہ نہ بنائیں۔ واللہ ولی التوفیق۔ (۱)

اگر ماں بلاوجہ شادی میں رکاوٹ ڈالے تو......؟

سوال:

میں اپنی ایک مشکل کا حل چاہتی ہوں، بات یہ ہے کہ میری عمر اس وقت چوبیس سال ہے، میرے لیے ایک ایسے نوجوان نے منگنی کا پیغام دیا جو یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم مکمل کر چکا ہے اور ایک دیندار خاندان سے تعلق رکھتا ہے، اس پر میرے والد نے موافقت کا اظہار کر دیا اور نوجوان کو دیکھنے کے لیے مجھے بیٹھک میں آنے کو کہا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دینِ حنیف نے شادی سے قبل ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ جب میری والدہ کو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان ایک دینی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور قسم کھائی کہ کسی بھی صورت یہ نکاح نہیں ہوسکتا، میرے باپ نے بڑی کوشش کی مگر ناکامی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آسکا۔ کیا ان حالات میں مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں شریعت سے اپنے مسئلے میں مداخلت کا مطالبہ کروں؟

جواب:

بصورتِ صحتِ سوال تمہاری والدہ کو اس بارے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اس پر ایسا کرنا حرام ہے اور اس معاملے میں تمہاری ماں کی اطاعت تم پر واجب نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ)) [متفق علیه]

''اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔''

اور نیک رشتے کے پیغام کو رد کرنا نیکی نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

((اِذَا خَطَبَ اِلَيْكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَزَوِّجُوْهُ، اِلَّا تَفْعَلُوْا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ

(۱) [فتاوی برائے خواتین (ص ۱۷۰ تا ۱۷۴) فتویٰ از شیخ ابن بازؒ]

كَبِيرٌ))[سنن ترمذی بسند حسن]

''جب کوئی ایسا شخص تمہیں نکاح کا پیغام دے کہ جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اسے رشتہ دے دو اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور فساد کبیر برپا ہوگا۔''

اگر یہ معاملہ عدالت کے سامنے اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو بھی آپ پر کوئی حرج نہیں ہے۔ [1]

بہن کی شادی اور گھر میں اختلاف رائے......جھگڑا کیسے ختم کیا جائے؟

سوال:

ہمارے ہاں ایک نوجوان میری بہن کا رشتہ طلب کرنے آیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتا، اس پر ہمارے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا کہ اسے رشتہ دیا جائے یا انکار کر دیا جائے۔ میرے بھائی کا کہنا تھا کہ ہم اسے رشتہ دے دیں، شائد اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نصیب فرما دے، لیکن والد صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میں اس بارے میں شرعی حکم چاہتی ہوں۔

جواب:

جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ وہ نماز باجماعت نہیں پڑھتا تو ضروری ہے کہ اسے رشتہ نہ دیا جائے اس لیے کہ جماعت کا ترک کر دینا کھلی معصیت ہے۔ یہ منافقوں کی علامت ہے اور کلیتاً ترکِ نماز کا پیش خیمہ ہے جو کہ کفر اکبر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خٰدِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾

[النسآء:١٤٢]

''بے شک منافقین اللہ تعالیٰ سے چالبازیاں کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی چالبازیاں ان پر پلٹ رہا ہے اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں۔''

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((أَثْقَلُ الصَّلٰوةِ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ صَلَاةُ الْعِشَاءِ وَصَلَاةُ الْفَجْرِ، وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَافِيْهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا))[متفق علیہ]

---

(١) [ایضاً]

''عشاء اور صبح کی نمازیں منافقوں پر انتہائی بھاری ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ ان میں کتنا فائدہ ہے تو وہ ضرور آئیں، چاہے انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((لَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنْهَا۔يَعْنِى الصَّلَاةَ فِى الْجَمَاعَةِ۔اِلَّا مُنَافِقٌ مَعْلُوْمُ النِّفَاقِ)) [مسلم]

''ہم دیکھتے تھے کہ (عہد نبویؐ میں) نماز باجماعت سے صرف خالص منافق ہی پیچھے رہتے تھے۔''

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اَلْعَهْدُ الَّذِىْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ)) [ترمذی (ح٢٦٢٣)ابن ماجه (ح١٠٧٩)مسند احمد (ج٥ص٣٤٦)مستدرك حاكم(ج١/ص٧)السنن الكبرى للبيهقى (٣٦٦/٣) مصنف ابن ابى شيبة(٣٤/١١)صحيح ابن حبان(ح١٤٥٤)]

''ہمارے اور کفار و مشرکین کے مابین صرف نماز ہی حد فاصل ہے، جس نے نماز کو چھوڑ دیا اس نے یقیناً کفر کیا۔''

آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد یوں ہے:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))[صحيح مسلم]

''مسلمان اور کفر و شرک کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔''

ہم اللہ کے حضور سب کی ہدایت اور توفیق کے لیے دعا گو ہیں۔ (١)



(١) [ایضاً]

باب ۹:

والدین کے اصرار پر بیوی کو طلاق دینا؟☆

یہ بات تو واضح ہے کہ معقول عذر کے بغیر خاوند کا بیوی کو طلاق دینا یا بیوی کا خاوند سے بلا وجہ طلاق طلب کرنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے بلکہ بعض روایات میں اس فعل پر جنت سے محرومی کی وعید بھی مذکور ہے اور اسی وجہ سے اہل علم نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔[1] لیکن اگر والدین اپنی اولاد خواہ بیٹا ہو یا بیٹی، کو طلاق پر مجبور کریں تو اس سلسلے میں کیا کیا جائے؟ آیا والدین کی اطاعت جس کی بڑی تاکید ہے، کے پیشِ نظر ان کا مطالبہ پورا کیا جائے یا طلاق کی کراہت کے پیشِ نظر ان کا مطالبہ رد کر دیا جائے؟

اس مسئلے میں بلکہ اس نوعیت کے ہر مسئلے میں یہ دیکھا جائے گا کہ والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری میں کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تو لازم نہیں آ رہی؟ اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آ رہی ہو تو پھر والدین کی بات نہیں مانی جائے گی کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ))[2]

''جس کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو اس میں مخلوق کی بات نہیں مانی جائے گی۔''

یہ گویا ایک ضابطہ ہے اور اس کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے مثلاً آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ))[3]

''اطاعت صرف معروف (یعنی نیکی کے) کاموں میں ہوگی۔''

علاوہ ازیں قرآن مجید کی اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

☆......[اس مسئلہ میں جو رائے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، بہت سے جید علماء کی بھی اس مسئلہ میں وہی رائے ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے فتاویٰ کے حوالے سے مزید تفصیلات کے خواہش مند ہماری کتاب: ''جدید فقهی مسائل'' کا مطالعہ فرمائیں۔(مؤلف)]

(۱) [دیکھیے: "الزواجر" لابن حجر هیثمیؒ: (ج ۲ ص ۱۰۰)]

(۲) [مسند احمد (ج۵ ص۶٦)]

(۳) [صحیح بخاری: کتاب الاحکام: باب السمع و الطاعة للامام ---(ح ۷۱٤٥) صحیح مسلم (ح ۱۸٤۰)]

﴿ وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَالَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا ﴾ [لقمان: ۱۵]

''اگر وہ دونوں (یعنی والدین) تم پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ (کسی کو) شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہ ہو تو ان کا کہنا نہ مانو، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے رہو۔''

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ اگر والدین کفر وشرک کا حکم دیں تو ان کا حکم ایسی صورت میں بالخصوص نہیں مانا جائے گا اور اسی آیت پر قیاس کرتے ہوئے ان کا حکم اس وقت بھی نہیں مانا جائے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نافرمانی کا حکم دیں۔

طلاق کے مسئلے میں چونکہ شرعی ضابطہ یہ ہے کہ کسی معقول عذر کے بغیر طلاق دینا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے اور یہ کام باعث گناہ ہے، البتہ معقول عذر کی بنا پر طلاق دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لیے دیکھا یہ جائے گا کہ والدین کا مطالبہ کسی معقول عذر پر مبنی ہے یا محض ضد اور عناد پر۔ اگر تو ان کا مطالبہ واقعی معقول عذر پر مبنی ہے تو پھر بلا تأمل ان کی اطاعت کرتے ہوئے ان کا مطالبہ پورا کیا جائے لیکن اگر اس کے برعکس ان کا مطالبہ کسی معقول عذر پر مبنی نہ ہو تو پھر اسے پورا کرنا ضروری نہیں اور ایسے کئی واقعات سامنے آتے رہتے ہیں کہ بسا اوقات والدین محض نفس پرستی کی خاطر باعمل و نیک سیرت بہو کو طلاق دلوانے پر اصرار☆ کرتے ہیں جب کہ اس کے برعکس بعض اوقات والدین کا مطالبہ مبنی بر خلوص بھی ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ وہ چند روایات جن میں والدین کے حکم پر طلاق دے دینے کا ذکر ہے وہ مذکورہ بیان کردہ ضابطے کے حق میں ہیں، اس کے خلاف ہرگز نہیں مثلاً:

۱)......صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ملنے کے لیے مکہ گئے، مگر وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بیوی سے پوچھا کہ تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ تو اس نے (بجائے اس کے کہ صبر وشکر کا اظہار کرتی) کہا کہ

((نَحْنُ بِشَرٍّ، نَحْنُ فِیْ ضِیْقٍ وَشِدَّةٍ، فَشَكَتْ اِلَیْهِ))

''ہمارا تو بہت برا حال ہے، ہم تو بڑی تنگ دستی اور مصیبت میں مبتلا ہیں۔''

گویا خوب شکوہ وشکایت کی، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

☆ [اس طرح کے بعض واقعات کے لیے دیکھیے ہماری کتاب هدیة العروس طبع جدید بذیل ''ساس بہو کے جھگڑے......'']

''اچھا جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل لو۔''

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر آئے تو ان کی بیوی نے انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بتایا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام فرمانے لگے کہ وہ میرے والد تھے اور مجھے یہ وصیت کر گئے ہیں کہ میں تمہیں طلاق دے دوں چنانچہ انہوں نے اس عورت کو طلاق دے دی۔ (۱)

روایت کے سیاق وسباق ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طلاق کی وصیت کیوں کی؟ اس لیے کہ آپ مہمان کی حیثیت سے ان کے ہاں گئے اور اس عورت نے خاطر تواضع کرنے کی بجائے اپنا دکھڑا سنانا شروع کر دیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پسند نہ آیا کہ ایک نبی کی بیوی اور ایک نبی کی بہو ہو کر بجائے صبر وشکر کے جزع وفزع اور شکوہ وشکایت کی روش اختیار کرے اور انہوں نے ایسی بدسلیقہ عورت کو اپنے گھرانے کے لائق نہ سمجھتے ہوئے بیٹے سے طلاق کا عندیا ظاہر کیا جو بیٹے نے فوراً پورا کر دیا۔ پھر اس کی مزید تائید اسی حدیث کے اگلے الفاظ سے بھی بخوبی ہوتی ہے جس میں ہے کہ ایک عرصہ کے بعد پھر حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ملنے گئے، اب کی بار بھی وہ گھر پہ نہ ملے۔ البتہ ان کی نئی بیوی سے ملاقات ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ گزر بسر کیسی ہو رہی ہے؟ اس پر اس عورت نے کہا کہ

((نَحْنُ بِخَيْرٍ وَسِعَةٍ وَأَثْنَتْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))

''ہم خیر وعافیت کے ساتھ ہیں، بہت خوشحال ہیں اور اس پر اللہ کی حمد اور شکر ادا کیا۔''

صحیح بخاری ہی کی اگلی روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس عورت نے کہا:

((أَلَا تَنْزِلُ فَتَطْعَمَ وَتَشْرَبَ؟))

''آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں خیر وبرکت کی دعا دیتے ہوئے فرمایا کہ

''جب تمہارا شوہر واپس آئے تو اسے میری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ قائم رکھ۔''

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو ان کی اس بیوی نے کہا کہ ''ہمارے ہاں ایک اچھے بزرگ

(۱) [صحيح بخاري: كتاب احاديث الانبياء: باب ۹۔ حديث (۳۳٦٤)]

آئے تھے اور اس نے ابراہیم علیہ السلام کی خوب تعریف کی۔ پھر اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ وہ آپ کے لیے یہ وصیت کر گئے ہیں کہ آپ اپنے دروازے کی چوکھٹ سلامت رکھیے۔ اس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ وہ میرے والد تھے اور مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں نکاح میں برقرار رکھوں''۔

اب اس روایت کو جس انداز سے بھی دیکھ لیں آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ طلاق دینے یا نہ دینے کو معقول عذر کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی مرتبہ اپنے بیٹے کو اگر بیوی کو طلاق دینے کی وصیت کی تھی تو اس کی معقول وجہ تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ عورت بدسلیقہ، بے صبر اور ایک نبی کے شایان شان ہرگز نہ تھی جب کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دوسری بیوی میں اس کے برعکس انتہائی اچھی صفات تھیں جن کے پیش نظر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کی کہ اسے نکاح میں برقرار رکھنا اور اس کا صاف مفہوم یہی ہے کہ یہ عورت تیرے شایان شان ہے کہیں اسے طلاق نہ دے ڈالنا۔ گویا آپ ایسی نیک سیرت بیوی کو طلاق دینے سے بھی پیشگی منع کر رہے ہیں کیونکہ اسے طلاق دینے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ لیکن اگر اس کے برعکس کوئی والد کسی نیک سیرت اور سلیقہ شعار بہو کو طلاق دینے پر مصر ہو اور اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بطور دلیل پیش کرنا شروع کر دے تو یہ كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَ بِهَا الْبَاطِلِ (سچی اور صحیح بات پیش کر کے اس کا غلط مفہوم مراد لینے) کے مصداق ایک درست اور مبنی برحق بات کا غلط استعمال ہوگا!

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ والدین اگر بیٹے کو طلاق پر مجبور کریں اور ان کا مطالبہ کسی معقول وجہ پر مبنی ہو، اور وہ خلوص اور طرفین کی بہتری کی نیت کے ساتھ ایسا کریں (جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا) تو ایسی صورت میں ان کا مطالبہ تسلیم کرنا ہوگا۔ لیکن اگر ان کا مطالبہ معقول عذر پر مبنی نہ ہو تو اسی روایت کے بموجب ان کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا کیونکہ نیک سیرت و باعمل بہو کو اگر بیٹا خود ہی بلا وجہ طلاق دے رہا ہو تو والدین پر فرض ہے کہ اسے اس فعل سے روکیں چہ جائیکہ وہ خود ہی بیٹے کو طلاق دینے پر آمادہ کرنا شروع کر دیں!

۲)......اس سلسلے کی دوسری روایت یہ ہے:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَتْ تَحْتِيْ اِمْرَاَةٌ وَكُنْتُ اُحِبُّهَا وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا فَقَالَ لِيْ طَلِّقْهَا فَاَبَيْتُ فَاَتٰى عُمَرُ النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ (يَا عَبْدَاللّٰهِ) طَلِّقْهَا)) [1]

(۱) [ابو داؤد: كتاب الآداب: باب برالوالدين (ح۵۱۲۹) ترمذی (ح۱۱۸۹) ابن ماجه (ح۲۰۸۹) ابن حبان (ح۴۲۶) حاكم (ج۲ص ۱۹۷) احمد (ج۲ص ۲۰ ـ ۴۲) شرح السنة (ح۲۳۴۸)]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری ایک بیوی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا جب کہ (میرے والد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے کہا کہ اس عورت کو طلاق دے دو لیکن میں نے انکار کر دیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اے عبداللہ!) اس عورت کو طلاق دے دو۔''

واضح رہے کہ مذکورہ (محولہ) کتب میں مروی بعض احادیث میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس عورت کو پھر طلاق دے دی۔ اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((أَطِعْ أَبَاكَ))

(اس مسئلہ میں) اپنے والد کی بات مانو۔ (۱)

اس روایت سے بھی بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ والدین اگر طلاق کا مطالبہ کریں تو بیٹے کو بلا تأمل ان کا مطالبہ پورا کرنا چاہیے قطع نظر اس سے کہ وہ مطالبہ معقول وجہ وعذر پر مبنی ہے یا نہیں۔ حالانکہ یہ بات اول تو مخلوق اور خالق کی اطاعت کے ٹکراؤ کی صورت میں خالق کی اطاعت کو ترجیح دینے کے ضابطے کے خلاف ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطالبہ معقول عذر پر مبنی تھا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسولؐ سے عرض کیا:

((إِنَّ عِنْدَ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اِمْرَاَةٌ قَدْ كَرِهْتُهَا لَهُ)) (۲)

''بلاشبہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی عورت سے نکاح کر رکھا ہے جسے میں عبداللہ کے لیے فی الواقع مکروہ خیال کرتا ہوں۔''

اس روایت میں 'كَرِهْتُهَا لَهُ' کے الفاظ اس کی تائید ضرور کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عورت کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے دینی و دنیوی اُمور کے لیے باعثِ خطرہ خیال کرتے تھے اور یہ ایک معقول وجہ تھی جس کی بنا پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حمایت کرتے ہوئے عبداللہ بن عمر کو طلاق دینے کا حکم دیا۔ واضح رہے کہ مسئلہ مذکور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کو معقول عذر کے ساتھ مربوط کرنے کا نکتہ محض راقم ہی کا

---

(۱) [مسند احمد (ج ۲ ص ۲۰)]

(۲) [ایضاً (ج ۲ ص ۴۲)]

بیان کردہ نہیں بلکہ کئی ایک فقہا عرصہ قبل اس کی طرف اشارہ فرما چکے ہیں مثلاً:

☆......علامہ احمد عبدالرحمٰن البناؒ فرماتے ہیں:

"الظاهر ان عمرؓ ما كرهها الا لكونه راى انها غير صالحة لابنه و غرضه بذلك المصلحة لاسيما وقد كان من الملهمين"

''ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ عورت اس وجہ سے ناپسند تھی کہ ان کے نزدیک وہ آپ کے صاحبزادے کے لیے موزوں نہ تھی اور اس معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیش نظر ضرور کوئی مصلحت ہوگی بالخصوص اس لیے کہ آپ الہام ربانی کے حامل تھے۔''

- نیز فرماتے ہیں کہ

"الذى يظهران النبىؐ لم يأمر عبدالله بطلاق امرأته الا لكونه رأى صحة نظر عمرؓ"

''اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ کو اسی لیے طلاق دینے کا حکم دیا تھا کہ آنحضرتؐ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال صحیح ہوگا۔''(۱)

☆......اسی طرح شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھیؒ اس حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ

" فيه ان طاعة الوالدين متقدمة على هوى النفس اذا كان امرهما اوفق بالدين اذ الظاهر ان عمرؓ ما كان يكرهها ولا امرابنه بطلاقها الالما يظهرله فيها من قلة الدين"(۲)

''اس حدیث سے معلوم ہوا کہ والدین کی اطاعت خواہشِ نفس پر ترجیح رکھتی ہے لیکن اس وقت کہ جب والدین کا حکم دین سے موافقت رکھتا ہو اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس عورت کو ناپسند کرنا اور اپنے بیٹے کو اسے طلاق دینے کا حکم دینا صرف اس وجہ سے تھا کہ اس عورت کے دین و ایمان کی کمزوری آپ کے لیے ظاہر ہو چکی تھی۔''

والدین کے حکم پر طلاق دینے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا جو توجیہات ہم نے ذکر کی ہیں، ان کی مزید تائید درج ذیل واقعہ سے بھی ہوتی ہے:

☆......امام احمد بن حنبلؒ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا:

---

(۱) [الفتح الربانی (ج ۱۷ ص ٤)]

(۲) [مسند احمد ،طبع محقق (ج ۸ ص ۳۳۳)بذیل حاشیہ،ازعلامہ سندھیؒ۔]

"اِنَّ اَبِیْ یَاْمُرُنِیْ اَنْ اُطَلِّقَ اِمْرَاَتِیْ"

''میرا والد مجھے حکم دیتا ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں؟ (تو کیا میں طلاق دے دوں؟) امام احمدؒ نے فرمایا:

"لَاتُطَلِّقْهَا"

''تم اسے طلاق نہ دو۔''

وہ آدمی کہنے لگا کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو طلاق دے (اور پھر بیٹے کو طلاق دینا پڑی) تو امام احمدؒ نے فرمایا:

"حَتّٰی یَکُوْنَ اَبُوْكَ مِثْلَ عُمَرَ"

''ہاں اگر تمہارا والد وہ مقام حاصل کر لے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا تو پھر تمہیں اپنے والد کا حکم ماننا ہوگا۔''(۱)

امام احمد بن حنبلؒ کی اس بات کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ تقویٰ و پرہیزگاری اور للّٰہیت میں جو مقام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا، وہ مقام تیرے والد کا نہیں ہے، اس لیے تیرے والد کا مطالبہ بغض وعداوت اور حسد وکینہ پر مبنی ہو سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر کے سربراہ تھے لیکن تیرا والد سربراہ نہیں اور یہ مفہوم تب درست ہوگا جب واقعی اس شخص کی رہائش اپنے والدین سے الگ ہو یا مشترکہ رہائش میں والد کے بڑھاپے یا کسی معذوری کی وجہ سے نظم ونسق کا اختیار اس کے پاس نہ رہا ہو۔

ملا علی قاریؒ کا موقف:

اس مسئلہ میں ملا علی قاریؒ کا موقف بھی ایک دوسری انتہا پر ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

''بیٹے پر لازم نہیں کہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دے اگرچہ والدین کو اس کی بیوی (اور اپنی بہو) سے شدید تکلیف ہی کیوں نہ پہنچ رہی ہو۔ کیونکہ والدین کا کہا ماننے میں بسا اوقات خاوند کو ضرر پہنچتا ہے، اس لیے والدین کی خاطر اسے طلاق کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ والدین کی شفقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اگر وہ اس ضرر کا پوری طرح اندازہ کر لیتے تو وہ بیٹے کو طلاق کا حکم نہ دیتے۔ اس کے باوجود ان کا

(۱) [دیکھیے: الآداب الشرعية از محمد بن مفلح المقدسي الحنبلي (ج۱ ص۷۶)]

طلاق پر اصرار کرنا، نادانی ہے، جو قابلِ التفات نہیں۔"[1]

ہمارے خیال میں علامہ موصوفؒ کی مذکورہ رائے درست نہیں بلکہ موصوف اس مسئلہ میں دوسری انتہا کو پہنچ گئے ہیں کہ کسی بھی صورت والدین کے کہنے پر عورت کو طلاق نہ دی جائے حالانکہ اگر والدین کا حکم معقول علت و مصلحت پر مبنی ہو تو پھر اطاعت بہر حال کی جائے گی بصورتِ دیگر نہیں۔

علامہ قاضی ابن العربیؒ اور امام منذریؒ کا صحیح فیصلہ:

اس مسئلہ میں قاضی ابن العربیؒ اور امام منذریؒ نے صحیح راہنمائی فرمائی ہے چنانچہ ابن العربیؒ سنن ترمذی کی مذکورہ حدیث کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ

"ومن برالابن بابيه ان يكره ماكره ابوه وان كان له محبا قبل ويحب مايحب اباه وان كان له كره من قبل بيد ان ذلك ان كان الاب على بصيرة فان لم يكن كذلك استحب له فراقها لا رضائه ولم يحب عليه كما يحب فى الحالة الاولى فان طاعة الاب فى الحق من طاعة الله"[2]

"بیٹے کے لیے اپنے والد سے نیکی اور حسن سلوک کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو والد ناپسند کرتا ہے، اسے وہ بھی ناپسند کرے اگر چہ پہلے وہ اس سے محبت کرتا ہو۔ اسی طرح وہ اس چیز سے محبت شروع کر دے جس سے اس کا والد محبت کرتا ہے اگر چہ اس سے پہلے وہ اس سے بغض رکھتا ہو۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب والد بصیرت و درستگی پر ہو لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر والد کو راضی کرنے کے لیے بیوی کو طلاق دینا مستحب تو ہو سکتا ہے مگر اس طرح واجب ہرگز نہیں جس طرح کہ پہلی حالت (والد کے اصابتِ رائے) میں واجب ہے۔ کیونکہ والد کے حق پر ہونے کی صورت میں اس کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے زمرے میں شامل ہے۔"

امام منذریؒ نے بھی سنن ابوداؤد کی تہذیب و شرح میں من وعن یہی فیصلہ دیا ہے۔[3]

راقم الحروف نے بھی آغاز میں اسی ملخص کو ضابطے اور اصول کی شکل میں پیش کر کے اپنی بحث کی بنیاد رکھی

---

(۱) [مرقاة شرح مشكاة: كتاب الايمان :باب الكبائر (ج ۱ ص ۱۳۲)]

(۲) [عارضة الاحوذی، لابن العربیؒ (ج ۵ ص ۱٦٤)]

(۳) [ملاحظه هو : تهذيب سنن ابی داؤد (ج ۸ ص ۳۵)]

ہے کہ والد کا مطالبہ اگر معقول عذر پر مبنی ہو تو پھر بہر صورت اسے ترجیح دی جائے گی۔ بصورتِ دیگر اس مطالبہ کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

والدہ کے حکم سے طلاق:

اگر والدہ بیٹے کو یہ حکم دے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا اس حکم کی تعمیل کی جائے گی یا نہیں؟

بعض فقہا کے بقول ماں کا حق چونکہ تین گنا زیادہ ہے اس لیے یہ حکم بالاولی لائق تعمیل ہوگا جبکہ بعض فقہا نے والد اور والدہ کا اس حکم میں فرق کیا ہے اور والدہ کے حکم سے طلاق کو ضروری قرار نہیں دیا اور ہمیں بھی اسی مؤخر الذکر رائے سے اتفاق ہے کیونکہ:

☆......جن احادیث میں والدین کے حکم سے طلاق دینے کا ذکر ہے ان میں زیادہ سے زیادہ والد کا ذکر ہے والدہ کے بارے میں ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں بلکہ آئندہ سطور میں آنے والی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ والدہ کے اصرار پر طلاق ضروری نہیں۔

☆......ایک گھر میں کسی کو رکھنا یا نکالنا تدبیری و انتظامی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اسلام میں تدبیر و تنظیم کے اختیارات مرد کو سونپے گئے ہیں، عورت کو نہیں۔

☆......مرد کی نسبت عورت اپنے جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہی ماں جو اپنے بیٹے کا نکاح بڑی چاہت و محبت کے ساتھ کرتی ہے پھر جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کے بیٹے کی توجہ اپنی ماں کی بجائے بیوی کے ساتھ بڑھ رہی ہے تو اس فطرتی تبدیلی کو اکثر و بیشتر مائیں برداشت نہیں کر پاتیں۔ نتیجۃً بہو کے ساتھ ساس کی چپقلش چل نکلتی ہے بالخصوص اس وقت جب بہو بھی زبان دراز، لاپروا، اور بد اخلاق ہو چنانچہ اگر ماں کا پلڑا بھاری ہو تو ایسی بہو کو نہ صرف طلاق دلوا کر گھر سے نکال باہر کیا جاتا ہے بلکہ نوبت چولہا پھٹنے تک بھی جا پہنچتی ہے اور اگر بہو چالاک ہوشیار ہو تو وہ خاوند کو جدا کر کے والدین کو کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ دو انتہائیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں اور ہر دوسرا شخص اس میں مبتلا ہے۔ مسئلہ کی نزاکت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کے مکمل اسباب و وجوہات پر روشنی ڈالی جائے اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے تدارک کی تجاویز پیش کی جائیں۔ لیکن یہ بحث چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہے☆ اس لیے

☆ [اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب: هدية العروس طبع جديد 'ساس بہو کے جھگڑے اور ان کا منصفانہ حل']

اس سے فی الحال صرف نظر کرتے ہوئے اپنے موضوع کی مناسبت سے راقم یہ کہنا چاہے گا کہ والدہ اور بیوی کے الگ سے جو حقوق مرد پر عائد ہوتے ہیں انہیں کما حقہ پورا کرنے کی کوشش کی جائے تاہم اس سب کے باوجود محض ماں کے حکم سے طلاق دینا فرض نہیں۔

☆...... یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر عورت اپنی ساس کی خدمت نہ کرتی ہو اور شوہر کے دیگر رشتہ داروں سے متعلقہ اُمورِ خانہ داری میں بھی لاپروائی کرتی ہو تو کیا پھر بھی والدہ کے مطالبہ کے باوجود اس عورت کو طلاق نہیں دی جائے گی؟

یہ ایک اہم سوال ہے، اس کے جواب کے سلسلہ میں درج ذیل تمام باتیں مدنظر رکھنا ہوں گی:

۱۔ والدہ کی خدمت اصولی طور پر بہو پر نہیں بلکہ اس کے بیٹے پر فرض ہے، وہ یہ خدمت خود کرے یا نوکروں سے کروائے یا اپنی بیوی سے کروائے بہر صورت یہ بیٹے ہی کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ اگر خاوند اپنی بیوی کو حکم دے کہ میری ماں اور دیگر اقاربین کی فلاں فلاں خدمت انجام دو تو بیوی پر چونکہ شوہر کا حکم ماننا فرض ہے، اس لیے اسے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی ماسوائے اس صورت میں کہ خاوند خلافِ شرع کوئی حکم دے رہا ہو، یا اس پر زیادتی کر رہا ہو۔

۳۔ مشترکہ خاندان میں گھر کا سربراہ اگر والد ہے تو بہو چونکہ اس کے لیے بیٹی کے درجہ میں ہے، اس لیے جس طرح گھریلو کام کاج دیگر بیٹیوں سے کروائے جاتے ہیں اسی طرح جو حصہ اور ذمہ داری بہو کی بنتی ہے وہ اس پر ڈالی جائے گی۔ اور مشترکہ رہائش میں بہو کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی کیونکہ گھر کے دیگر افراد کی طرح وہ بھی ایک فرد ہے اور اگر اس کے ساتھ نامناسب امتیازی سلوک برتا جائے (جس طرح کہ عام طور پر پاکستانی معاشرے میں ہوتا ہے) تو یہ قابلِ مذمت ہے اور اس بنیاد پر بیٹا اپنی رہائش الگ کرنا چاہے یا اس کی بیوی اسے الگ ہونے پر مجبور کردے تو اس میں ان دونوں کا اتنا قصور نہیں جتنا گھر کے سربراہ کا امتیازی سلوک کرنے کی وجہ سے ہے۔

۱۔ اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ والدہ اپنی جگہ سچی ہو اور بیوی اپنی جگہ اور مرد کے لیے بیوی کو طلاق دیئے بغیر والدہ کو راضی کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں والدہ کی نافرمانی پر اللہ کے ہاں کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر مرد بیوی کے مقابلہ میں والدہ کی خوشی کو ترجیح دیتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس پر اس سلسلہ میں کوئی گناہ نہیں ہوگا، روایات میں مذکور درج ذیل واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے:

''ایک آدمی اپنے والدین کا بڑا فرمانبردار تھا، اس کے والدین دونوں یا دونوں میں سے، کسی ایک نے اسے حکم دیا کہ وہ شادی کر لے، اس نے شادی کر لی۔ پھر اس کی والدہ اور بیوی میں ناچاقی ہوگئی۔ گھر والے تو اس شخص کی موافقت کر رہے تھے، جبکہ والدہ کا مطالبہ تھا کہ اس عورت کو طلاق دے دو۔ اس شخص کے لیے بیوی کو طلاق دینا بھی اسی طرح مشکل تھا جس طرح والدہ کی نافرمانی۔ چنانچہ اس اُلجھن میں وہ حضرت ابودرداءؓ کے پاس آیا اور انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت ابودرداءؓ فرمانے لگے کہ میں نہ تو یہ کہتا ہوں کہ اپنی بیوی کو طلاق دو اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ ماں کی نافرمانی کرو، لیکن اگر چاہو تو ایک حدیث سن لو۔ وہ حدیث یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَحَافِظْ اِنْ شِئْتَ اَوْضَيِّعْ))

''والد جنت کا مرکزی دروازہ ہے لہذا اگر چاہو تو اس دروازے کی حفاظت کرو اور چاہو تو اسے ضائع کر دو۔'' بالآخر وہ شخص کہنے لگا: گواہ رہو کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔ چنانچہ وہ شخص واپس گھر گیا اور بیوی کو اس نے طلاق دے دی۔''(1)

واضح رہے کہ مذکورہ بالا واقعہ مختلف اسناد اور الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ کتب احادیث میں موجود ہے اور ہم نے ان میں سے اس حدیث کا انتخاب کیا ہے جو اس واقعہ کی تمام جزئیات کو صحت سند کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہے۔ پورا پس منظر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ طلاق کا حکم والدہ نے دیا تھا، البتہ ترمذی کی روایت میں راوی نے اس شک کا اظہار کیا ہے کہ یہ مطالبہ یا تو والد کی طرف سے تھا یا پھر والدہ کی طرف سے، جبکہ زیادہ تر راویوں نے بغیر شک کے والدہ ہی کی صراحت کی ہے۔ مگر وجہ طلاق کیا تھی یہ کہیں بیان نہیں ہوئی۔

طلاق پر اصرار والد نے کیا یا والدہ نے، بہر دو صورت حضرت ابودرداءؓ نے اس شخص کو یہ حکم نہیں دیا کہ بیوی کو طلاق دے دو، حالانکہ ان کے علم میں ابن عمرؓ کا یہ واقعہ ضرور ہوگا کہ انہیں مجبوراً والد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دینا پڑی تھی۔ ابودرداءؓ نے بطورِ مشورہ والد کی اطاعت کے سلسلہ میں ایک حدیث اسے سنادی، ممکن ہے اس سے ان کی مراد یہ ہو کہ گھریلو معاملات میں اطاعت والد کی کی جائے گی، والدہ کی نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس حدیث سے ان کی مراد والدہ کی اطاعت ہو اور اپنی طرف سے تجویز یہ ہو کہ اس جھگڑے میں طلاق دے دینی چاہیے۔ تاہم ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت ہو، نتیجہ یہی نکلا کہ بالآخر اس شخص نے ماں کے اصرار پر مجبور ہو کر بیوی کو طلاق دے دی۔

(1) [شرح السنة (ح ٣٤٢١) صحیح ابن حبان (٢٠٢٣) نیز دیکھیے: مشکل الآثار، از امام طحاویؒ (ج ١ ص ٥٨)]

۵۔ اگر والدہ بغیر کسی معقول وجہ کے بیٹے کو مجبور کرے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے تو پھر ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں، لیکن اگر والدہ کے اصرار کی وجہ سے کوئی شخص بیوی کو طلاق دے کر مجبوراً اس پر ظلم کر بیٹھتا ہے تو میری رائے میں اس ظلم کا گناہ اس کی والدہ پر ہوگا.....!

سعودی عرب کے مفتی محمد صالح ابن العثیمینؒ کا فتویٰ:

سوال: موصوف سے سوال کیا گیا کہ اگر والد اپنے بیٹے سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اپنی بیوی کو میرے حکم پر طلاق دے دو تو کیا بیٹے کو والد کا حکم مانتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دینا ہوگی؟

جواب: موصوف نے اس سوال کا جو جواب دیا، اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''اگر والد اپنے بیٹے سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اپنی بیوی کو میرے حکم پر طلاق دے دو تو اس مطالبے کی دو صورتیں ہوں گی: ایک تو یہ کہ والد اپنے اس مطالبہ کا شرعی سبب بتائے مثلاً وہ بیٹے سے یہ کہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو کیونکہ تمہاری بیوی کی اخلاقی حیثیت مشکوک ہے.....وہ اجنبی مردوں کے ساتھ تعلقات رکھتی ہے.....وہ مخلوط مجالس میں شرکت کرتی ہے.....وغیرہ وغیرہ، تو بیٹے کو اپنے والد کا یہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے ایسی عورت کو طلاق دے دینی چاہیے۔ کیونکہ اس کے والد کا یہ مطالبہ خواہشِ نفس اور خود غرضی وغیرہ پر مبنی نہیں بلکہ وہ بیٹے کی بہتری چاہتے ہوئے یہ مطالبہ کر رہا ہے، لہذا بیٹے کو بھی اس خیر خواہی کو قبول کرنا چاہیے۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بیٹے کو اپنی بیوی سے بڑی محبت ہو اور والد اس محبت پر غیرت کھاتا ہو بلکہ ماؤں کے لئے تو ایسی صورت برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کا بیٹا اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ ساس اور بہو میں عموماً چپقلش پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس حالت سے اپنی پناہ میں رکھے، لہذا اگر ایسی کوئی صورت ہو تو بیٹے کے لئے اپنے والدین کی اطاعت کرنا اور بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے۔ تاہم اسے یہ کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ والدین سے حسن سلوک رکھے حتی کہ اپنی بیوی کی موجودگی پر انہیں بھی راضی و مطمئن کرلے۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ اس کی بیوی بھی دیندار اور نیک اخلاق ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ سے ایک آدمی نے بالکل اسی نوعیت کا سوال کیا کہ میرے والد مجھے کہتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں؟ تو امام موصوفؒ نے جواب دیا کہ طلاق نہ دو۔ اس آدمی نے کہا کہ جب

حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کو یہ حکم دیا تھا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور وہ نہ مانے اور بعد میں اللہ کے رسول ﷺ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید کی اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کو طلاق دینا پڑی؟ تو امام احمدؒ اس کے اس اعتراض پر فرماتے ہیں: ''کیا تمہارا باپ اسی حیثیت کا حامل ہے جس حیثیت کے حامل جناب عمرؓ تھے!''......واضح رہے کہ حضرت عمرؓ سے متعلقہ اس روایت کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی شرعی مصلحت کے پیشِ نظر ایسا مطالبہ کیا تھا۔''(۱)

مولانا گوہر رحمانؒ [شیخ الحدیث جامعہ تفہیم القرآن، مردان] کا فتویٰ:

سوال: کیا والدین کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے؟ [سائل: روشن غنی، از خمیس، سعودی عرب]

جواب: ایک حدیث میں آیا ہے کہ ''والدین تمہیں بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیں تو پھر بھی ان کی اطاعت کرو۔'' (ابوداؤد۔ترمذی) اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حکم دیا لیکن انہوں نے اپنے والد کی یہ بات نہ مانی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے بیٹے کی شکایت کی تو اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا:

((يَاعَبْدَاللّٰهِ طَلِّقْ اِمْرَاَتَكَ))

''اے عبداللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔''

سنن ترمذی (ابواب البر والصلة) میں ایک اور روایت آئی ہے کہ ایک شخص کو اس کی ماں نے کہا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ اس شخص کو طلاق دینا بھی گوارا نہیں تھا اور ماں کی ناراضگی بھی پسند نہیں تھی۔ چنانچہ وہ شخص مشہور صحابی ابوالدرداءؓ کے پاس اپنی یہ مشکل لے کر آئے۔ ابوالدرداءؓ نے فرمایا: میں اس صورتحال میں نہ تمہیں طلاق دینے کا مشورہ دیتا ہوں اور نہ ماں سے قطع تعلق کا مشورہ دے سکتا ہوں۔ البتہ میں تم کو رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سناتا ہوں کہ آپ نے فرمایا:

((اَلْوَالِدُ اَوْسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَحَافِظْ اِنْ شِئْتَ اَوْضَيِّعْ))

''باپ جنت کے درمیانی دروازوں میں سے ہے پس تو اگر چاہے تو اس کو محفوظ کر لے یا اگر چاہے تو اسے ضائع کر دے۔''

---

(۱) [فتاوی المرأة المسلمة (ج۲ ص ۷۵۵، ۷۵۶) مرتب: ابو محمد اشرف بن عبد المقصود]

حدیث رسول سننے کے بعد اس شخص نے ابوالدرداءؓ کے سامنے ہی طلاق دے دی۔

ان احادیث کا اور اس مضمون کی دوسری احادیث کا تعلق اس صورتحال سے ہے جب بیوی اپنے شوہر کے والدین کی دل آزاری کرتی ہو، یا بدکار اور بدزبان ہو اور اپنی اس بدسلوکی اور بداخلاقی سے وعظ ونصیحت اور اصلاح کے دوسرے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود باز نہ آتی ہو تو ایسی صورت حال میں والدین کا حکم معروف یعنی بھلائی کا حکم ہے جس کا ماننا ضروری ہے اور ایسا نہ کرنا عقوق الوالدین [والدین کی نافرمانی] ہے، جو کبیرہ گناہ ہے۔ انہی احادیث کی روشنی میں فقہاءؒ نے لکھا ہے:

" بل یستحب لو موذیة له او لغیرہ بقولها او بفعلها"

''ایسی صورت میں طلاق دینا مستحب ہے جبکہ بیوی اپنے شوہر کی یا کسی اور کی دل آزاری کرتی ہو، اپنی باتوں کے ذریعے یا اپنے عمل کے ذریعے۔'' [مجموعه شامی (ج۳ص ۵۷۱۔۵۷۲)]

لیکن اگر والدین کا یہ حکم اور اصرار، محض ضد اور طبعی منافرت کی وجہ سے ہو، کسی شرعی اور معقول وجہ پر مبنی نہ ہو تو ایسی صورت میں والدین کے کہنے پر طلاق دینا واجب نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰهِ الطَّلَاقُ))[ابو داؤد]

''مباح کاموں میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین (ناپسندیدہ ترین) کام بیوی کو طلاق دینا ہے۔''

اور ناپسندیدہ کام میں والدین کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

((اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوفِ)) یعنی ''اطاعت بھلائی کے کاموں ہی میں کی جاسکتی ہے''۔

ظاہر ہے کہ بغیر کسی شرعی اور معقول وجہ کے صرف ضد، تعنت اور طبعی منافرت کی بنا پر طلاق کا حکم دینا بھلائی (معروف) کا حکم نہیں ہے بلکہ ''مبغوض الی اللہ'' یعنی ناپسندیدہ فعل کا حکم ہے جس کی اطاعت جائز ہی نہیں ہے چہ جائیکہ واجب ہو۔ امراء، والدین اور دوسرے بزرگوں کی اطاعت معروف ہی میں کی جاسکتی ہے، غیر معروف میں نہیں کی جاسکتی۔ (گوہر رحمان ۱۹ اپریل ۱۹۹۰ء)[1]



(۱) [تفہیم المسائل، ازمولانا گوہر رحمانؒ (جلد ۱ ص ۳۶۸ تا ۳۷۰)]

باب ۱۰:

مالی معاملات اور والدین واولاد کے باہمی مسائل

* ...... مالی معاملات اور والدین کی اطاعت کی حدود...... اصولی بحث
* ...... سارا مال صدقہ یا ہبہ کرنا
* ...... اولاد کو عاق کرنا
* ...... مالی تقسیم میں ناانصافی کا جرم
* ...... زندگی میں وراثت کی تقسیم اور ہبہ
* ...... شادی بیاہ کے اخراجات اور لڑکیوں کا حقِ وراثت سے محرومی کا مسئلہ
* ...... والدین کی کمائی اگر حرام اور مشتبہ ہو؟



[1]...... مالی معاملات اور اطاعتِ والدین کی حدود

[اصولی بحث]

مالی معاملات میں والدین کی اطاعت کا مسئلہ بھی افراط وتفریط کا شکار ہے۔ایک طرف عملی طور پر یہ صورتحال ہے کہ جب والدین بوڑھے اور ضعیف ہو جاتے ہیں تو جوان اولاد ان کا وہ حقِ خدمت ادا نہیں کرتی جو کرنا چاہیے بلکہ معاشرتی ماحول کے مطابق اس میں مختلف انداز میں غفلت برتی جاتی ہے مثلاً مغربی ممالک میں چونکہ خاندانی نظام کا وہ تصور ہی مفقود ہے جو اسلام پیش کرتا ہے، اس لیے وہاں تو ایسے 'اولڈ ہاؤس' [نرسنگ ہوم] بنا دیئے گئے ہیں جہاں بوڑھے والدین کو 'جمع' کروا دیا جاتا ہے تاکہ ان کا بڑھاپہ اولاد کی عیاشانہ زندگی میں خلل انداز نہ ہو سکے۔جبکہ ہمارے ہاں بعض نام نہاد مسلمان اپنے والدین سے جو ناروا سلوک کرتے ہیں اس کی بھی کئی صورتیں ہیں:

سب سے ادنیٰ صورت تو یہ ہے کہ اپنے معاملات میں والدین کو مشورہ دینے کی حد تک بھی شامل نہیں کیا جاتا بلکہ ہر کام ان سے چھپا کر یا بتائے بغیر ہی کیا جاتا ہے جبکہ اس کی انتہائی صورتوں میں والدین کو مارنا پیٹنا، واجبی اخراجات مہیا نہ کرنا، ان کی بیماری اور پریشانی کا ازالہ نہ کرنا، ان کی ضروریات کا خیال نہ رکھنا وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ہمارے ہاں 'اولڈ ہاؤس' کا نظام تو ابھی تک نہیں آیا ماسوا ایک آدھ مثال کے۔اور اللہ اس دن سے بچائے جب مغربی تہذیب کا یہ تحفہ ہمیں عنایت ہو، تاہم عملی طور پر بوڑھے والدین کو گھر میں رکھنے کے باوجود ایسا برا سلوک کیا جاتا ہے جو مغربی ممالک میں قائم اولڈ ہاؤس میں بھی نہیں ہوتا بلکہ اولاد سے جائز شکوہ رکھنے والے بوڑھے والدین کو اگر اولڈ ہاؤس کے اوصاف بتا کر یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اولاد کے ناروا سلوک کے باوجود ان کے ساتھ رہنے پر رضامند ہیں یا مغربی ممالک کے اوصاف و شرائط پر قائم اولڈ ہاؤس میں جانا چاہتے ہیں تو آپ یقین کیجئے کہ اولاد کے ناروا سلوک کی وجہ سے ایک بڑی تعداد اولڈ ہاؤس میں

جانا ہی پسند کرے!

ہمارے ایک دوست ڈاکٹر ہیں۔انہوں نے بتایا کہ ہمارے کلینک پر ہر طرح کا امیر وغریب مریض آتا ہے۔ایک دن ایک بوڑھی غریب اماں ہمارے کلینک پر آئی اور جب اس کے دوا لینے کی باری آئی تو اس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔میں نے اس کی حالت سے غربت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا:اماں! پریشان نہ ہو،آپ سے فیس نہیں لوں گا۔

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا:بیٹا!ایک ہفتے سے بستر پر بیمار پڑی ہوں۔

میں نے کہا:اب تک دوا کیوں نہیں لی؟

اس نے کہا:بیٹا دوا ہی کی وجہ سے تو رو رہی ہوں!

میں نے کہا:کیا مطلب؟

اس نے لمبی آہ بھری اور کہا:بیٹا،جب بھی گھر میں بیماری کا شکوہ کرتی ہوں،سگا بیٹا اور بہو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے ہیں کہ اماں تو ہمیشہ بیمار ہی رہتی ہے......!نہ دوا لا کر دیتے ہیں اور نہ مجھے پیسے دیتے ہیں کہ خود دوا لے آؤں۔ہفتے بعد پڑوسن نے رحم کھا کر کچھ پیسے دیے تو میں نے گرتے پڑتے ادھر کا رخ کیا۔اس کے ساتھ ہی اس اماں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔خود میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے کہ ایسی نافرمان اولاد بھی ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہے۔پھر میں نے اماں سے کہا:اماں جان!آپ کو کوئی مسئلہ ہو آپ فوراً میرے کلینک پر آ جایا کریں،میں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔اور نافرمان بیٹے کے لیے بھی جا کر دعا مانگیں کہ اللہ اسے ہدایت دے۔

یہ ایک معمولی مثال ہے ورنہ ہمارے ہاں اس سے زیادہ دل دہلا دینے والی مثالیں بھی موجود ہیں۔وہی اولاد جس کے لیے والدین اپنا تن من دھن سب قربان کر دیتے ہیں،بڑھاپے میں ان پر چند ٹکے خرچ کرنے کی روادار نہیں ہوتی۔اگر بیٹے کو کچھ شرم آ جائے تو بیویاں بے شرم بن کر آڑے آ جاتی ہیں اور یہ نہیں سوچتیں کہ والدین کی قربانیوں اور دعاؤں ہی سے تو وہ آج پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا ہے۔

اس مسئلہ کی دوسری انتہا یہ ہے کہ مالی معاملات کے حوالے سے بعض مذہبی لوگ ایک حدیث کی بنیاد پر یہاں تک فتویٰ دے ڈالتے ہیں کہ والد اپنی اولاد کے مال کا بھی اسی طرح مالک ہے جس طرح اپنے مال کا۔لہٰذا وہ اولاد کے مال کو بھی جیسے چاہے استعمال میں لا سکتا ہے۔

دراصل جب بھی کسی آیت یا حدیث کو اسلام کی مجموعی تعلیمات سے الگ کر کے غور وفکر کا محور بنایا جائے گا، ایسی انتہائی آراء پیدا ہوتی رہیں گی۔ اس مسئلہ میں بھی ایک حدیث کو اسلام کی مجموعی تعلیمات سے الگ کر کے جب غور وفکر کا محل بنایا گیا تو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ آئندہ سطور میں ہم پہلے اس حدیث کا ذکر کریں گے، بعد میں اس کے معنی ومفہوم کا تعین اسلام کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں کریں گے۔

وہ حدیث یہ ہے:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ قَالَ أَتَى أَعْرَابِيٌّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ إِنَّ أَبِي يُرِيدُ أَنْ يَجْتَاحَ مَالِي؟ قَالَ: أَنْتَ وَ مَالُكَ لِوَالِدِكَ إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَإِنَّ أَمْوَالَ أَوْلَادِكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ فَكُلُوهُ هَنِيئًا))[(۱)]

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''یارسول اللہؐ! میرا والد میرا مال ضائع کرتا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اور تیرا مال تیرے والد ہی کا ہے۔''

(نیز آپؐ نے باقی سب لوگوں سے بھی فرمایا:) ''تمہاری پاکیزہ خوراک وہ ہے جو تم خود کما کر کھاؤ اور تمہاری اولاد کا مال بھی تمہاری کمائی میں سے ہے، لہٰذا تم اس میں سے بخوشی کھا سکتے ہو۔''

اس حدیث کا معنی ومفہوم واضح کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اسلام کی مجموعی تعلیمات کا حاصل پہلے بیان کر دیا جائے۔

---

(۱) [مسند احمد (ج۲ص۱۷۹)] یہی روایت الفاظ کی کمی وبیشی کے ساتھ درج ذیل کتب میں بھی موجود ہے: ابو داؤد: (ح۳۵۳۰) ابن ماجه (ح۲۲۹۱) ابن حبان (ح۱۰۹٤) السنن الكبرى للبيهقى (ج۷ص٤۸۰) دلائل النبوة للبيهقى (ج٦ص۳۰٤) مجمع الزوائد (ج٤ص۱٥٤) احمد (ج۲ص۲۰٤، ۲۱٤) تفسير قرطبى (ج٥ص٤۱۲) فتح البارى (ج٥ص۲۱۱) شرح السنة (ج۹ص۳۳۰) ارواء الغليل (ج۳ص۳۳۳۔ ج٦ص٦٥۔ ج۷ص۲۳۲) مشكلة (ح۳۳٥٤) مسند بزار (ح۱۲٦۱) المعجم الكبير للطبرانى (ح۱۰۰۱۹) والاوسط (ح٥۷) والصغير (۹٤۷) تلخيص الحبير (ج۳ص۱۸۹) مشكل الآثار للطحاوى (ج۲ص۲۳۰) شرح معانى الآثار (ج۲ص۲۸۹) المغنى (ج۱۱ص۳۷۳) واضح رہے کہ اس حدیث کو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ مثلاً دیکھئے: فتح البارى (ج٥ص۲۱۱)]

اولاد اور والدین کے اخراجات سے متعلقہ اسلامی تعلیمات:

اللہ تعالیٰ نے معاشرتی نظام کو بہترین صورت میں قائم رکھنے کے لیے یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے کہ جب تک اولاد تعلیم وتربیت اور وسائل واخراجات کی محتاج ہے، تب تک ان کی حضانت وکفالت اور تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے والدین پر ڈال دیں اور انہیں اپنی استطاعت کی حد تک ان سے عہدہ برآ ہونے کا ذمہ دار ٹھہرادیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾[البقرۃ: ۲۳۳]

''ان (یعنی ماں اور بچے) کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہے۔''

اور جب والدین بوڑھے، لاچار اور محتاج ہوجاتے ہیں تو ان کی کفالت سے متعلقہ تمام ذمہ داریاں ان کی جوان اولاد پر عائد ہوجاتی ہیں۔ قرآن مجید میں والدین کے ساتھ بار بار جس احسان اور نیکی کرنے کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے۔ ورنہ اگر بڑھاپے اور بیماری میں مستحق والدین کی انسان پرواہی نہ کرے تو پھر یہ کہاں کا احسان ہے؟!

گویا جس طرح بچپن میں اولاد کے تمام تر اخراجات کی ذمہ داری والدین پر تھی، اسی طرح بڑھاپے میں والدین کو ان کے تمام واجبی اخراجات مہیا کرنا اولاد کی ذمہ داری اور ایک شرعی فریضہ ہے۔ ان دونوں باتوں پر اجماع امت ہے جیسا کہ امام ابن المنذر رقمطراز ہیں کہ

((اجمع اهل العلم على ان نفقة الوالدين الفقيرين اللذين لا كسب لهما ولا مال واجبة فى مال الولد واجمع كل من نحفظ عنه من اهل العلم على ان على المرء نفقة اولاده الاطفال الذين لا مال لهم))[1]

''اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ مستحق اور نادار والدین جن کی آمدن کا کوئی ذریعہ نہ ہو، ان کے تمام واجبی اخراجات کی ذمہ داری ان کے بیٹوں پر ہے۔ اسی طرح ہمارے علم کے مطابق جو اہل علم ہیں، ان سب کا اس بات پر بھی اجماع ہے کہ چھوٹے بچے جن کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا، ان کے اخراجات کا ذمہ دار ان کا باپ ہے۔''

---

۱) [بحوالہ :المغنی، ازابن قدامہ حنبلیؒ(ج۱۱ص۳۷۳)]

معلوم ہوا کہ والد پر اپنی اولاد کے اور اولاد پر اپنے والدین کے خوراک سے لے کر رہائش تک اتنے اخراجات مہیا کرنا فرض ہے جو ان کی واجبی ضروریات کے لیے کفایت کرسکیں جبکہ اس کے علاوہ ہر ایک کا اپنی ذمہ داری میں دوسرے سے مزید تعاون کرنا 'احسان' کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر اولاد صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود والدین کے واجبی اخراجات مہیا نہیں کرتی تو والدین اپنے حقوق کے لیے قانونی چارہ جوئی بھی کرسکتے ہیں خواہ والدین غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام نے والدین سے جس حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا ہے اس پر اگر عمل کیا جائے تو قانون کی راہ تلاش کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ!

زیرِ بحث حدیث کا معنی ومفہوم:

مالی معاملات کے حوالے سے اولاد اور والدین کے باہمی حقوق وفرائض کی اصولی بحث کے بعد اب ہم گزشتہ حدیث، یعنی......اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ...... کے معنی ومفہوم پر غور کرتے ہیں:

☆......اگر تو اس حدیث کے ظاہری مفہوم کے پیشِ نظر یہ مراد لیا جائے کہ بیٹے کا مال دراصل والد ہی کی ملکیت ہے تو پھر اس سے دیگر شرعی احکام متاثر ہوں گے مثلاً باپ کی زندگی میں اگر بیٹا فوت ہو جائے اور وہ صاحبِ اولاد ہو تو پھر شرعی احکام کے مطابق اس کے مال کے چھٹے حصے کی وراثت کا حقدار والد ہوگا جبکہ بقیہ مال دیگر اقارب (مثلاً والدہ، بیوی، اولاد) میں تقسیم ہوگا اور یہ قرآن مجید کی صریح تعلیمات کے مطابق ہے لیکن اگر اس کا مذکورہ بالا مفہوم (یعنی ''بیٹے کا مال بھی باپ ہی کی ملکیت ہے'') درست قرار دے دیا جائے تو پھر سارا مال تو والد کا ہونا چاہیے اور بیٹے کی وراثت کی تقسیم کا سوال ہی سرے سے غلط ہونا چاہیے!

اسی طرح اس مفہوم کو اختیار کرنے سے اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ کوئی صاحب اس صحیح حدیث کو خلافِ قرآن کہہ کر قصہ ہی ختم کر دیں!

☆......اس کے برعکس اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے جو والدین اور اولاد کے باہمی حقوق وفرائض سے متعلقہ مجموعی تعلیمات سے گہری مناسبت رکھتا ہے اور بعض محدثین وشارحینِ حدیث اور فقہاء نے اپنے اپنے انداز سے اس کی وضاحت بھی کی ہے☆ اور وہ یہ ہے کہ والد اگر محتاج ہو تو وہ بقدرِ کفایت اپنی اولاد کے

☆ مثلاً دیکھئے معالم السنن از خطابیؒ (ج۳ ص۱۶۶) مشکل الآثار از طحاویؒ (ج۲ ص۲۳۰) ابن حبان (ج۱ ص۳۱۶) شرح السنۃ از بغویؒ (۳۳۰/۹) فتح الباری (۲۱۱/۵) سنن بیہقیؒ (ج۷ ص۴۸۱)!

مال سے حصہ لے سکتا ہے خواہ اولاد کی نظر میں یہ ان کے مال کا ضیاع اور حق تلفی ہی کیوں نہ ہو مگر شریعت کی نظر میں یہ ضیاع نہیں بلکہ والد کا حق ہے جو وہ زبردستی اور قانونی طور پر بھی وصول کر سکتا ہے۔

زیر بحث حدیث میں مذکور باپ اور بیٹے کے جھگڑے کا واقعہ بھی اسی پر محمول کیا جائے گا کہ والد مستحق تھا اور بیٹا مالدار ہونے کے باوجود اس کی تنگدستی کی طرف توجہ نہیں کر رہا تھا، چنانچہ والد نے زبردستی شروع کر دی اور معاملہ آنحضرت تک جا پہنچا۔ آپؐ نے بیٹے کی سرزنش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ نہ صرف تمہارا مال بلکہ تمہارا جسم بھی تمہارے والد کا ہے۔ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ کا یہی مفہوم ہے اور آپ کی مراد یہ تھی کہ اپنے والد کی ضروریات نہایت توجہ اور ترجیح کے ساتھ پوری کرو۔ بعض کمزور درجہ کی روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً:

۱)......ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا والد مقروض تھا۔ (۱)

۲)......ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا والد سخت مجبور تھا اور اس نے اللہ کے رسولؐ کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار ان اشعار میں کیا:

۱۔ غَذَوْتُکَ مَوْلُوْدًا وَمُنْتُکَ یَافِعًا　　تُعَلُّ بِمَا اَجْنِیْ عَلَیْکَ وَتُنْهَلُ

''میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی، تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔''

۲۔ اِذَا لَیْلَةٌ ضَافَتْكَ بِالسَّقْمِ لَمْ اَبِتْ　　لِسَقْمِكَ اِلَّا سَاهِرًا اَتَمَلْمَلُ

''جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آ گئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بے قراری میں گذاری۔''

۳۔ کَاَنِّیْ اَنَا الْمَطْرُوْقُ دُوْنَكَ بِالَّذِیْ　　طُرِقْتَ بِهٖ دُوْنِیْ فَعَیْنِیْ تُهْمَلُ

''گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں لگی، جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔''

۴۔ تَخَافُ الرَّدٰی نَفْسِیْ عَلَیْكَ وَاِنَّهَا　　لَتَعْلَمُ اَنَّ الْمَوْتَ وَقْتٌ مُؤَجَّلُ

''میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے، جو نہ آگے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے۔''

---

(۱) [صحیح ابن حبان (ح ۱۰۹٤)]

۵۔ فَلَمَّا بَلَغْتَ السِّنَّ وَالْغَايَةَ الَّتِي إِلَيْهَا مَدىٰ مَا كُنْتَ فِيكَ أُؤَمِّلُ

''پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔''

٦۔ جَعَلْتَ جَزَائِي غِلْظَةً وَفَظَاظَةً كَأَنَّكَ أَنْتَ الْمُنْعِمُ الْمُتَفَضِّلُ

''تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنادیا، (اور اس طرح ہو گئے کہ) گویا تم ہی مجھ پر احسان وانعام کرتے رہے ہو (میں نہیں!)۔''

۷۔ فَلَيْتَكَ إِذْ لَمْ تَرْعَ حَقَّ أُبُوَّتِي فَعَلْتَ كَمَا الْجَارُ الْمُصَاقِبُ يَفْعَلُ

''کاش! اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہوسکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔''

۸۔ فَأَوْلَيْتَنِي حَقَّ الْجِوَارِ وَلَمْ تَكُنْ عَلَيَّ بِمَالٍ دُونَ مَالِكَ تَبْخَلُ

''تو کم از کم مجھے پڑوسی کا حق تو دیا ہوتا اور خود میرے ہی مال میں میرے حق میں بخل سے کام نہ لیا ہوتا۔''

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ...... ''کل کو تو چھوٹا سا بچہ تھا۔ میں اور تیری ماں نے تیری پرورش کے لیے راتوں کو جاگ کر، پیٹ پر پتھر باندھ کر، حالات کا جفاکشی کے ساتھ مقابلہ کر کے اور بڑی بڑی تکلیفات برداشت کر کے تجھے پالا پوسا اور بڑا آدمی بنایا مگر آج تو ہماری ضروریات کے باوجود ہمیں ان خدمات کا اتنا صلہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں جتنا کوئی شخص اپنے ہمسائے کو دے سکتا ہے!''

جب اللہ کے رسولؐ نے اس کے یہ اشعار سنے تو آپؐ رو پڑے اور اس شخص کے بیٹے کا گریبان پکڑ کر فرمایا:

((أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيكَ))[(۱)]

''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''

مذکورہ پس منظر میں بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس جملے سے یہاں حضور ﷺ کی کیا مراد تھی۔

۳)......اس طرح ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! میرا والد یہ چاہتا ہے کہ وہ میرا سارا مال ہتھیا کر تباہ کر دے۔'' (آپؓ انہیں سمجھائیے!)

(۱) [دلائل النبوة، للبيهقيؒ (ج ٦ ص ٣٠٥) مجمع الزوائد، للهيثميؒ (ج ٤ ص ١٥٥)]

آپ ﷺ نے اس کے والد سے پوچھا: ''یہ کیا کہہ رہا ہے؟''

اس کے والد نے جواب دیا: ہاں! یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے والد سے کہا:

((اِنَّمَا لَكَ مِنْ مَالِهِ مَا يَكْفِيْكَ))

''اس کے مال میں سے تو صرف اتنا ہی لے سکتا ہے جتنی کہ تیری ضرورت ہے۔''

اس فیصلے پر اس شخص نے کہا:

''اے اللہ کے رسول کے خلیفہ! کیا اللہ کے رسولؐ نے (باپ بیٹے کے جھگڑے کے موقع پر بیٹے سے) یہ بات نہیں کہی تھی کہ ''تو اور تیرا مال تیرے والد ہی کا ہے؟''

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس اعتراض پر جواب دیا:

((اِرْضَ بِمَا رَضِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ))

''اس بات پر راضی رہ جس پر اللہ کی رضامندی ہے۔''(1)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے تیرے بیٹے کے مال میں سے صرف اتنا حصہ رکھا ہے جتنی تیری ضرورت ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا تو بیٹے کے مال سے بقدرِ کفایت لینے پر ہی خوش رہ۔

۴)......ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اللہ کے رسولؐ کے پاس آیا اور آکر کہنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ!

((اِنَّ لِیْ مَالًا وَعِيَالًا وَاِنَّ لِاَبِیْ مَالًا وَعِيَالًا يُرِيْدُ اَنْ يَّأْخُذَ مَالِیْ فَيُطْعِمُهُ عِيَالَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ))(2)

''میں صاحبِ مال اور صاحبِ عیال ہوں اور میرا باپ بھی صاحبِ مال اور صاحبِ عیال ہے مگر اس کے باوجود وہ چاہتا ہے کہ میرا مال چھین کر اپنے اہل وعیال کا پیٹ بھرے (بتایئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟)

آپؐ نے اس سے فرمایا: تو اور تیرا مال تیرے باپ ہی کا ہے!''

اس روایت سے بھی یہی معلوم ہوا کہ اس شخص کا باپ ضرورت مند تھا اور وہ اپنی ضرورت کے لیے بیٹے سے مال لینا چاہتا تھا جس کی آپؐ نے والد کے برتر حق کی وجہ سے کھل کر اجازت دے دی۔

---

(1) [مجمع الزوائد (ج٤ص١٥٦) السنن الکبریٰ (ج٧ص٤٨١)]

(2) [السنن الکبریٰ (ج٧ص٤٨١)]

گھریلو نظم ونسق اور بیٹے کا مال:

ہمارے ہاں مشترکہ رہائشی سسٹم ہے، جس میں گھر کا سربراہ عام طور پر والد ہی ہوتا ہے اور وہی گھریلو اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتا ہے پھر بڑا بچہ بھی ہوش سنبھالنے کے بعد اس ذمہ داری میں والد کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے سبھی افراد قربانی دے کر گھر کے کسی فرد (عام طور پر بڑے لڑکے) کو نوکری یا کاروبار کے قابل بناتے ہیں، یا وہ خود ہی محنت کر کے اچھا کمانے کے قابل بن جاتا ہے، چنانچہ اس کی آمدن کو گھریلو اخراجات میں اسی طرح استعمال کیا جانے لگتا ہے جس طرح والد کی آمدن کو کیا جاتا تھا۔ اسی کی آمدن سے بہنوں کی شادیاں اور چھوٹے بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کیے جاتے ہیں، اسی کی کمائی سے گھر کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں اور اسی کی کمائی سے گھر کی مرمت یا مزید تعمیر وغیرہ کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ مشکل حالات تو اس طرح کاٹ لیے جاتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہی سب سے بڑا لڑکا یہ جھگڑا لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ میں نے باپ کے کاروبار میں اس کا ساتھ دیا، دن رات ایک کر کے مال کمایا، سارا مال بہنوں کی شادیاں کرنے، پلاٹ لینے اور گھر بنانے میں لگا دیا، اب اسی مال میں سے مجھے بھی باقی بھائیوں جتنا حصہ کیوں ملے حالانکہ میری تو محنت بہت زیادہ تھی، اس لیے مجھے وراثت سے زیادہ حصہ دیا جائے یا پھر مجھے میری ساری آمدنی کا حساب دیا جائے۔ نتیجۃً گھر میں مالی حقوق کی جنگ کھڑی ہو جاتی ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ مشکل حالات میں بڑے لڑکے پہلے ہی اس خوف سے والدین سے علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ کہیں ہمارا مال گھر کی مشترکہ ضرورتوں پر استعمال نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنا کماتے اور اپنا کھاتے ہیں۔ باقی گھر والوں کی کیا حالت ہے، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس کا بھی نتیجہ سوائے باہمی نفرت اور بغض وعداوت کے اور کچھ نہیں نکلتا۔

اگر بڑا لڑکا والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہو تو بعض اوقات وہ اس سارے کاروبار پر خود قبضہ جما لیتا ہے اور باقی بہن بھائیوں کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیتا۔ چنانچہ بہن بھائیوں میں نہ ختم ہونے والی لڑائیاں اور دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جھگڑے کا حل...... باپ کے لیے تجاویز:

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں اس طرح کے لڑائی جھگڑے پیدا نہ ہوں اور ہر ایک کو اس کا حق بھی ملے تو ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں درج ذیل اصولوں پر عمل کرنا چاہیے:

☆......والد کو چاہیے کہ تمام بچوں کے ساتھ منصفانہ سلوک اختیار کرے۔ کسی بھی مالی معاملے میں دیگر بہن بھائیوں کی رضامندی کے بغیر کسی ایک بچے کو دوسروں پر ترجیح نہ دے۔

☆......اگر کسی بچے پر معاشی نقطہ نظر سے زیادہ خرچہ کرنا مقصود ہو تو اس کی وضاحت کر دے کہ اتنی رقم ہم تم پر خرچ کریں گے اور اس کے بدلے تمہیں فلاں فلاں گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنا ہوں گی۔

☆......اگر کسی بچے کو کاروبار کے لیے رقم دینی ہو تو اسے واضح کر دیں کہ یہ تم پر قرض ہے اور اگر اسے ہدیہ کرنا مقصود ہو تو دیگر بچوں کو بھی اسی جتنا ہدیہ کریں۔ ورنہ انہیں اس عمل پر دل سے راضی کر لیں۔

☆......اگر کسی بچے کو اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کریں تو معمول کے مطابق اس کی تنخواہ یا فیصدی حصہ الگ سے مقرر کر دیں۔ اور کاروبار کا پورا ریکارڈ مرتب کروائیں تاکہ کل کو وہ اس پر قابض نہ ہو جائے بلکہ باقی اولاد بھی اس میں سے اپنا وراثتی حصہ لے سکے۔

میرے پاس ایک شخص آیا، اس نے بتایا کہ میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں۔ کاروبار پر سارا کنٹرول تو میرے والد کا ہے جبکہ مجھے وہ اس میں سے ایک عام ملازم جتنا معاوضہ بھی نہیں دیتے۔ اس نے کہا کہ میں شادی شدہ ہوں، رہائش مشترکہ ہے اور کھانا پینا اکٹھا ہے۔ لیکن مجھے میری محنت کا جو حصہ بنتا ہے میرے والد قصداً مجھے اتنا نہیں دیتے۔ میرے لیے بڑی مشکلات ہیں، نہ میں بچوں کو کہیں سیر تفریح کے لیے لے جا سکتا ہوں، نہ اپنی مرضی کا کھا پی سکتا ہوں، اور نہ ہی کوئی اور اضافی ضرورت پوری کر سکتا ہوں۔ کئی مرتبہ میں نے اپنے والد سے کہا ہے کہ میں یہ کام چھوڑ کر اپنی مرضی سے کہیں اور کام کرنا چاہتا ہوں مگر میرے والد نہیں مانتے بلکہ الٹا مجھے گھر سے نکال دینے اور عاق کر دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے کہا: پہلے آپ بتائیے کہ آپ کے ذہن میں کیا خیال ہے؟

اس نے کہا: میں آپ کو صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ میرے ذہن میں کیا خیال ہے۔ میں یہ سوچ

رہا ہوں کہ والد کے ظالمانہ رویے کو فی الحال برداشت کرلوں کیونکہ میں کہیں اور جا نہیں سکتا۔ البتہ جب والد کی وفات ہوگی تو اس سارے کاروبار پر قبضہ جمالوں گا۔ کیونکہ اس کاروبار کی باریکیاں بھی میں سمجھتا ہوں اور خرچ و آمدن کا سارا ریکارڈ بھی آہستہ آہستہ میرے قبضہ میں آرہا ہے۔ میں ایسی شاطرانہ چال کھیل کر اس کاروبار پر قابض ہو جاؤں گا کہ دوسرے بہن بھائی کچھ نہیں کرسکیں گے۔

اس کا یہ جواب سن کر میں نے اسے سمجھایا کہ یہ شیطانی چالیں ہیں جن کا آخرت میں بھی تمہیں حساب دینا ہوگا اور اس دنیا میں بھی اس ظلم پر سزا مل کر رہے گی۔ اس لیے والدین سے سمجھوتہ کر کے چلو کیونکہ ان کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔ اور اپنے قریبی عزیزوں کی بھی اس مسئلہ میں مدد لو کہ وہ آپ کے والد کو سمجھائیں اور اگر پوری کوشش کے باوجود والد نہیں مانتا تو نہایت شریفانہ طریقے سے اپنا کاروبار یا ملازمت الگ کرلو۔

بیٹے کے لیے تجاویز:

شروع میں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ مستقبل میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی بڑی لڑائیوں کا سبب بن جائیں گی۔ اس لیے بچوں کو بھی اس سلسلہ میں درج ذیل تجاویز مدنظر رکھنی چاہییں:

☆......والدین کی اطاعت وفرمانبرداری سے اس وقت تک انکار نہ کریں جب تک کہ ان کا حکم اسلامی تعلیمات کے منافی اور صریح ظلم پر مبنی نہ ہو۔

☆......والدین کی آمدن کا کوئی معقول ذریعہ نہ ہو، تو ان کے کھانے پینے اور رہائش وغیرہ کے اخراجات کا بندوبست بیٹوں پر اسی طرح فرض ہے جس طرح بچپن میں ان کا خرچ ان کے والد پر فرض تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں ان پر حسبِ ضرورت مال خرچ کریں خواہ آپ کی کمائی تھوڑی ہو یا زیادہ۔

☆......اگر آپ کا کاروبار والد صاحب کے ساتھ ہو تو اس کی تقسیم اس انداز سے رکھیں کہ آپ کا حصہ الگ رہے اور والد صاحب کا الگ۔ اور اگر آپ کی آمدن کے ذرائع اور ہوں تو والدین کو گھریلو اخراجات کے علاوہ جو رقم دیں، اس کی وضاحت کر دیں کہ یہ رقم ان کے لیے بطور ہدیہ ہے، یا امانت یا آپ یہ رقم انہیں بطورِ قرض دے رہے ہیں۔ بلکہ کوشش کریں کہ اس چیز کو تحریر میں لے آئیں کیونکہ یہ قرآنی حکم بھی ہے اور اس میں کل کو پیدا ہونے والے کئی جھگڑوں کا سد باب بھی ہے۔

☆......اگر بالفرض آپ کی کمائی سے والدین نے اپنی ذاتی گھریلوضروریات بھی پوری کی ہوں اور دیگر بہن بھائیوں پر بھی اس میں سے صرف کیا ہوتو اس بات کو جھگڑے کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ یہ سوچیں کہ والدین نے عیاشی کر کے اس رقم کو ضائع نہیں کیا بلکہ آپ ہی کے ضرورت مند بہن بھائیوں پر اسے خرچ کیا ہے۔ آپ اس پر خوشی محسوس کریں گے تو والدین بھی آپ سے خوش ہوں گے اور والدین خوش ہو کر آپ کے لیے دعائیں کریں گے جن کا فائدہ اس دنیا میں بھی آپ کو ہوگا اور آخرت میں بھی۔



[2]......سارا مال صدقہ یا ہبہ کرنا

انسان اگر غنی ہو اور اپنی ذاتی ضروریات سے اضافی مال و دولت رکھتا ہو تو اس پر صاحبِ نصاب ہو جانے اور زکوٰۃ کی شرائط پوری ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال کا ایک متعین حصہ ہر سال ادا کرنا فرض ہے اور اسے زکاۃ کہا جاتا ہے۔ زکاۃ چونکہ اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے، اس لیے زکاۃ فرض ہو جانے کے باوجود جو شخص زکاۃ ادا نہیں کرتا وہ سخت گنہگار ہے بلکہ اس کا ایمان ہی خطرے میں ہے اور حاکمِ وقت زبردستی بھی اس سے زکاۃ وصول کر سکتا ہے۔

زکاۃ کے بعد اسی نوعیت کی دوسری چیز صدقہ ہے یعنی انسان اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے مال میں سے جتنا چاہے اللہ کی راہ میں غریبوں، یتیموں، مجاہدوں اور دیگر ضرورت مندوں پر خرچ کرے۔ اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو اس کی اسے آزادی ہے بلکہ بعض صورتوں میں ایسا کرنا مستحب ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جنگِ تبوک کے موقع پر اپنا سارا مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

البتہ بعض صورتوں میں یہی عمل مکروہ (ناپسندیدہ) اور بعض میں حرام ہو جاتا ہے مثلاً ایک مالدار شخص کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں مگر وہ ان سب کے حقوق کی پروا کیے بغیر اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دے تو یہ ناپسندیدہ امر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ایسا ایک واقعہ پیش آیا کہ لوگوں نے نیکی کے جذبے سے سارا مال صدقہ کر دیا اور اپنے اہل و عیال کی پروا نہ کی، مگر آنحضرتؐ نے ان کے اس عمل پر ان کی سرزنش کی۔ چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''ایک شخص کے پاس چھ غلام تھے اور ان کے علاوہ اس کے پاس اور مال نہ تھا۔ وفات کے وقت اس نے ان چھ کے چھ غلاموں کو (اللہ کی راہ میں) آزاد کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام غلام واپس منگوائے اور ان کے درمیان قرعہ اندازی کر کے دو کو آزاد کر دیا اور باقی چار کو دوبارہ غلام بنا دیا۔''(۱)

---

(۱) [سنن ابو داؤد: کتاب العتق: باب فیمن اعتق عبیداله .... (ح۳۹۵۸) مسند احمد (ج۵ ص۳٤۱)]

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ
''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! میں ایک مالدار آدمی ہوں جبکہ میرے پیچھے میری وارث صرف میری ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنے مال کا دو تہائی حصہ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں؟''

آپؐ نے فرمایا: ''نہیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دوبارہ عرض کیا کہ ''میں اپنے مال کا نصف حصہ صدقہ کر دوں؟''

آپؐ نے فرمایا: ''نہیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تیسری مرتبہ عرض کیا: ''کیا میں اپنے مال کا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دوں؟''

تو آپؐ نے فرمایا:

((اَلثُّلُثُ! وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْ وَرَثَتَکَ اَغْنِیَآءَ خَیْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ))[1]

''ہاں تم ایک تہائی حصہ صدقہ کر سکتے ہو مگر سنو یہ ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے اور تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر مرو تو یہ اس بات سے بہتر ہے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ کر مرو کہ وہ بے چارے لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں!''

ہمارا طرزِ عمل:

ہمارے ہاں مالی معاملات کے حوالے سے ایک غلط طرزِ عمل یہ پایا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے باپ اپنا سارا مال کسی خیراتی ادارے کے نام وقف یا مستحقین میں صدقہ کر دیتا ہے۔ ایسا یقیناً نیکی کے جذبہ سے کیا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال صدقہ کیا جا سکتا ہے لیکن بعض لوگ ان احادیث سے ناواقفیت کی بنا پر ان کی مخالفت کر گزرتے ہیں بلکہ کوئی انہیں سمجھانے کے لیے اگر یہ کہے کہ آپ کی اولاد مستحق ہے لہٰذا آپ ان کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جائیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ......

(۱) [بخاری: کتاب الجنائز: باب رثاء النبیؐ سعد بن خولۃ (ح ۱۲۹۵) مسلم (ح ۱۶۲۸)]

''ان کا اللہ مالک ہے جب یہ پیدا ہوتے وقت خالی ہاتھ اور ننگے جسم آئے تھے اور اللہ ہی نے انہیں اب تک نوازا ہے، تو آگے بھی اللہ ہی انہیں نوازے گا......''

یہ بظاہر 'تَوَکُّل' کا اظہار ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ ہم ظاہری اَسباب کو خود اپنے ہاتھوں تلف کر دیں اور اللہ پر توکل کر کے بیٹھ جائیں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ بات اہم ہے کہ اس طرزِ عمل میں گزشتہ بیان کی جانے والی صحیح احادیثِ رسول کی مخالفت کا ارتکاب ہوتا ہے کیونکہ جن لوگوں نے اپنی اولاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مالوں کا بڑا حصہ صدقہ کر دیا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا صدقہ محدود کر کے ایک تہائی تک کر دیا۔ لہٰذا اب شرعی حکم یہی ہے کہ موت کے وقت زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال صدقہ میں یا بطورِ ہبہ وصیت کیا جا سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ البتہ حالتِ صحت میں اس سے زیادہ مال بھی صدقہ کیا جا سکتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر سارا مال بھی صدقہ کیا جا سکتا ہے، تاہم اگر دوسری طرف اہل و عیال کمزور اور مستحق ہوں تو پھر حالتِ صحت میں بھی سارے کا سارا مال راہِ خدا میں صرف کرنا درست نہیں۔



[3]......اولاد کو 'عاق' کرنا......!

ہمارے ہاں ایک غلط رویہ یہ بھی پیدا ہو چکا ہے کہ بعض والدین اپنے کسی بیٹے کو عاق کر دیتے ہیں یعنی ان کے بارے میں یہ نوٹس جاری کر دیتے ہیں کہ ان کے معاملات کے ہم ذمہ دار نہیں اور نہ ہمارا ان سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا ہم سے کوئی تعلق۔ ہمارے مرنے کے بعد ہماری وراثت میں سے بھی انہیں کچھ نہ ملے گا۔

عاق کرنے کی بنیادی وجہ اس بیٹے کی کوئی نافرمانی ہوتی ہے۔ عاق کے سلسلہ میں دو پہلو قابل غور ہیں: ایک تو یہ کہ بیٹے کے جملہ معاملات سے بریٔ الذمہ ہونے کا اعلان اور دوسرا اسے اس کے حق وراثت سے محروم کرنے کا فیصلہ۔

عاق کی پہلی صورت:

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں یاد رہے کہ اسلام نے پہلے ہی یہ ضابطہ مقرر کیا ہوا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا شخص اس کے جرائم پر سزا کا مستحق نہیں بن سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾[الانعام۔١٦٤]

''کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

یہ مضمون قرآن مجید کی کئی ایک آیات میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی آنحضرت ﷺ نے یہ اصولی بات اس طرح بیان فرمائی ہے:

((لَا يَجْنِي وَالِدٌ عَلَى وَلَدِهِ وَلَا وَلَدٌ عَلَى وَالِدِهِ))[1]

''یعنی باپ کے جرم کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جائے گا اور بیٹے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔''

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ

(١) [ترمذی: کتاب تفسیر القرآن: باب ومن سورة التوبة (ح٣٠٨٧)]

''آنحضرت ﷺ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ کچھ (اور) لوگ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسولؐ! یہ (آپ کے پاس بیٹھے ہوئے فلاں) لوگ تو اس فلاں قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے فلاں شخص کو قتل کیا تھا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا:

((لَاتَجْنِیْ نَفْسٌ عَلٰی نَفْسٍ)) (1)

''ایک شخص (یعنی مجرم) کے بدلے دوسرے (یعنی غیر مجرم) سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔''

ہمارے ہاں چونکہ اس مسئلہ پر صحیح طرح عمل نہیں کیا جاتا اس لیے عاق کی یہ صورت پیدا ہوتی ہے مثلاً ایک شخص کوئی جرم کر کے فرار ہو جاتا ہے تو اس کی گرفتاری کے لیے یقیناً اس کے گھر والوں سے تفتیش کی جا سکتی ہے مگر اس تفتیش کی کچھ حدود ہیں جن کی ہماری پولیس لحاظ نہیں کرتی۔ اس تفتیش کے بہانے مجرم کے گھر والوں کو تنگ کیا جاتا ہے، اس کے اہل و عیال کو بلیک میل کیا جاتا ہے حتی کہ مجرم کی رشتہ دار عورتوں سے بھی مجرم کی آڑ میں انتہائی غلط سلوک کیا جاتا ہے۔ ان مسائل سے بچنے کے لیے ایک باپ اپنے اس بچے کو عاق کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جس کا رخ جرائم کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ اور اس طرح وہ اس عاق نامے کے ذریعے اس نظام کی بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ ایک مجبوری ہے۔ اگر چہ اس مسئلہ کا یہ حل اصولی نہیں بلکہ معروضی ہے، ورنہ اس کا اصل علاج ایسے غلط نظام کی کلی اصلاح ہے، جس کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں......!

عاق کے اسی پہلو کا ایک اور رُخ بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص اپنے ماتحت کنبے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کا ماتحت (یعنی بیٹا وغیرہ) اگر کسی کا نقصان کرتا ہے تو تاوان کی صورتوں میں ظاہر ہے مالی خسارہ اس کے سرپرست (باپ) کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر حالات اس حد تک بگڑ جائیں کہ اس سرپرست کے لیے اپنے ماتحت کو کنٹرول کرنا ممکن نہ رہے اور ماتحت ہو بھی صاحب شعور، تو اس کا سرپرست اسے اپنی ذمہ داری سے علیحدہ کر سکتا ہے۔

عاق کی دوسری صورت:

جہاں تک عاق کے اس پہلو کا تعلق ہے جس میں باپ اپنے بچوں کو اپنی وراثت سے محروم کرنے کا

(۱) [مسند احمد (ج ۵ ص ۳۷۷) سلسلة الاحاديث الصحيحة از علامه البانیؒ (ح ۹۸۸)]

اعلان کرتا ہے تو یاد رہے کہ عاق کا یہ پہلو شرعی اعتبار سے محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ وراثت کا جو حق اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے لیے مقرر کر دیا ہے، اسے کوئی شخص نہ ختم کر سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی رد بدل کر سکتا ہے۔ اس لیے عاق کی یہ صورت غیر شرعی ہے۔ لہٰذا اولاد کے نافرمان ہونے کے باوجود انہیں وراثت سے حصہ ضرور ملے گا، اور جہاں تک اولاد کی نافرمانی کا مسئلہ ہے تو یہ اولاد کی طرف سے ایک گناہ کا کام ہے جس پر اللہ کی طرف سے جو سزا ان کی بنتی ہے، وہ انہیں مل جائے گی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ وراثت سے محرومی کی صرف تین صورتیں ہیں جنہیں احادیث میں بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱)۔ اختلافِ دین (۲) وراثت کے لیے متعلقہ فرد (یعنی مُوَرِّث) کو قتل کرنے والا (۳) غلامی۔

غلامی کی صورت چونکہ ہمارے ہاں موجود نہیں اس لیے بقیہ دو صورتوں کے دلائل درج کیے جاتے ہیں:

۱)...... اختلافِ دین سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص کافر ہے اور دوسرا مسلمان۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے جیسا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَایَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَالْکَافِرُ الْمُسْلِمَ)) (۱)

''مسلمان کسی کافر کا اور کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔''

یعنی اگر باپ مسلمان ہے مگر اولاد کافر، تو اولاد اس مسلمان باپ کی وراثت حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اس مسلمان باپ کی وراثت مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کر لی جائے گی، اسی طرح اگر باپ کافر ہے مگر اولاد مسلمان ہے تو اس صورت میں بھی اولاد کافر باپ کی وارث نہیں بن سکتی۔ یہی حکم اس شخص کا بھی ہے جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جائے۔

۲)...... اسی طرح اگر ایک شخص وراثت کے حصول کے لیے قصداً اپنے قریبی اور مورّث رشتہ دار (مثلاً باپ، بیٹا، دادا وغیرہ) کو قتل کر دے، تو وہ اپنے مقتول کا وارث ہونے کے باوجود اس قتل کے جرم کی وجہ سے اپنے حقِ وراثت سے محروم کر دیا جائے گا کیونکہ حدیث نبویؐ ہے:

((لَایَرِثُ الْقَاتِلُ شَیْئًا)) (۲)

---

(۱) [صحیح بخاری: کتاب الفرائض: باب لایرث المسلم الکافر (ح ٦٧٦٤) صحیح مسلم (ح ١٦١٤)]

(۲) [ابو داؤد: کتاب الدیات: باب دیات الاعضاء (ح ٤٥٦٤)]

''قاتل کسی چیز کا وارث نہیں رہتا۔''

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے:

((لَيْسَ لِلْقَاتِلِ مِنَ الْمِيرَاثِ شَيْءٌ))[1]

''قاتل کو اپنے مقتول کی وراثت میں سے کچھ نہیں ملے گا۔''

عاق کرنے کے نقصانات:

عاق کی شرعی حیثیت تو پیچھے واضح ہو چکی ہے، اب یہاں ہم عاق کے چند معاشرتی نقصانات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہیں گے:

۱۔ جس لڑکے کو والد عاق کر دے، وہ پہلے سے زیادہ مجرم بن جاتا ہے، اس لیے کہ پہلے تو اسے والدین یا گھر کے دیگر بزرگوں کا کچھ نہ کچھ خوف ہوتا ہے مگر گھر سے نکال دیے جانے کے بعد وہ گھر والوں کو ہر طرح کی جواب دہی سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے اور یوں جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

۲۔ جس لڑکے کو عاق کر دیا جاتا ہے وہ عام طور پر غلط دوستوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ دن رات انہی کے ساتھ رہتا ہے، انہی کے ساتھ کھاتا پیتا ہے اور انہی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ ظاہر ہے آوارہ قسم کے لوگوں کے کام بھی آوارہ ہی ہوتے ہیں، چنانچہ غلط مجلس کے اثرات کی وجہ سے وہ بھی چور، ڈاکو اور قاتل بن جاتا ہے۔

۳۔ بعض بچے نفسیاتی طور پر کمزور ہوتے ہیں جب انہیں عاق کیا جاتا ہے تو وہ یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر نشہ کے عادی بن جاتے ہیں۔

۴۔ بعض بچے عاق کیے جانے کے بعد والدین اور بہن بھائیوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بعد میں اگر وہ شریفانہ زندگی بھی اختیار کر لیں تب بھی ان کے دلوں سے وہ میل صاف نہیں ہوتی جو والدین اور سگے بھائیوں کی طرف سے عاق کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ان معاشرتی نقصانات کے پیشِ نظر والدین کو چاہیے کہ نافرمان اولاد کو برداشت کریں اور ان کی اصلاح کی ہر ممکنہ کوشش جاری رکھیں۔

---

(۱) [ارواء الغليل ، ازعلامه البانیؒ (ح ۱۶۷۱) شیخ البانیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔]

[4]......اولاد کے مابین مالی تقسیم میں ناانصافی!

اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت پر بڑا زور دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾[النحل: ۹۰]

''اللہ تعالیٰ تمہیں عدل واحسان کرنے کا حکم دیتے ہیں۔''

عدل وانصاف کی اہمیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے آپس میں خیر سگالی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور اس کے برعکس ناانصافی اور ظلم سے باہمی طور پر نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہے۔ مالی معاملات میں بھی عدل وانصاف کی بڑی اہمیت ہے۔ والدین اگر عدل وانصاف کے ساتھ اولاد کے مالی حقوق کی پاسداری کریں تو اولاد بھی والدین کی فرمانبردار ثابت ہوتی ہے لیکن والدین ہی اگر اولاد کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کریں گے تو پھر اولاد سے حسنِ سلوک کی توقع بھی فضول ہے۔

اولاد کے ساتھ عدل وانصاف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک صحابی (حضرت بشیر رضی اللہ عنہ) نے اپنے ایک بیٹے کو غلام دیا اور باقی اولاد کو محروم رکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپ کو اس مالی عطیہ پر گواہ بنانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس صحابی رضی اللہ عنہ کی اس ناانصافی پر سخت ناراض ہوئے اور انہیں اس طرح ناانصافی کرنے سے منع کر دیا۔ یہ واقعہ کئی ایک کتب احادیث میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی **صحیح بخاری** میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے ایک تحفہ دیا اور میری والدہ عمرۃ بنت رواحۃ نے کہا کہ میں اس تحفے پر اس وقت تک راضی نہ ہوں گی جب تک آپ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنادیں۔ چنانچہ میرے والد اللہ کے رسولؐ کے پاس آئے اور عرض کیا: ''میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک تحفہ دیا ہے اور اس کی ماں کہتی ہے کہ جب تک تم اس پر اللہ کے رسول کو گواہ نہ بنادو تب تک میں راضی نہ ہوں گی۔'' (تو میں آپ کو گواہ بنانے کے لیے آیا ہوں)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے:

((اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟))

''کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو اس جیسا تحفہ دیا ہے؟''

میرے والد نے کہا: نہیں، تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

((فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ))

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔''

چنانچہ میرے والد واپس آئے اور انہوں نے وہ تحفہ مجھ سے واپس لے لیا۔[1]

صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے تحفے میں ایک غلام دیا تھا۔[2]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں حضرت نعمانؓ ہی سے مروی ہے کہ میری والدہ مسلسل ایک سال تک میرے باپ سے یہ مطالبہ کرتی رہی کہ میرے اس بیٹے (یعنی مجھ نعمان) کو اپنے مال میں سے کچھ دو، مگر میرے والد مسلسل ٹالتے رہے، پھر جب ایک سال بعد انہوں نے یہ مطالبہ پورا کر دیا تو میری والدہ نے کہا کہ اس تحفے پر اللہ کے رسول کو گواہ بناؤ گے تو میں راضی ہوں گی۔ چنانچہ میرے والد (بشیرؓ) نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اللہ کے رسولؐ کے پاس لے آئے، اس وقت میں بچہ تھا۔ جب میرے والد نے اللہ کے رسول ﷺ کو گواہ بننے کے لیے میری والدہ کی بات بتائی تو رسول اللہؐ نے فرمایا:

((يَابَشِيْرُ! اَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا؟))

''بشیر! کیا اس کے علاوہ بھی تمہارا کوئی بچہ ہے؟''

میرے والد نے کہا: ہاں، تو آپ ﷺ نے کہا:

((اَكُلُّهُمْ وَهَبْتَ لَهٗ مِثْلَ هٰذَا؟))

''کیا ان سب کو بھی تم نے اس جیسا تحفہ دیا ہے؟''

میرے والد نے کہا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَلَا تُشْهِدْنِيْ اِذًا فَاِنِّيْ لَا اَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ))[3]

---

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الھبة، باب الاشهاد فی الھبة(ح۲۵۸۷)]

(۲) [بخاری، ایضا(ح۲۵۸۶)]

(۳) [صحیح مسلم، کتاب الھبات، باب کراهة تفضیل بعض الاولاد فی الھبة(ح۱۶۲۳_۴۱۸۲)]

''پھر میرے علاوہ کوئی اور گواہ تلاش کرو، کیونکہ میں کسی ظلم پرمنی معاملے کا گواہ نہیں بن سکتا!''

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

((اَيَسُرُّكَ اَنْ يَكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟ قَالَ:بَلٰى، قَالَ: فَلَا، اِذًا))[1]

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ سب تمہارے ساتھ برابر کا حسنِ سلوک کریں؟انہوں نے کہا: کیوں نہیں، تو آپؐ نے فرمایا: پھر یہ کام نہ کرو۔'' (یعنی کسی ایک کو ترجیح نہ دو)

سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے اس شخص سے فرمایا:

((اِنَّ لَهُمْ عَلَيْكَ مِنَ الْحَقِّ اَنْ تَعْدِلَ بَيْنَهُمْ كَمَا اَنَّ لَكَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْحَقِّ اَنْ يَبَرُّوْكَ))[2]

''جس طرح ان سب پر یہ فرض ہے کہ یہ تیرے ساتھ حسنِ سلوک کریں، اسی طرح تجھ پر بھی فرض ہے کہ تو ان سب کے ساتھ عدل کر۔''

کتبِ احادیث میں مذکور اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اولاد کے درمیان مالی معاملات میں بھی ہر طرح کا عدل وانصاف ضروری ہے۔ اگر ایک بچے کو کوئی تحفہ دینا ہو تو باقیوں کو بھی اسی کے مثل تحفہ دیا جائے۔ حتی کہ تحفہ کے سلسلہ میں لڑکے اور لڑکی میں کمی بیشی بھی نہیں کی جائے گی، جس طرح وراثت میں کی جاتی ہے، کیونکہ زندگی میں دیا جانے والا مال تحفہ (ہبہ اور عطیہ) کہلاتا ہے، اس کے احکام وہ نہیں ہیں جو وراثت کے ہیں۔ [اس کی مزید تفصیل آئندہ سطور میں: ''زندگی میں وراثت کی تقسیم اور ہبہ''...... کے تحت آرہی ہے۔]



(۱) [صحیح مسلم،ایضاً(ح۱۶۲۳۔۴۱۸۵)]

(۲) [ابوداؤد، کتاب البیوع،باب فی الرجل یفضل بعض ولده(ح۳۵۳۹)]

[5]......زندگی میں وراثت کی تقسیم اور ہبہ

انسان کو جائز ذرائع سے جو مال حاصل ہوتا ہے اس پر تصرف کی اسلام اسے پوری آزادی دیتا ہے، وہ اسے اپنے ذاتی استعمال میں لائے، یا دوسروں کو اس سے نفع پہنچائے، یا محتاجوں میں اسے تقسیم کرے اس پر کوئی روک نہیں۔ البتہ مال کے بہتر استعمال کے پیش نظر اسلام چند حدود و قیود عائد کرتا ہے مثلاً:

۱)......فضول خرچی سے منع کرتا ہے۔

۲)......حرام کاموں میں مال صرف کرنے سے روکتا ہے۔

۳)......اہل وعیال اور زیر نگرانی افراد کی ضروریات کو نظر انداز کرتے ہوئے صدقہ وخیرات سے منع کرتا ہے۔

۴)......مرض الموت میں ایک تہائی سے زیادہ مال کسی کو ہبہ یا صدقہ کرنے سے روکتا ہے۔

ان حدود و قیود کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف مال کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور دوسری طرف مستحق افراد تک مال کی منتقلی کو ممکن بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ میت کے ورثاء میں وراثت کی تقسیم خود اللہ تعالیٰ نے کردی ہے۔ اولاد کو کس تناسب سے حصے ملیں گے، والدین کو کتنا حصہ ملے گا، بیوی اور شوہر کی وراثت کیسے تقسیم ہوگی، بہن بھائیوں کی وراثت کا کیا اصول ہوگا، قریبی ورثا اور دور کے رشتہ داروں میں کیا فرق ہو گا، یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ نے طے کردی ہیں۔ جس کا جتنا حصہ مقرر کردیا وہی اس کے لیے معقول تھا۔ اگر خود انسانوں پر یہ معاملہ چھوڑ دیا جاتا تو مالی تقسیم پر ہمیشہ لڑائی جھگڑا برپا ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے بچاؤ کے لیے مالی تقسیم اپنے کنٹرول میں رکھی۔

زندگی میں جائیداد کی تقسیم کیوں؟

بعض لوگ زندگی میں اپنا مال اولاد میں تقسیم کردیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس طرح ہمارے مرنے کے بعد اولاد جائیداد کی تقسیم میں جھگڑا نہیں کرے گی، بلکہ اتفاق اور محبت قائم رکھے گی۔

اولاد کو متحد و متفق رکھنے کا یہ جذبہ اگرچہ ایک نیک خواہش پر مبنی ہے، مگر اس طرح ایک مسئلے کو حل کرنے

کے لیے جو دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں، وہ اس سے کئی درجہ سنگین ہیں مثلاً:

اگر کوئی شخص زندگی میں اپنا سارا مال اولاد (ورثاء) میں تقسیم کردے تو عین ممکن ہے، اس تقسیم کے بعد زندگی ہی میں اسے کسی بیماری یا حادثہ وغیرہ کی وجہ سے مال کی سخت ضرورت پیش آجائے۔ اور اس وقت اس کے ورثاء میں سے کوئی بھی اس کا سہارا بننے کے لیے تیار نہ ہو، حتیٰ کہ سگی اولاد بھی بسا اوقات انہیں بوجھ سمجھنے لگتی ہے اور ہر ایک بچے کی کوشش پھر یہی ہوتی کہ بوڑھے اور بیمار والدین کا خرچہ کوئی دوسرا ہی اٹھائے۔ اس طرح اپنے ہاتھوں اپنا مال تقسیم کر دینے والا کروڑ پتی بھی کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کا مال اپنے کنٹرول میں ہوگا تو وہ مرتے دم تک اس سے اپنی ضروریات پوری کرتا رہے گا اور کسی کا محتاج نہ ہوگا۔

جہاں تک اولاد کو متحد و متفق رکھنے کا مسئلہ ہے، تو اس کا حل یہ ہے کہ انسان اپنی اولاد کو دینی تعلیمات سے روشناس کروائے دین پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ ان میں پیدا کرے، انہیں اس بات پر آمادہ کرے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام سے رہنمائی لیں، اور وراثت کے سلسلہ میں بھی اسلام کے طے کردہ اصولوں کے مطابق حصے تقسیم کریں۔ اولاد میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ جس قدر زیادہ ہوگا، اسی قدر لڑائی جھگڑا، حسد و کینہ اور باہمی بغض و عداوت کا خاتمہ ہوگا۔

اسی طرح باپ اپنے بیٹوں کو اس بات کی بھی تاکید کرے کہ وہ وراثت میں سے بہنوں کو بھی ان کا حصہ دیں۔ بہنوں کو حصہ نہ دینے کی وجہ سے بہت سے تنازعات جنم لیتے ہیں اور آئندہ نسلوں میں بھی نہ ختم ہونے والی نفرت کی گہری خندقیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح ایک باپ کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ وراثت کے جو حصے اسلام نے متعین کر دیئے ہیں، ان میں نہ تو کسی بچے کی نافرمانی یا فرمانبرداری کی وجہ سے کمی بیشی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی کو اس کے حصے سے کلی طور پر محروم کیا جا سکتا ہے۔ اگر زندگی میں کسی بچے نے واجبی اخراجات کے علاوہ اضافی طور پر والد کی مالی امداد کی ہو تو والد اتنا حصہ الگ سے اسے دے سکتا ہے تاہم اسے چاہیے کہ دوسرے بچوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دے۔

زندگی میں وراثت نہیں...... ہبہ دیا سکتا ہے:

اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اولاد کو اپنے مال میں سے کچھ دینا چاہتا ہے تو اسے درج ذیل صورتوں کو

مدنظر رکھنا ہوگا:

۱)...... تمام بچوں کو برابر حصہ دے، حقِ وراثت پر قیاس کرتے ہوئے لڑکی کو کم اور لڑکے کو زیادہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ زندگی میں ایک شخص اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے وہ ہبہ، تحفہ اور عطیہ ہوتا ہے وراثت نہیں۔ وراثت تو کہتے ہی اسے ہیں جو مرنے کے بعد دوسروں کو ملے۔ اور مرنے کے بعد ورثاء میں سے جس کا جو حصہ بنتا ہے، وہ خود اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا ہے۔ اس لیے مرنے والے کو اس سلسلہ میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مال اور جائیداد کے سلسلہ میں جہاں تک اولاد (لڑکی/لڑکے) کو زندگی میں برابر ہبہ دینے کا مسئلہ ہے، اس کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے ایک تحفہ دیا اور میری والدہ عمرۃ بنت رواحۃ نے کہا کہ میں اس تحفے پر اس وقت تک راضی نہ ہوں گی جب تک آپ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنا دیں۔ چنانچہ میرے والد اللہ کے رسولؐ کے پاس آئے اور عرض کیا: ''میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک تحفہ دیا ہے اور اس کی ماں کہتی ہے کہ جب تک تم اس پر اللہ کے رسول کو گواہ نہ بنا دو تب تک میں راضی نہ ہوں گی۔'' (تو میں آپ کو گواہ بنانے کے لیے آیا ہوں)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے:

((اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟))

''کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو اس جیسا تحفہ دیا ہے؟''

میرے والد نے کہا: نہیں، تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا:

((فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ))

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد میں عدل کرو۔''

چنانچہ میرے والد واپس آئے اور انہوں نے وہ تحفہ مجھ سے واپس لے لیا۔ (۱)

بعض لوگ اس شبہہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اس واقعہ میں صرف بیٹوں میں برابری کا ذکر ہے بیٹیوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ اگرچہ اس واقعہ سے متعلقہ بعض روایات میں اس

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الھبة، باب الاشهاد فی الھبة (ح۲۵۸۷)]

طرح کے الفاظ بھی ہیں:

((أَلَكَ بَنُونَ سِوَاهُ؟))......((أَكُلُّ بَنِيكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟))[1]

''کیا تمہارے اور بیٹے ہیں؟''......''کیا باقی ہر بیٹے کو بھی تم نے اسی طرح تحفہ دیا ہے جس طرح اس بیٹے نعمان کو دیا ہے؟''

لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ بیٹیوں میں اس عدل کی ضرورت نہیں کیونکہ:

☆...... بیٹے کے لفظ میں بیٹی بھی ضمناً شامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اور احادیث میں شرعی احکام کے سلسلہ میں عام طور پر مذکر کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں جبکہ مؤنث ضمناً ان میں شامل ہے۔

☆......دوسری وجہ یہ ہے کہ زیادہ مستند روایتوں میں 'ولد' کا لفظ ہے جو بیٹا، بیٹی دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ امام بخاری نے بھی 'ولد' والی روایت نقل کی ہے۔

☆......تیسری وجہ یہ ہے کہ قریب قریب تمام روایتوں میں یہ صراحت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے اس صحابیؓ سے پوچھا: ((أَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟))

''کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو اس جیسا تحفہ دیا ہے؟''

اب تمام بچوں میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں۔

☆......چوتھی وجہ یہ ہے کہ آپؐ نے اس برابری کے حکم کی ایک حکمت یہ بیان کی:

((أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟))

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ سب تمہارے ساتھ برابر کا حسن سلوک کریں؟''

اب اس حسنِ سلوک میں بھی بیٹیاں اور بیٹے دونوں کا عمل شامل ہے نہ کہ صرف بیٹوں کا۔

☆......پانچویں وجہ یہ ہے کہ بعض روایات میں آنحضرت ﷺ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ

((اِعدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ))

''اپنی اولاد کو تحفہ دیتے وقت برابری کرو۔'' [اور یاد رہے کہ اولاد میں بیٹا اور بیٹی دونوں شامل ہیں!]

---

(۱) [صحیح مسلم، کتاب الھبات، باب کراھة تفضیل بعض الاولاد فی الھبة (ح ۱۶۲۳۔ ۴۱۸۲ تا ۸۷) ایک روایت میں ہے: سَوُّوا أَوْلَادَكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلًا أَحَدًا لَفَضَّلْتُ النِّسَاءَ)) ''اولاد کو تحائف دینے میں برابری کرو۔ اگر میں کسی کو فضیلت دینا چاہتا تو عورتوں کو (مردوں پر) فضیلت دیتا۔'' فتح الباری (ج ۵ ص ۲۱۴)]

۲)......اگر باپ یہ سمجھتا ہے کہ کوئی بچہ دوسروں کی نسبت غریب، محتاج اور ضرورت مند ہے تو باقی بچوں کی رضامندی کے ساتھ وہ صرف اس اکیلے کو کوئی چیز بطورِ ہبہ دے سکتا ہے، یا دوسروں کے مقابلہ میں اسے اس کی ضرورت اور اپنی استطاعت کے مطابق کچھ زیادہ بھی دے سکتا ہے، بشرطیکہ دوسرے بہن بھائیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ بلکہ ایسی صورت میں تو دوسرے بہن بھائیوں کو بھی چاہیے کہ وہ مستحق بھائی یا بہن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔

۳)...... ماں باپ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کو کوئی چیز ہبہ کر دینے کے بعد بوقتِ ضرورت اس کی واپسی کا مطالبہ کریں جیسا کہ حضرت نعمانؓ والی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے والد نے تحفہ دینے کے بعد ان سے واپس لے لیا۔ اسی طرح بعض روایات میں صراحت کے ساتھ یہ مذکور ہے:

((لَایَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یُعْطِیَ الْعَطِیَّةَ فَیَرْجِعَ فِیْهَا اِلَّا الْوَالِدَ فِیْمَا یُعْطِیْ وَلَدَهٗ)) (۱)

''کسی شخص کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ تحفہ دے کر واپس مانگے، البتہ باپ اپنی اولاد کو تحفہ دے کر واپس مانگ سکتا ہے۔''

والدین کے علاوہ کسی اور کے لیے اپنی آزادانہ مرضی سے تحفہ دے کر واپس مانگنے کو سخت ناپسند کیا گیا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ کَالْکَلْبِ یَعُوْدُ فِیْ قَیْئِهٖ، لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ)) (۲)

''تحفہ دے کر اسے واپس مانگنے والا ایسے ہی ہے جیسے وہ کتا جو قے کر کے اسے چاٹنا شروع کر دیتا ہے، ہمیں چاہیے کہ اس بری مثال کا مصداق بننے سے بچیں۔''

۴)...... یہاں یہ بھی یاد رہے کہ وراثت اور ہبہ کے سلسلہ میں جو احکام ایک باپ کے لیے ہیں وہی ایک ماں کے لیے بھی ہیں۔ یعنی ایک ماں بھی اپنی ذاتی جائیداد میں سے کسی کو محروم نہیں کر سکتی، اگر وہ زندگی ہی میں اولاد کو کچھ دینا چاہے تو ہبہ کے اصولوں کے تحت تمام اولاد کو برابر برابر دے گی، الا یہ کہ کسی ایک کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے پر دوسرے بچے بھی راضی ہوں۔

---

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الحیل، باب فی الهبة والشفعة (ح ٦٩٧٥)]

(۲) [نسائی، کتاب الهبة، باب ذکر الاختلاف علی طاوس فی الراجع فی هبته، ترمذی، کتاب الهبة]

[6]......شادی بیاہ کے اخراجات اور لڑکیوں کا حقِ وراثت سے محرومی کا مسئلہ

والدین اور اولاد کے درمیان جو تنازعات پیدا ہوتے ہیں، ان میں شادی بیاہ کے موقع پر مالی اخراجات کا مسئلہ بھی ہے جسے عذر بنا کر لڑکیوں کو ان کے حقِ وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یوں یہ جھگڑا بہن بھائیوں سے ہوتا ہوا آگے ان کی اولاد میں بھی جڑ پکڑ جاتا ہے۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لیے والدین اور اولاد دونوں کو درج ذیل چند باتیں مدنظر رکھنی چاہییں:

☆......شادی بیاہ کا موقع ہو یا کوئی اور خوشی کی تقریب، اسلام نے ہمیشہ میانہ روی کی تلقین اور فضول خرچی کی مذمت کی ہے۔ اس لیے شادی خواہ بچے کی ہو یا بچی کی، اس موقع پر والدین کو اپنی مالی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے فضول خرچی سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے اور قرض اٹھا کر خواہ مخواہ کی جاہلانہ رسموں سے دور رہنا چاہیے۔

☆......شادی اور دیگر خوشی کے مواقع پر تحائف دینا کوئی معیوب بات نہیں مگر ہمارے ہاں لڑکیوں کو ان کی شادی کے موقع پر والدین کی طرف سے جو جہیز دیا جاتا ہے، یہ بنیادی طور پر ایک ہندوانہ رسم کی پیروی ہے۔ عام طور پر اسے تحفہ یا ہدیہ نہیں سمجھا جاتا جو خوش دلی سے دیا جاتا ہے بلکہ اسے وراثت کا بدل قرار دیتے ہوئے ایک مجبوری سمجھا جاتا ہے اور دل پر پتھر رکھ کر اس رسم کو پورا کیا جاتا ہے۔☆

☆......اگر والدین اپنی خوشی سے بچی کو جہیز دیں تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ بچی کو وراثت سے محروم کر دیں اور نہ ہی یہاں یہ دلیل کوئی وزن رکھتی ہے کہ کل کو آپ یا لڑکی کے بھائی یہ کہیں کہ ''بچی کو جہیز میں بہت کچھ دے دیا گیا تھا اس لیے اب اس کا کوئی حق باقی نہیں۔''

☆......[اس موضوع کی تفصیلات اور جہیز کی شرعی حیثیت کے حوالے سے ہماری کتاب: "جہیز کی تباہ کاریاں" کا مطالعہ مفید رہے گا۔ (مؤلف)]

یہ دلیل اول تو اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ جہیز دینا کوئی شرعی حکم نہیں ہے اور دوم اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے وراثت میں بچوں کے ساتھ بچیوں کا بھی حصہ مقرر کر دیا ہے اور وہ حصہ والد یا والدہ کی وفات کے بعد اسے لازماً ملے گا کیونکہ یہ اس کا حق ہے اور اس حق سے محرومی کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ لڑکی اپنی رضامندی سے اپنا حق چھوڑ دے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر انسان مال کا حریص ہے اور پاکستانی معاشرے میں غربت کی بڑھتی ہوئی شرح ہر شخص کو حصولِ مال پر آمادہ کرتی ہے۔

پھر بچیوں کی شادیوں کے بعد ان کی اولاد کے مسائل وغیرہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ وہاں جہیز کا دیا ہوا سامان ان مسائل کو حل نہیں کرتا بلکہ روپیہ یا زمین کا ٹکڑا ہی ان مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ اس لیے بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ننانوے فیصد لڑکیاں اپنی رضامندی سے حقِ وراثت نہیں چھوڑتیں بلکہ جو لڑکیاں اپنا یہ حق چھوڑتی ہیں ان کے پیچھے ہمارے معاشرے کی جاہلانہ رسومات کا پریشر ہوتا ہے مثلاً:

ہمارے معاشرے میں یہ ہندوانہ روایت پوری طرح سے سرایت کیے ہوئے ہے کہ لڑکی کو شادی کے موقع پر جہیز ضرور دیا جائے مگر بعد میں وراثت سے اسے کچھ نہ دیا جائے۔ اب اگر شادی کے موقع پر جہیز نہ دیا جائے تو اسے عیب سمجھا جاتا ہے بلکہ جہیز نہ ہو تو بچیوں کی شادیاں ایک سنگین مسئلہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف جن بچیوں کو جہیز ملا ہوتا ہے، وہ اگر کل کو اپنے حصۂ وراثت کا مطالبہ کریں تو ہمارا معاشرہ ان لڑکیوں کو خود غرض اور لالچی قرار دیتا ہے اور ان کے مطالبے کو کمینہ پن کا مظاہرہ کہا جاتا ہے۔ اسی طعن اور الزام سے بچنے کے لیے اکثر لڑکیاں کل کو خاموش رہتی ہیں جبکہ ان کے بھائی یہ کہہ کر کہ...... ''ہم نے انہیں جہیز دے دیا تھا''...... ان کا حصۂ وراثت انہیں نہیں دیتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہن بھائیوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت بھر جاتی ہے۔

اسی طرح ہمارے مذہبی طبقے بھی بالعموم اس مسئلے پر سکوت کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے بعض لوگ بچیوں کو وراثت سے محروم کر دینا کوئی بڑا گناہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ بعض اوقات تو اس مسئلہ پر فتویٰ دینے سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔ میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ ان کے علاقے میں ایک بہت بڑا جاگیردار ہے جس نے اپنے والدین کی ساری جائیداد پر خود قبضہ جما لیا اور غریب بہنوں کو اس سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں دی۔ جس مدرسے کے منتظم/عالم دین کو وہ زکوٰۃ وصدقات دیتا ہے، اسے اس حقیقت کا بخوبی علم ہے اور بعض لوگوں کے اصرار کے باوجود اس عالم دین نے آج تک اس جاگیردار کو دبے لفظوں میں بھی یہ نہیں

کہا کہ..... ''بھائی! اپنی بہنوں کو بھی ان کا حصۂ وراثت دو۔''

میں نے کہا: اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہی بات ہم نے بھی اس سے پوچھی تھی اور اس نے صاف طور پر یہ جواب دیا تھا کہ ''میں اس لیے فلاں صاحب کو اس حوالے سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کہیں وہ ناراض ہو گیا تو پھر ہمیں چندہ کون دے گا!''

غور کریں جن علماء کی یہ سوچ ہو وہ دین کی خاک خدمت کریں گے.....!

میں کہتا ہوں ایسا شخص اگر مر جائے تو اہلِ علم کو اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھنا چاہیے کیونکہ وہ والدین کی جائیداد پر قبضہ جما لینے کی وجہ سے بہنوں کا مقروض ہے اور نبی اکرم ﷺ نے مقروض شخص کا جنازہ نہیں پڑھا۔ جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ فلاں صاحب کا اس وجہ سے جنازہ نہیں پڑھا گیا کہ اس نے بہنوں کا حصہ دبا رکھا تھا، تو باقی لوگوں کو بھی خوف پیدا ہو گا اور وہ بہنوں کی حق تلفی سے بچنے کے لیے انہیں ان کے شرعی حصے سے محروم نہیں کریں گے۔ ان شاء اللہ!

اسی طرح بعض لوگ اپنی بہنوں کی شادیاں نہیں کرتے کہ کہیں کل کو یہ اپنے وراثتی حصے کا دعویٰ نہ کر دیں۔ سنا ہے سندھ کے بعض وڈیرے اسی وجہ سے لڑکیوں کی شادیاں نہیں کرتے بلکہ قرآن سے ان کی شادی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے بقول شادی نہ کرنے یا تاخیر سے اور ان کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کا مسئلہ تو حقیقت ہے مگر قرآن سے شادی والی بات ویسے ہی مشہور ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی ایک آدھ واقعہ اس طرح کا ہوا ہو۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی بات ہو اگر لڑکیوں کو ان کی وراثت سے محروم کرنے کے لیے ایسا کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے اور دنیا میں اگر ایسے ظالموں کو سزا نہ ملی تو روزِ قیامت اللہ کی عدالت سے وہ ہرگز نہیں بچ سکیں گے۔

مسئلے کا حل:

اگر والدین نے اپنے جیب خرچ سے بچیوں کو جہیز دیا تھا تو پھر لڑکوں کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ ان کی شادیوں اور ولیموں پر بھی تو والدین نے خرچ کیا تھا۔ اس لیے انہیں بھی وراثت سے اپنا حصہ چھوڑ دینا چاہیے مگر وہ تو کبھی ایسا نہیں کرتے۔ چنانچہ وراثت سے محروم کی جانے والی عورتیں دل ہی دل میں اپنے بھائیوں کے خلاف نفرت بڑھاتی رہتی ہیں اور آگے چل کر یہی نفرت بہن بھائیوں کے خاندانوں میں

سرایت کر کے مستقل دشمنی اور علیحدگی میں بدل جاتی ہے۔ ان تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل کریں اور خودساختہ رسومات سے کلی اجتناب کریں۔

اس سلسلہ میں والدین کو بھی چاہیے کہ اول تو بچوں کی شادیوں کے معاملہ میں میانہ روی اور سادگی سے کام لیں اور دوم یہ کہ اپنے بچوں کو سختی سے تلقین، نصیحت اور وصیت کر جائیں کہ وہ ان کے بعد اپنی بہنوں کو ان کے شرعی حقِ وراثت سے محروم نہ رکھیں بلکہ ہر بہن کا جو حصہ بنتا ہے، اسے وہ لازماً ادا کریں بلکہ میں تو یہ کہنا چاہوں گا کہ معاشرتی رسومات کے دباؤ کی وجہ سے اگر کوئی بہن اپنا حصہ لینے کے لیے تیار نہ ہو تو زبردستی اسے اس کا حصہ دیا جائے اور بتایا جائے کہ اگر وہ اپنا حصہ لے گی تو اس سے شریعت کے ایک حکم پر عمل ہوگا اور اس کی جگہ پھیلی ہوئی بے شمار جاہلانہ رسومات کا سد باب ہوگا۔ اور ان کی دیکھا دیکھی جو لوگ بھی ان جاہلانہ رسومات کو چھوڑ کر شریعت کے اصول وضوابط کی پاسداری کریں گے، ان کا ثواب اضافی طور پر انہیں بھی ملے گا۔

یہی وہ صورت ہے، جس میں آگے چل کر بہن بھائیوں کے خاندانوں میں نفرت اور دوری کی بجائے محبت اور صلۂ رحمی کے جذبات پروان چڑھیں گے۔ اسی میں دنیا کی بہتری اور آخرت کی کامیابی ہے۔ اللہ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!



[7]......والدین کی کمائی اگر حرام ہو؟

عقل وشعور کے اعتبار سے ہر انسان کی زندگی کے عام طور پر دو مرحلے ہوتے ہیں، غیر شعوری مرحلہ اور شعوری مرحلہ۔ غیر شعوری مرحلہ بلوغت سے پہلے کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ زندگی کے اس حصے میں انسان والدین کی پرورش میں ہوتا ہے اور والدین اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں، اللہ کے ہاں وہ اس کے جواب دہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اولاد کو حلال کی روزی کھلائیں گے تو اللہ کے ہاں اجر وثواب پائیں گے اور اگر وہ رزق کے معاملے میں حلال وحرام کی پروا نہیں کریں گے تو روزِ آخرت اس کی سزا پائیں گے۔

حلال وحرام کے اچھے اور برے اثرات جس طرح اُخروی زندگی میں ظاہر ہوں گے، اسی طرح اس دنیوی زندگی میں بھی اس کے تھوڑے بہت اثرات ضرور ظاہر ہوتے ہیں مثلاً اگر آپ اولاد کو حلال کھلائیں گے تو اولاد آپ کی فرمانبردار ثابت ہوگی اور اگر حرام کھلائیں گے تو اولاد آپ کی نافرمان نکلے گی۔ اس کے علاوہ بھی حلال وحرام کے کئی اثرات دیکھنے کو ملیں گے۔

جب تک انسان اپنی زندگی کی غیر شعوری عمر سے گزرتا ہے، تب تک اس کے اعمال کی اس سے باز پرس نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ اسے اچھے برے، خیر وشر اور نیکی وبدی کا شعور وادراک نہیں ہوتا۔ اس زندگی میں اگر کسی نے گھر میں حرام کھایا تو اس کا اس سے مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جب انسان بالغ اور صاحبِ شعور ہو جائے، نیکی اور بدی کی اسے پہچان ہو جائے تو پھر بھی اگر وہ اسی حرام پر پلتا رہا تو اسے بھی اس کا گناہ ملے گا۔

اگر کسی شخص کے ساتھ شعوری عمر میں یہ معاملہ پیش آ جائے کہ اس کے گھر میں حرام کی کمائی کا راج ہے تو اسے چاہیے کہ پہلے تو نہایت حکمت، اور ادب واحترام سے اپنے والدین اور گھر کے بڑے بزرگوں کو سمجھائے کہ حرام کے کیا نقصانات ہیں اور آخرت میں اس کی کتنی سخت سزا ہے۔ اگر والدین بار بار سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں اور اپنی روش پر قائم رہیں تو اسے چاہیے کہ اس حرام کمائی سے استفادہ نہ کرے۔ بلکہ اپنی

ضروریات کے لیے جائز ذریعہ معاش تلاش کر لے۔لیکن لڑ جھگڑ کر اپنی رہائش الگ نہ کرے بلکہ اسی گھر میں رہ کر گھر کے دیگر افراد کو وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری رکھے۔اور یہ بات یادر کھے کہ اگر صدقِ دل سے محنت کی جائے تو وہ ضائع نہیں جاتی!

اسی طرح یہ بات یادر ہے کہ اگر آپ کسی کے ہاں ملازمت کرتے ہیں اور آپ کی ملازمت کا تعلق کسی ناجائز اور غلط کام سے نہیں تو آپ اپنا حقِ ملازمت مالک سے وصول کریں گے خواہ مالک آپ کا حق ملازمت اپنی سود کی کمائی سے ادا کرے یا کسی اور ناجائز حاصل شدہ مال سے۔آپ کو اس تفتیش کی ضرورت نہیں اس لیے کہ آپ نے ایک جائز کام میں محنت کی ہے اور آپ اپنی محنت کا معاوضہ اس سے لے رہے ہیں،اس کے ناجائز کام میں اس کے ساتھ معاونت نہیں کر رہے۔خود صحابہ کرامؓ مکہ کے حرام خور کافروں اور مدینہ کے سود خور یہودیوں اور مشرکوں کے ہاں ملازمت کرتے اور ان سے اپنا حق ملازمت وصول کر کے اپنی ضروریات پوری کرتے مگر آنحضرت ﷺ نے کبھی انہیں اس طرح کی ملازمت سے منع نہیں کیا۔

ملازم اور مالک کا یہ تعلق اگر آپ اور آپ کے والد کے درمیان ہو تو پھر بھی گزارہ چل سکتا ہے کہ آپ ان کا کوئی جائز کام کر دیں اور اس کے بدلے ان سے معاوضہ وصول کر لیں۔پھر یہ رقم آپ اپنی ضروریات کے لیے استعمال میں لا سکتے ہیں۔اگر اس طرح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تو پھر بہر حال حرام سے آپ کو بچنا ہوگا،کیونکہ اسلام میں حرام کی بہت سخت مذمت کی گئی ہے۔یہاں اس سلسلہ میں دو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں،انہیں ملاحظہ فرمالیں:

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کے بارے میں فرمایا:

((اَلرَّجُلُ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَهُ اِلَى السَّمَآءِ يَارَبِّ يَارَبِّ وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذَالِكَ؟))(1)

''ایک شخص طویل سفر کر کے آتا ہے، پراگندہ بال اور غبار آلودہ حالت میں آسمان کی طرف اپنے ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے:اے پروردگار!اے پروردگار!......جبکہ اس کا کھانا حرام کا،اس کا پینا حرام کا،حرام ہی سے اس کی پرورش ہوئی،پھر بھلا اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟!''

(۱) [صحیح مسلم،کتاب الزکاۃ،باب قبول الصدقۃ......(ح۱۰۱۵)]

اس حدیث میں بیت اللہ کے سفر کا ذکر ہے، یعنی حرام کمائی والا شخص انتہائی مشقت کے ساتھ بیت اللہ پہنچے اور وہاں جا کر اللہ کے حضور دستِ دعا بلند کرے تو اس حرام کمائی کی وجہ سے وہاں بھی اس کی کوئی دعا قبول نہیں کی جاتی۔ دنیا میں حرام کمائی کی اس سے بڑھ کر اور کون سی سزا ہو سکتی ہے!

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ))

''ہر وہ گوشت (جسم) جس کی پرورش حرام سے ہوئی، جہنم کی آگ ہی اس کے زیادہ لائق ہے۔''

یہ حرام کی اخروی سزا ہے۔ اللہ ہمیں حرام سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور جو لوگ حرام خوری میں مبتلا ہو کر شیطان کے حملوں کا شکار ہو چکے ہیں، اللہ انہیں بھی ہدایت سے نوازے۔ آمین!



باب ۱۱:

مالی معاملات سے متعلقہ چند اہم سوالات

والدین کی مشتبہ جائداد اور کمائی سے استفادہ:

سوال: مدت سے جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں مگر رزقِ حرام سے اپنے آپ کو بچانے اور حلال اور طیب طریقوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں۔ ہمارا آبائی ذریعہ معاش زمینداری ہے اور مجھے یہ معلوم ہے کہ مدتوں سے ہماری زمینیں نہ تو شرعی ضابطہ کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہوئی ہیں اور نہ ان میں سے شرعی حقوق ادا کیے جاتے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مجبوراً میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے والدین سے روپیہ لیتا ہوں، اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آئندہ جو میراث مجھے ان سے پہنچتی ہے، وہ مجھے لینی چاہیے کہ نہیں؟

جواب: زمانہ جاہلیت کی جائیدادیں جو غیر اسلامی معاشی نظام میں پیدا ہوئی ہوں اور ایک سے دوسرے کو غیر اسلامی طریقوں پر منتقل ہوتی رہی ہوں، اصولاً تو ساری کی ساری مشتبہ اور غلط ہوتی ہیں، لیکن مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو ایسی جائدادیں آباؤ اجداد کے ترکہ میں پہنچی ہیں، انہیں وہ تلف کر دیں یا ان سے دست بردار ہو جائیں اور نہ انہیں یہ تکلیف دی گئی ہے کہ کسی مال کو لیتے ہوئے اس کی ابتدائی اصل کی تحقیق کریں۔ بلکہ حکم صرف یہ دیا گیا ہے کہ جب سے تم اسلام کو اپنے قانونِ زندگی کی حیثیت سے قبول کر رہے ہو اس وقت سے کوئی مال تمہارے پاس نہ تو ناجائز طریقہ سے آئے اور نہ کسی ناجائز راستے میں جائے اور یہ کہ جتنے تصرفات اس میں آئندہ تم کرو وہ سب شریعت کے مطابق ہوں۔ رہے سابق کے اہلِ حقوق تو اگر وہ موجود ہوں اور ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو ان کے حق انہیں ادا کر دیئے جائیں ورنہ ایسے اموال کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوئے آئندہ جن جن لوگوں کے حق ان اموال میں پیدا ہوں وہ ادا کیے جاتے رہیں۔[1]

(۱) [ترجمان القرآن، جنوری، فروری ۱۹۴۵ء۔ بحوالہ: رسائل و مسائل (حصہ اول، صفحہ ۸۹، ۹۰)]

بیرونِ ملک ملازمت کرنے والا بیٹا وراثت سے محروم کیوں؟

سوال: میرے والدین کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں، میں سب سے بڑا ہوں۔ حال ہی میں اب میں چھٹیوں کے دوران گھر گیا تو پتا چلا کہ والد نے اپنی تمام جائیداد دونوں چھوٹے بھائیوں کے درمیان تقسیم کردی ہے۔ جب میں نے اپنے حصہ کے بارے میں دریافت کیا تو بتایا گیا کہ چونکہ میں سعودی عرب میں اچھی خاصی تنخواہ پا رہا ہوں اس لیے مجھے جائیداد میں حصہ دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

انہوں نے کہا کہ تمہیں جائیداد میں سے کسی حصے کی ضرورت نہیں ہے۔ والد کے اس فیصلے سے مجھے دکھ ہوا کیونکہ میں ایک بڑے خاندان کا کفیل ہوں، میرے چھ بچے ہیں۔ والد نے تجویز کیا کہ اگر میں انہیں ایک بڑی رقم دے دوں تو وہ اپنے فیصلے میں ضروری تبدیلی کردیں گے۔ ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ یہاں یہ نشان دہی مناسب ہوگی کہ میرے والد کو میرے دادا سے کچھ جائیداد ورثہ میں ملی تھی اور کچھ جائیداد انہوں نے بعد میں خریدی۔

مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ والد کا یہ فیصلہ، جسے والدہ کی تائید حاصل ہے، کس حد تک صحیح ہے؟ کیا اس بات کا امکان ہے کہ میرے والد کو میرے دادا کے ورثہ میں جو جائیداد ملی ہے، میں اس میں سے اپنا حصہ حاصل کرسکوں؟ والد نے بعد میں جو زمین خریدی ہے کیا میرا اس پر بھی کوئی حق ہوگا؟ کیا والدین کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے ورثہ میں سے ایک بیٹے کو محروم کردیں؟ اس بارے میں اسلامی قانون کیا ہدایت کرتا ہے؟ براہِ کرم ان مسائل پر روشنی ڈالیے۔

جواب: میرے خیال میں پہلے ہمیں اس معاملے کے قانونی پہلو واضح طور پر سمجھ لینے چاہییں کیونکہ آپ کے والد نے اپنی زندگی میں بہ قائمی ہوش وحواس اپنی جائیداد، دو بیٹوں میں تقسیم کردی ہے اور وہ قانونی طور پر دو بیٹوں کے نام منتقل ہوچکی ہے، جس کا اندراج سرکاری ریکارڈ میں بھی ہوگیا ہے، اس لیے آپ کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ آپ ان کے اس فیصلے کو چیلنج کرسکیں۔ اگر آپ اس معاملے کو عدالت میں لے جائیں گے تو آپ کے حق میں فیصلہ ہونے کے اِمکانات بالکل نہیں ہوں گے۔ اس کے نتیجہ میں تلخی بھی بڑھے گی اور خاندان کے درمیان تفاوت بھی پیدا ہوگا۔ چونکہ جائیداد کی یہ منتقلی رجسٹرار کے یہاں رجسٹرڈ ہوچکی ہے اس لیے والد کی وفات کے بعد بھی آپ اس پر کوئی حق ثابت نہیں کرسکتے۔ لہذا اس معاملے کے قانونی پہلو تو آپ بھول جائیے۔

غالبًا آپ کے والد نے یہ فیصلہ کرتے وقت یہ سوچا ہوگا کہ چونکہ آپ سعودی عرب میں خاصے عرصے سے کام کررہے ہیں، اس لیے مالی طور پر اپنے بھائیوں کے مقابلے میں خاصے خوشحال ہیں اور انہوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ وہ اپنی زمین دونوں بیٹوں کو دے دیں۔ آپ کے خط کے مطابق، وہ لوگ کاشت کرتے ہیں۔ غالبًا والد نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ان کی بیٹیاں شادی کے بعد اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی اس لیے زمین ان کے استعمال کے قابل نہیں ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی دانست میں مناسب فیصلہ کیا۔ ان کا فیصلہ کس حد تک منصفانہ ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کا فیصلہ قطعی غلط ہے۔ اولاد کے ساتھ برابری کے برتاؤ سے متعلق مسائل آتے رہتے ہیں اور میں نے ان کے جواب دیتے وقت مستند حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو ایک عام حکم دیا ہے:

''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کرو۔''

بالفاظ دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کو ان فرائض میں شامل کیا ہے جو انسان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد ہیں اور جو تقویٰ میں شامل ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور مستند حدیث کا حوالہ بھی دیتا ہوں، جو احادیث کے بیشتر مجموعوں میں شامل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نوجوان صحابی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ ان کے والد انہیں (یعنی حضرت نعمانؓ) کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ

''میں نے ایک غلام، اپنے اس بیٹے کو بطور تحفہ دیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر گواہ ہوں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو یہی تحفہ دیا ہے؟''

جب حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے والد نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے اس فیصلے کے لیے کوئی اور گواہ تلاش کرو کیونکہ میں کسی غیر منصفانہ عمل کی گواہی نہیں دیتا۔

یہ حدیث بعض اضافوں کے ساتھ کئی جگہ بیان کی گئی ہے، جس کے مطابق جب حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے والد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال کا جواب انکار میں دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ''یہ تحفہ واپس لے لو۔''

بعض جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے (حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے والد سے) کہا کہ ''یہ صحیح نہیں ہو سکتا اور میں کسی ایسی بات کا گواہ نہیں بنتا جو صحیح نہ ہو۔''

یہ حدیث نہایت واضح ہے۔ اس کی بناء پر بیشتر علماء نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ باپ کے لیے یہ جائز نہیں ہے

کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہوئے کوئی تحفہ دے۔ اگر وہ ایک بچے کو کوئی تحفہ دیتا ہے تو اسے دیگر بچوں کو بھی ویسا ہی تحفہ دینا چاہیے۔ تحفہ کا معاملہ بیٹے اور بیٹی کے لیے ورثہ کی تقسیم کے اصول سے مختلف ہے جس میں ہر لڑکے کو والد کے ترکہ میں سے، ہر لڑکی کے مقابلے میں دوگنا حصہ ملتا ہے۔ جو حدیث بیان کی گئی ہے، اس میں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح فیصلہ کے بعد حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو تحفہ میں دیا گیا غلام واپس لے لیا تھا۔

حضرت سعد بن عبیدہ رضی اللہ عنہ انصار کی نمایاں شخصیت تھے اور خاصے مالدار آدمی تھے ایک دن انہوں نے اپنی تمام دولت اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ یہ واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پیش آیا۔ ایک صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں رات بھر سعد کے نومولود بچے کے بارے میں سوچتا رہا اور اس وجہ سے سو نہ سکا، کیونکہ اس نومولود کے لیے اس کے باپ نے کوئی ترکہ نہیں چھوڑا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میرا بھی یہی حال ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سعدؓ کے بیٹے قیس کے پاس چلیں اور اس سے اس کے سب سے چھوٹے بھائی کے بارے میں بات کریں۔ دونوں بزرگ حضرت قیس رضی اللہ عنہ کے پاس گئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک تھے اور نہایت ذی وقار شخص تھے۔ جب یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

''والد نے جو کچھ کیا ہے میں اسے غلط قرار نہیں دے سکتا لیکن میں یہ چاہوں گا کہ آپ دونوں اس بات پر گواہ رہیں کہ میں اپنا حصہ، اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو دے رہا ہوں۔''

یہ واقعہ اس افہام و تفہیم کی عکاسی کرتا ہے جو صحابہ کرامؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے حاصل کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باپ کی وفات کے بعد ایک نومولود بچے کے لیے اس قدر فکر مند رہے کہ رات کو سو نہ سکے۔ یہ دونوں بزرگ یہ چاہتے تھے کہ نہ صرف ایک نومولود بچے کے ساتھ انصاف ہو بلکہ اس کے باپ کے ساتھ بھی انصاف ہو، جسے شاید اپنی دولت کی تقسیم کے وقت یہ علم نہ ہو کہ اس کی بیوی حاملہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دولت کی تقسیم حمل ٹھہرنے سے پہلے عمل میں آئی ہو۔ لیکن یہ بات اس امر میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کہ باپ کا ہر بچے کے ساتھ یکساں سلوک ہو۔ اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ اس واقعہ میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا عمل بھی نہایت اہم

ہے۔انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات پر اعتراض نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے یہ دلیل دی کہ دولت کی یہ تقسیم بچے کی ولادت سے پہلے عمل میں آئی تھی اس لیے انہیں اور ان کے بھائیوں کو جو کچھ ملا، وہ درست ہے۔انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو تسلیم کیا، ایک فرمانبردار بیٹے کا طرز عمل اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے باپ کے عمل کو درست قرار دیا۔لیکن اپنے نومولود بھائی کے ساتھ انصاف کا تقاضا پورا کرتے ہوئے اپنا تمام حصہ اس کے نام کر دیا۔یہ رویہ، اس سے کہیں زیادہ تھا جس کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی۔

درج بالا واقعات اور احادیث سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وراثت اور اولاد کے ساتھ یکساں سلوک کے معاملے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کس نظر سے دیکھتے تھے اور کس طرح اس پر عمل کرتے تھے۔ان واقعات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی بھی مسلمان کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور ہدایات سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے اور اپنی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

اس تفصیلی بحث کے بعد میں آپ کے سوالات کے مختصر جوابات دوں گا۔سب سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ آپ کا، آپ کے والد کی جائیداد پر یا اس کے کسی حصے پر کوئی حق نہیں ہے۔یہ آپ کے والد کا حُسنِ عمل ہوگا کہ آپ کو بھی دوسرے بہن بھائیوں کی طرح برابر کا حصہ ملے۔اگر آپ کے والد نے اپنی زمین تقسیم نہیں کی ہوتی تو کسی بھی بچے کا اس زمین پر اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے، جب تک والد حیات ہیں۔والد کی وفات کی صورت میں بیٹوں اور بیٹیوں کو ورثہ میں ان کا حصہ ملے گا۔

اپنے دادا کے ورثہ پر بھی آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔آپ کے دادا کا جب انتقال ہوگا تو ان کا ترکہ دادا کی اولاد میں قانونی وراثت کے مطابق تقسیم ہو گیا ہوگا۔پوتے کی حیثیت سے آپ کا اپنے دادا کے ترکہ پر کوئی حق نہیں ہے۔

جہاں تک یہ معاملہ ہے کہ والدین جائیداد کی تقسیم میں اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کا حق تسلیم نہیں کرتے، تو یہ رویہ اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔نہ ہی کوئی باپ اپنے ترکہ میں سے اپنے کسی بچے یا وارث کو محروم کر سکتا ہے۔وراثت کا قانون اور اس کا نظام اللہ تعالیٰ کا طے کردہ ہے جس نے ہر وارث کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے۔

میں اس بات کی بھی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ آپ نے اس مسئلہ پر اپنے والدین سے سخت

لہجے میں گفتگو کی ہو۔ممکن ہے وہ آپ سے تعاون کے رویہ کی توقع کر رہے ہوں اور آپ نے اس کے برخلاف ان کے فیصلے پر شدید نکتہ چینی کی ہو۔ میں بطور مشورہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اوپر بیان کئے گئے واقعات میں سے، آپ کو حضرت قیس رضی اللہ عنہ کی مثال پیشِ نظر رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ آپ کو اپنے والدین کے حق میں زیادہ فرمانبرداری کا ثبوت دینا چاہیے۔ اگر آپ اپنے والدین کی رضا کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور آپ کے اس رویہ سے وہ خوش ہوں تو آپ اللہ سے اس کے بہتر اجر کی توقع کر سکتے ہیں اور یہ یقین کر سکتے ہیں کہ آخرت کی زندگی میں آپ کا یہ حسنِ عمل اجر کا مستحق ہوگا۔

مجھے جس بات نے فکرمند کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس طویل خط میں آپ نے اپنی پانچ بہنوں کے حق کا ذکر نہیں کیا۔ میں پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ والدین /خواہ باپ خواہ ماں، جب اپنے بچے کو کوئی تحفہ دیں تو انہیں اپنے دوسرے تمام بچوں کو بھی ویسا ہی تحفہ دینا چاہیے۔ پھر اس معاملے میں آپ کی پانچ بہنوں کے حق کی فکر کسی نے کیوں نہیں کی؟ شاید اس لیے کہ ان کی شادیاں ہو چکی ہیں؟ یا شاید اس لیے کہ عورتوں کو زمین میں حصہ نہیں ملنا چاہیے؟ کیا آپ کے معاشرے میں یہی رواج ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں واضح طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ روایت اسلام کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اگر آپ کے والدین صحیح طریقے پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے گناہ سے بچنا چاہتے ہیں تو آپ کے والد کو چاہیے کہ وہ اپنے بیٹوں سے زمین واپس لیں اور اسے دوبارہ اپنی آٹھ اولادوں میں برابر تقسیم کریں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ زمین واپس لے لیں لیکن اسے دوبارہ تقسیم نہ کریں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے آٹھوں بچوں کو شریعت کے مطابق زمین سمیت، وراثت میں سے حصہ مل جائے گا، جو ہر لڑکی کو ایک اور لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دو حصے کے مساوی ہوگا۔ اب جب کہ آپ کو اس مسئلہ کے اسلامی حل کا علم ہو گیا ہے تو شاید آپ اس کی روشنی میں اپنے والد سے دوبارہ بات کریں۔ آپ کو اپنی بہنوں کے حق کی وکالت کرنا چاہیے اور نہیں بتانا چاہیے کہ ان کا موجودہ طرزِ عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ آپ انہیں کہیں کہ آپ نہیں چاہتے کہ روزِ قیامت اللہ کی نافرمانی کے گناہ میں حشر کے میدان میں وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں۔ (۱)

(۱) [اسلامی طرز فکر (ج ۱ ص ۲۹۸ تا ۳۰۲)]

وراثہ کی تقسیم اور متبنیٰ (لے پالک) اولاد:

سوال: شادی کے بعد میں اولاد سے محروم رہا۔ گھر میں بچے کی کمی کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنی زوجہ کے خاندان میں سے ایک یتیم بچی کو متبنیٰ کرلیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میں اپنی جائیداد میں سے اس بچی کو اپنی وصیت میں سے کچھ حصہ بطور ورثہ دے سکتا ہوں؟ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ میری والدہ حیات ہیں اور چھ بہنوں اور تین بھائیوں کے علاوہ میری زوجہ بھی موجود ہیں جو میرے ورثاء میں شامل ہیں۔ ازراہِ کرم بتائیے کہ ان میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہوگا؟

جواب:

سب سے پہلے ایک اہم بات کی نشاندہی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی کے بچے کو متبنیٰ کرنے کی اسلام میں اس طرح قطعی اجازت نہیں ہے کہ متبنیٰ کرنے والا دوسرے کے بچے کو اپنا بیٹا یا اپنی بیٹی قرار دینے لگے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اپنے خاندان میں ایک یا ایک سے زائد بچوں کو خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا، پرورش کے لیے نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے بچوں کو اپنے گھر میں رکھتا ہے اور ان کی تعلیم اور پرورش کا بندوبست کرتا ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ ضرورت مند ہوں تو اللہ تعالیٰ اس نیکی کا اجر دیں گے۔ تاہم کسی بھی صورت میں وہ ان کے بچوں یا بچے کو اپنی اولاد قرار نہیں دے سکتا، نہ اسے ایسا کہنا چاہیے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نہایت واضح طور پر اس بات کا حکم دیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش دوسروں کے بچوں کو ان کے والدین کے نام سے پکاریں۔ اگر بچہ یا بچوں کے باپ کا نام معلوم نہیں ہے تو ایسے بچوں کو اپنے دینی بھائی بہنوں کی طرح سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی بچہ بالکل ہی لاوارث ہو، اس کے والدین کا کوئی اتا پتا نہ ہو، (فسادات اور جنگوں کے نتیجہ میں ایسے بچے پائے جاتے ہیں) اس صورت میں بھی ان بچوں کی پرورش کرنے والا شخص انہیں اپنی اولاد قرار نہیں دے سکتا۔ ایسے لاوارث بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت جو بھی شخص کرے گا، اللہ تعالیٰ سے اسے اس نیکی کا بہترین اجر ملے گا۔

آپ نے جس بچی کو اپنے خاندان میں شامل کیا ہے، چونکہ وہ آپ کی اولاد نہیں ہے اس لیے وہ آپ

کے ورثہ میں کسی حصہ کی حقدار نہیں ہے۔تاہم ہر مسلمان کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اپنی وصیت کے مطابق چھوڑ سکتا ہے،لیکن یہ حصہ کل ورثہ کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔یہ ایک تہائی حصہ وہ اپنی مرضی سے جس شخص یا اشخاص کو چاہے، دے سکتا ہے۔وہ چاہے تو یہ ایک تہائی حصہ خیرات کرسکتا ہے یا اپنے ان مستحق عزیزوں کی دیکھ بھال کے لیے وقف کرسکتا ہے جو قانونی ورثا میں شامل نہیں ہوتے۔اس حصہ کو کسی نیک اور فلاحی مقصد کے لیے بھی وقف کیا جاسکتا ہے یا کسی فرد واحد کو بھی دیا جا سکتا ہے۔تاہم اس مد میں زیادہ سے زیادہ حد ایک تہائی حصہ ہے۔لہذا آپ اس بچی کو اپنی جائیداد میں سے جو حصہ دے سکتے ہیں، وہ ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

جب کسی شخص کا انتقال ہوتا ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر سب سے پہلا حق کسی قرضے یا واجب الادا رقم کا ہوتا ہے جو اس شخص کے ذمے ہو۔یہ قرضہ اور ادائیگی چکانے کے بعد جو جائیداد باقی بچتی ہے، اس میں سے متوفی کی وصیت کے مطابق حصے دیئے جاتے ہیں۔وصیت پر عمل درآمد کے بعد جو جائیداد باقی رہ جاتی ہے، اُسے متوفی کے قانونی ورثاء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آپ کے معاملے میں آپ کی زوجہ اور والدہ آپ کی جائیداد کے ورثہ میں اللہ کے بتائے ہوئے حصے کے مطابق حقدار ہیں۔چونکہ آپ لاولد ہیں اس لیے قرضوں وغیرہ کی ادائیگی اور وصیت پر عملدرآمد کے بعد باقی جائیداد میں سے آپ کی زوجہ کو ایک چوتھائی حصہ ملے گا، آپ کی والدہ کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی جائیداد آپ کے بھائیوں اور بہنوں میں تقسیم ہوجائے گی۔یہ تقسیم اس طرح ہوگی کہ باقی جائیداد کے کل ۱۲ حصے ہوں گے ہر بہن کو ایک حصہ اور ہر بھائی کو دو حصے ملیں گے۔

یہ تقسیم اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ آپ کے دیگر قانونی ورثاء مثلاً والد یا دادا حیات نہیں ہیں اور ورثہ کی تقسیم کے وقت تمام بھائی، بہن، والدہ اور زوجہ حیات ہیں۔ (۱)

غیر قانونی اولاد کا حق وراثت؟

سوال: اگر باقاعدہ نکاح سے پہلے حمل قائم ہوگیا ہے تو اس [illegible] میں بچہ اپنے والد کی وفات کے بعد والد کے ورثے کا حق دار ہوگا یا نہیں؟ اگر ورثے میں ایسے [illegible] کا حصہ ہوگا تو کیا اس کا حصہ اتنا ہی ہوگا جتنا شادی کے بعد پیدا ہونے والے اس کے دوسرے بہن بھائیوں کا ہوگا؟

(۱) [ایضاً (ج ۱ ص ۳۰۸، ۳۰۹)]

جواب:

آپ بخوبی واقف ہیں کہ نکاح سے پہلے ہر قسم کے جنسی تعلقات قطعی ممنوع ہیں ۔ یہ امر اسلامی اخلاقیات کا نہایت اہم حصہ ہے ۔ غیر شادی شدہ افراد کے درمیان جنسی تعلق اور شادی شدہ افراد کے درمیان غیر قانونی جنسی تعلق کی سزاؤں میں یہ فرق تو ہے کہ شادی شدہ افراد کے درمیان جنسی تعلق کی سزا (رجم/قتل) انتہائی سخت ہے لیکن ان دونوں سزاؤں کی نوعیت سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ جرائم انتہائی نوعیت کے ہیں۔

علاوہ ازیں، اسلامی نظام کا ایک اصول یہ ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا ذمہ دار دوسرے فرد کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اگر ایک بچہ غیر قانونی تعلقات کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے تو اسلامی اصول کے مطابق اسے اپنے والد کی غلطی کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ لیکن ایسے بچے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی ولدیت ثابت نہیں کرسکتا۔ سوائے اس کے کہ باپ خود اس بات کی تصدیق کرے۔ اگر باپ بچے کی ولدیت کا اقرار کرلے تو اس سے تفصیلات نہیں پوچھنا چاہییں کہ کن حالات کے نتیجے میں اس بچہ کی ولادت ہوئی۔ محض اس بچے کے بارے میں اس اعلان کو قبول کرلینا چاہیے کہ وہ اس کا باپ ہے۔

مثال کے طور پر ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کو لیجیے جس میں بیوی نکاح سے پہلے حمل سے تھی۔ اگر یہ جوڑا اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت مناسب اقدامات کرلے تو کوئی بھی اس بچے کی قانونی حیثیت کے بارے میں سوال نہیں اٹھائے گا اور اس صورت میں یہ بچہ اپنے والدین کے ورثہ میں اسی طرح حصہ دار ہوگا جس طرح اس کے دوسرے بہن بھائی حصہ دار ہوں گے۔ یعنی اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق والد کے ورثے میں اس بچے کو دوسرے بھائیوں کے ساتھ، بہنوں کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔ (۱)

ترکہ کی تقسیم پر تحفہ کا اثر:

سوال: ایک شخص اپنے بچوں کو کوئی تحفہ دیتا ہے، اس کی وفات کے بعد ترکہ کی تقسیم کے وقت اس چیز کا کوئی اثر ہوگا؟

جواب: مسلمانوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی رقم جہاں چاہیں خرچ کریں، بشرطیکہ یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو اور کسی ایسے شخص کے ساتھ ناانصافی نہ ہو، جس پر ان کا کوئی حق ہے۔ لہذا انہیں یہ

(۱) [ایضاً (ج۱ ص۳۱۳،۳۱۴)]

اجازت ہے کہ وہ مکان، جائیداد، گاڑی یا اسی نوعیت کی کوئی چیز خریدیں اور اسے اپنی بیوی یا شوہر یا بچوں کو تحفۃً پیش کریں لیکن اس بات میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ (اگر ایک مرد کی دوسری بیوی یا بیویاں ہیں تو) دوسری بیوی یا دوسرے بچوں کی حق تلفی نہ ہو۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں تمام ازواج کے ساتھ مساوی سلوک کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ایک سے زائد بچے ہیں تو تمام بچوں کے ساتھ برابر کا رویہ رکھا جائے۔

اگر کوئی شخص بیوی یا کسی بچے کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہوئے اسے اس قسم کا تحفہ پیش کرتا ہے جس سے دوسرے بچوں (اور بیوی) کی حق تلفی ہوتی ہے تو یہ جائز نہیں ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ ان کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام کا تحفہ دیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے اپنے تمام بچوں کو اسی طرح کا تحفہ دیا ہے؟ جب اس کا جواب نفی میں دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ اپنا تحفہ واپس لے لو۔ اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بچے خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، ان میں فرق نہیں برتنا چاہیے۔

اگر ایک شخص جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہے تو وہ اپنی دولت کو جس طرح چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ شرط وہی ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ زندگی میں کسی کو تحفہ دینے سے ترکہ کے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ترکہ کی تقسیم کسی شخص کی وفات کے بعد ہوتی ہے۔ انتقال سے پہلے ایک شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس کے کسی وارث کا اس کی زندگی میں اس کے مال میں کوئی مخصوص حصہ نہیں ہوتا، صرف زیر کفالت افراد کی ضروریات پوری ہونا ضروری ہیں۔ جن میں بیوی، بچے اور والدین شامل ہیں جن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی وصیت کے ذریعہ تحفہ دینا چاہتا ہے تو اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اسلام میں وصیت کے ذریعہ قانونی وارثوں میں سے کسی کے حق کو متاثر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وصیت کے مطابق ورثاء کو وہی حصہ ملنا چاہیے جس کا اسلام میں نہایت واضح طور پر حکم دیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنے ترکہ کا ایک تہائی حصہ اپنی وصیت کے ذریعہ دوسروں کو دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے اپنے قانونی ورثاء میں سے کسی کو اس کے جائز حصہ کے علاوہ کچھ اور نہ دیا ہو۔ بالالفاظِ دیگر کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ [ایضاً]

کسی اولاد کو وراثت سے محروم رکھنا:

سوال:

میرے والد کے چار بیٹے ہیں وہ اپنی املاک ایک سیل ڈیڈ کے ذریعہ تین بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں اور اپنے بڑے بیٹے کو کوئی حصہ دینے کے خواہش مند نہیں ہیں۔اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

میرے بڑے بھائی نے گھر میں کبھی مالی تعاون نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے ہماری بہنوں کی شادیوں یا خاندان کے دیگر معاملات میں کوئی ذمہ داری اٹھائی ہے۔مزید یہ کہ ہم تین بھائیوں نے اپنے والد کے مکان کی توسیع کے معاملے میں جسمانی اور مالی اعتبار سے حصہ لیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ میرے بڑے بھائی، والد صاحب کے ہمیشہ سے نافرمان رہے ہیں، اکثر وہ والد صاحب کے احساسات کو ٹھیس پہنچاتے رہے ہیں۔میرے والد کہتے ہیں کہ اگر وہ اپنی جائیداد اپنے چاروں بیٹوں میں یکساں طور پر تقسیم کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو وہ ان تین بیٹوں سے ناانصافی کریں گے جنہوں نے مکان کی تعمیر میں حصہ لیا۔میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ رہنمائی فرمائیں۔

جواب:

میں آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ آپ کے والد املاک کی تقسیم صرف چار میں سے تین بیٹوں کے درمیان کیوں کرنا چاہ رہے ہیں۔انہوں نے بیٹیوں کو کیوں الگ کر دیا جو میرے خیال میں شادی شدہ ہیں۔اگر ہم وراثت کی بات کرتے ہیں تو بیٹیاں خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، ان کا بھی مرحوم والدین کے ترکہ میں حصہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ تمہیں، تمہارے بچوں کے سلسلے میں (وراثت کے معاملے میں) حکم دیتا ہے کہ ایک بچہ وراثت میں دو بچیوں کے حصے کے برابر حصہ پائے گا۔" [النساء]

یہ واضح حکم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت میں ہر بیٹی کا بھی حصہ ہے۔

اگر کوئی فرد اپنے بعض بچوں کو تحفہ دے اور بعض کو نہ دے تو میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے ناانصافی قرار دیا ہے اور اس عمل پر گواہ بننے سے انکار فرمایا۔

میں آپ کے والد صاحب کے احساسات کو سمجھتا ہوں۔آپ اور آپ کے بھائیوں نے مکان کی توسیع

میں جو کچھ تعاون کیا ہے، اگر آپ کے والد اس کا صلہ نہ دیں تو یہ ناانصافی ہوگی، تاہم ناانصافی سے بچنے کے لیے یہ ہوسکتا ہے کہ آپ تینوں نے جتنا مالی تعاون کیا ہے اس کا اندازہ لگایا جائے۔ مکان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ والد صاحب کی ملکیت کہلائے گا اور بقیہ تین حصے آپ تینوں کے درمیان ہر ایک کے تعاون کے مطابق تقسیم ہوں۔ اس سیل ڈیڈ کو رجسٹر کروایا جاسکتا ہے۔

آپ کے والد صاحب کی جائیداد تقسیم کرنے کا جب وقت آئے گا تو پورے مکان کی تقسیم نہیں ہوگی بلکہ مکان کے صرف اس حصہ کی وارثوں میں تقسیم ہوگی جو والد صاحب کی ملکیت تھا۔ اس کے علاوہ دیگر تمام املاک کی تقسیم بھی اسی طریقہ کے مطابق ہوگی۔ اس طرح بڑے بیٹے کو بھی وراثت سے پورا حصہ ملے گا اور آپ کی بہنیں بھی ترکہ میں اپنے حصہ سے محروم نہیں ہوں گی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ سب اپنے والد صاحب سے مکان کا وہ حصہ بھی خرید لیں، جو ان کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن یہ حقیقی خریداری ہونی چاہیے۔ آپ کو محض علامتی ادائیگی نہیں کرنی ہوگی بلکہ مکان کی جو قیمت بازار میں ہو، اس کے اعتبار سے ادائیگی کرنی ہوگی۔ اس طریقے پر عمل کر کے آپ اسلامی قانون کے مطابق عمل کرنے میں والد صاحب کی مدد کرسکتے ہیں۔[1]

شادی ہوجانے کے بعد والدین کے حقوق:

سوال:

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اپنی شادی ہوجانے کے بعد کیا اپنے والدین کے حوالے سے مجھ پر کوئی مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ جبکہ میرے والدین کو دوسروں کا قرضہ بھی ادا کرنا ہے۔ کیا میں ان کی مالی طور پر مدد کرسکتا ہوں؟ میری اہلیہ مجھ پر اعتراض کرتی ہے، اس کا کہنا یہ ہے کہ تم اپنے والد کی مالی امداد نہ کرو، کیونکہ وہ میرے بھائی کی کسی غلطی کی وجہ سے مقروض ہوئے ہیں۔ مجھے اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب:

اپنے والدین کے قرض کی ادائیگی میں مدد کے سلسلے میں آپ کا طرزِ عمل بے حد قابلِ تحسین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ رویہ ہے جس کی توقع ہر فرض شناس بیٹے سے کی جاسکتی ہے۔ آپ اپنے والدین

---

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۳۴۴، ۳۴۵)]

کو قرض خواہوں کا سامنا کرنے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتے، جب کہ آپ کے پاس ان کی مدد کرنے کے لیے رقم موجود ہے۔

آپ کی اہلیہ کا یہ اعتراض غلط ہے کہ آپ کو اپنے والدین کی مدد نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو اپنے والدین کی مدد کرتے ہوئے ہرگز ہچکچانا نہیں چاہیے۔ جب آپ ایسا کریں گے تو نہ صرف یہ کہ آپ فرض شناسی کا مظاہرہ کریں گے بلکہ دراصل آپ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے سرمایہ کاری کریں گے۔ آپ اپنی اہلیہ کو بتا دیں کہ آپ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ جب عمر کے آخری ایام یعنی بڑھاپے میں آپ کو اپنے بچوں کی مدد درکار ہوگی، تو یہ مدد آپ کو فوراً مل جائے۔ اگر آپ اپنے والدین کی مدد نہیں کرتے تو آپ کے بڑھاپے میں آپ کے بچے پھر آپ کی مدد کیوں کریں گے!

یہ بات ممکن ہے، درست ہو کہ آپ کے والدین پر قرض کا بار آپ کے بھائی کی کسی غلطی کے باعث پڑا ہو، بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپ کے والدین قرض خواہوں کا سامنا کر رہے ہیں اور انہیں قرضے ادا کرنے ہیں۔ اگر آپ ان کی مدد کی اہلیت رکھتے ہیں تو آپ کو ان کی مدد کرنی چاہیے۔ میں آپ کو ایک حدیثِ رسول ﷺ یاد دلاتا ہوں کہ ایک بار ایک میت نمازِ جنازہ کے لیے مسجد لائی گئی۔ نبی کریم ﷺ کو علم ہوا کہ مرنے والے پر قرض تھا تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار فرما دیا، حتیٰ کہ ایک صحابیؓ نے رضا کارانہ طور پر، میت کا قرض ادا کرنے کا اعلان کیا تب نبی کریم ﷺ نے میت کی نماز جنازہ کی امامت فرمائی۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قرض کی ادائیگی کس قدر اہمیت رکھتی ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی قرض کی ادائیگی ضروری ہے۔ (۱)

بیوی کو بتائے بغیر والدین کی مالی امداد:

سوال:

میرے گھر کے بیشتر مسائل کا سبب یہ ہے کہ میرے شوہر اپنے مالی معاملات سے مجھے کبھی باخبر رکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے مجھے کبھی اجازت نہیں دی کہ میں یہ جان سکوں کہ وہ کیا کماتے ہیں، کیا خرچ کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ اپنے والدین اور اپنی ایک طلاق یافتہ بہن کی اکثر مالی امداد کرتے رہتے

---

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۲٤۸)]

ہیں۔جب بھی میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ ان کے والدین کی مالی حالت تو اچھی ہے اور انہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں تو میرے شوہر نے مجھے اور میرے خاندان والوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔اگر میں نے ان سے ان کی طلاق یافتہ بہن کی امداد کے بارے میں کبھی کچھ پوچھا تو وہ جواب دینے سے گریز کرتے رہے۔کیا یہ سب کچھ جاننے کا مجھے کوئی حق نہیں؟

میں شادی سے پہلے ملازمت کیا کرتی تھی ،جب میں پہلی بار امید سے ہوئی تو میں نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔اس پر میرے شوہر نے ،میرے پاس جتنی رقم تھی وہ سب اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لی اور اس وقت سے انہوں نے اس رقم کی ایک پائی بھی مجھے نہیں دی۔اس وجہ سے اکثر بحث وتکرار ہو جاتی ہے۔ جب کبھی اس طرح بحث چھڑتی ہے،میرے شوہر مجھ سے بول چال بند کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا ہے کہ حتی کہ دو دو،تین تین ہفتے مجھ سے ایک لفظ نہیں بولتے ،آخر مجھے ہی مصالحت کرنا پڑتی ہے۔انہوں نے کبھی بھی تصفیہ کے لیے پہل نہیں کی۔میں نے ان سے کہا کہ ایک نوکرانی رکھ لیں جو گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹا دے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔جب کبھی بحث شدید ہو جائے اور گرما گرمی کی نوبت آ جائے تو میرے شوہر نے مجھے مارا بھی ہے۔میں شادی کے اس تعلق کو توڑنا نہیں چاہتی کیونکہ میرے بچے بھی ہیں۔میں ممنون ہوں گی کہ آپ اس مسئلے میں اپنا مشورہ عنایت فرمائیں۔

جواب:

میرا خیال ہے کہ آپ کا مسئلہ براہ راست مجھ سے متعلق نہیں ہے تاہم آپ کے مسئلے کے بعض پہلوؤں کی اسلامی نقطۂ نظر سے تشریح کی ضرورت ہے،میں کوشش کرتا ہوں کہ ان پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں۔

یقیناً،آپ کے شوہر کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ آپ کی وہ رقم خود حاصل کر لیں ،جو آپ نے محنت کر کے کمائی تھی اور پھر وہ اس رقم کو اپنی ذاتی رقم کے طور پر اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر لیں جب کہ آپ نے یہ رقم تحفے کے طور پر ان کے حوالے نہیں کی تھی۔اگر یہ بات آپ دونوں کے درمیان واضح تھی کہ یہ رقم آپ ہی کی رہے گی تو یہ رقم اب بھی آپ ہی کی ہے۔آپ کے شوہر کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ آپ کو اس رقم کے حصول سے روکیں،نہ ہی وہ اس رقم کو اپنی مرضی سے خرچ کر سکتے ہیں۔آپ کے شوہر اس رقم کو اپنے خاندان کے اخراجات پورے کرنے کے لیے بھی استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کی کفالت کی ذمہ داری

ان پر ہے، خواہ آپ ان سے زیادہ دولت مند ہی کیوں نہ ہوں۔

دوسری جانب، آپ کے شوہر کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی رقم کو جس طرح چاہیں خرچ کریں، بشرطیکہ وہ آپ اور آپ کے بچوں کی دیکھ بھال اچھی طرح کر رہے ہوں۔ اگر وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اپنے والدین یا طلاق یافتہ بہن اور ان کے بچوں کی مالی امداد کے لیے خرچ کر دیتے ہیں تو اس کا انہیں پورا اختیار ہے۔ اگر وہ آپ کو یہ بات نہیں بتاتے کہ انہوں نے اپنے والدین اور بہن وغیرہ کو کتنی رقم دی ہے تو ان کا یہ فعل شرعی یا قانونی نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ طرزِ عمل ایک گھرانے کی فضا کو پُر امن بنانے میں کردار ادا نہیں کرتا لیکن اس سے کسی اصول کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان کی بیویاں، ان کے اور ان کے خاندان کے افراد کے درمیان تعلقات میں مداخلت کریں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کے شوہر نے سوچا ہو کہ اگر انہوں نے آپ کو ان کے والدین اور بہن کو دی جانے والی تمام رقم سے آگاہ کر دیا تو اس طرح زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پراسرار فطرت کے مالک ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو ان معاملات سے الگ رکھنا ان کا مقصد نہ ہو لیکن یہ ان کی فطرت ہو کہ وہ اپنے مالی معاملات کی تفصیل ظاہر کرنا پسند نہ کرتے ہوں، اب جب کہ وہ اپنی حد تک ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں، آپ کی اور بچوں کی ہر طرح دیکھ بھال کر رہے ہیں، انہوں نے آپ کو اچھا معیارِ زندگی دیا ہے تو آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ آپ اس معاملے کو اتنا سنگین مسئلہ بنالیں کہ وہ آپ کی شادی کے لیے خطرہ بن جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ جیسی تعلیم یافتہ کسی نوجوان خاتون کے لیے اس طرح کی صورت حال کو قبول کرنا دشوار ہوتا ہے کہ ایسی اطلاعات سے اسے بے خبر رکھا جائے جنہیں وہ اہم اور اپنے خاندان سے متعلق تصور کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ یہ محسوس کرے کہ اسے جان بوجھ کر الگ تھلگ رکھا جا رہا ہے۔ لیکن اس صورت حال کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کے رویے کی وجہ سے آپ کے شوہر کو یہ احساس ہو گیا ہو کہ آپ اپنے شوہر کی جانب سے ان کے خاندان والوں کی مالی امداد کی مخالف ہیں۔ آپ نے اپنے شوہر سے کہا بھی ہے کہ ان لوگوں کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے شوہر کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک فرض شناس بیٹا بن کر رہنا چاہتے ہیں اور اپنی یہ ذمہ داریاں محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اپنے والدین کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میرا خیال یہ ہے کہ مجموعی صورتِ حال کو اس حد تک بگڑنے نہیں دینا چاہیے۔ دلائل کی بار بار تکرار کرنے سے کوئی مدد نہیں ملے گی بلکہ اس سے مفاہمت کی فضا بحال ہونا نہایت مشکل ہو جائے گا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی کا اصل مسئلہ یہی ہے۔ آپس میں ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں کمی تھی، بار بار تکرار سے اس ہم آہنگی میں مزید کمی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ دونوں کی شخصیات کے درمیان تصادم کی سی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے شوہر اچھے کردار کے مالک ہیں جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں پرجوش ہیں، تاہم وہ اپنی، گھر کے سربراہ والی حیثیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور جب کبھی آپ اور ان کے درمیان تلخی پیدا ہوتی ہے اور بحث و تکرار ہو جاتی ہے تو وہ مصالحت کرنے کے لیے اس سربراہی والی حیثیت سے ذرا سا بھی ہٹنا پسند نہیں کرتے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر مرتبہ مصالحت کے لیے پہل آپ ہی کریں۔ اس معاملے میں غالباً ان کا طرزِ عمل درست نہیں۔ شاید انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا ہر مسلمان مرد کا فرض ہے۔ ممکن ہے کہ انہیں حضور ﷺ کے آخری الفاظ یاد دلانے کی ضرورت ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ نے بار بار ارشاد فرمایا:

''نماز باقاعدگی سے پڑھو۔ اپنے غلاموں کے ساتھ مہربان رہو اور ان کی صلاحیت سے بڑھ کر کوئی کام ان سے نہ کہو اور عورتوں سے سلوک کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو۔''

شاید آپ کے شوہر کو اس بارے میں مشورہ کی ضرورت ہو کہ انہیں آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر آپ کے ساتھ ان کی بحث و تکرار ہو جائے تو یقیناً انہیں آپ کو مارنا پیٹنا نہیں چاہیے۔ اگر وہ اس حد تک طیش میں آ جاتے ہیں تو انہیں اس معاملے کو اپنے بڑوں کے سامنے رکھنا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اپنے گھریلو ماحول کو نمایاں طور پر بہتر بنا سکتی ہیں۔ تاہم، اس کے لیے آپ کو سخت محنت کے ساتھ فہم و فراست اور ضبط و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ سب سے پہلے آپ اپنی ازدواجی زندگی کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔ اس کے اچھے پہلوؤں کا تعین کریں اور اپنے شوہر کی ان صفات کو تلاش کریں جو آپ کو پسند ہیں۔

آپ کے شوہر اپنے خاندان والوں کی خاموشی سے جو مالی امداد کرتے رہتے ہیں، اس کے بارے

میں اپنے ذہن میں برے خیالات نہ لائیے بلکہ اس معاملے کے خوش گوار پہلو پر غور کیجیے اور اپنے ذہن میں اپنے شوہر کو اس وجہ سے اچھا مقام دیجیے کہ وہ کتنے فرض شناس بیٹے ہیں۔

آپ اپنے شوہر کی جانب سے ان کی خاندان کے افراد کی مالی مدد کے معاملے پر بحث، طویل عرصے کے لیے ترک کر دیں حتی کہ آپ کے شوہر کو یہ احساس ہو جائے کہ آپ ان کے اس عمل کی مخالف نہیں ہیں۔ جب آپ یہ کام کر چکیں تو آپ اس کوشش کا آغاز کریں کہ آپ کے شوہر گھر میں رہ کر خوشی محسوس کریں۔ جب وہ دفتر سے گھر واپس آئیں تو وہ یہ دیکھیں کہ گھر کی تمام چیزیں قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں، آپ موزوں لباس پہن کر، خوشگوار موڈ میں، ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ خود کو اس طرح تیار کریں کہ آپ اپنے شوہر کو اچھی لگیں۔ یہ باتیں آپ کے شوہر پسند کریں گے۔

جب آپ اپنے شوہر کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھیں تو آپ دوستانہ انداز میں بات چیت کریں۔ اگر آپ کے ساتھ دن میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے اور آپ اس واقعے کو شوہر کے علم میں لانا چاہتی ہیں تو کچھ دیر کے لیے رک جائیں تاکہ آپ کے شوہر ذرا آرام کر لیں۔

کوشش کیجیے کہ گھر میں آپ کے شوہر کا وقت بہت خوشگوار گزرے۔ اس طرح ماحول تبدیل ہوگا اور آپ کے شوہر گھر پر زیادہ وقت دینے کی کوشش کریں گے۔ اپنے شوہر کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیے۔ اپنے شوہر کے سامنے ان کے خاندان کے افراد کا ذکر اس انداز سے کریں کہ انہیں خوشی محسوس ہو۔ آپ کو اس بات کی نشاندہی کرنی چاہیے کہ آپ اپنی خوش دامن (ساس) سے محبت کرتی ہیں۔ اس طرح آپ کی ازدواجی زندگی خوشیوں کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گی، لیکن میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس سارے عمل میں آپ غرور میں کبھی مبتلا نہ ہوں۔ ایک خاندانی ماحول میں غرور و تکبر کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر آپ کے شوہر آپ سے پوچھیں کہ آپ میں تبدیلی کیسے آئی تو آپ انہیں بتا دیں کہ آپ ان کے ساتھ خوش رہنے کی خواہش مند ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے یہ طرزِ فکر اپنایا تو آپ محسوس کریں گی کہ آپ کے گھر میں مثبت اور مفید تبدیلی آ رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ اپنی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار انداز میں گزار سکیں۔ آمین! (۱)

---

(۱) [ایضاً (ج۲ ص ۳۲۴ تا ۳۲۸)]

باپ کی زکوۃ سے بیٹے کی تعلیم:

سوال:

زید اپنے بیٹے کو علمِ دین سکھانا بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور وہ رمضان میں برابر زکوۃ نکالتا ہے، کیا زید کی بیوی اپنے بیٹے کو علمِ دین سکھانے کے لیے پوشیدہ طور پر زکوۃ کے پیسوں سے بیٹے کو تعلیم دلوا سکتی ہے۔

جواب:

ایک غریب شخص کا آپ نے کچھ قرض دینا ہے تو کیا زکوۃ سے آپ اس کا قرض اتار سکتے ہیں؟ یہی مثال بیٹے کی تربیت میں زکوۃ صرف کرنے کی ہے کیونکہ بیٹے کی ہر قسم کی تربیت کا حق باپ کے ذمہ ہے جو حق پہلے ہی باپ کے ذمہ ہے وہ کس طرح زکوۃ سے ادا ہوگا بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص زید کے بیٹے کی دینی تعلیم میں یا اور کسی قسم کی تربیت میں اپنی زکوۃ صرف کرنا چاہے تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اولاد اپنے والدین کے تابع ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے:

((هُمْ مِنْ آبَائِهِمْ))

یعنی اولاد اپنے آباء سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے جو چھوٹے بچے مرجاتے ہیں وہ جنتی ہیں مگر ان کا جنازہ نہیں پڑھا جاتا اور مسلمانوں کے بچوں کا پڑھا جاتا ہے پس جب اولاد والدین کے تابع ہے اور والدین صاحبِ زکوۃ ہیں جن کو زکوۃ نہیں لگ سکتی تو اولاد کو بھی (ان کی زکاۃ) نہیں لگ سکتی۔ [1]

والدین اور بہن بھائی مصرف زکوۃ ہیں؟

سوال: اگر حقیقی بھائی یا بہن فقیر یا مسکین ہو تو ان کو زکوۃ دینی جائز ہے یا نہیں۔ نیز والدین اولاد سے الگ ہوں تو ان کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ (محمد زکلس ڈاکخانہ کنگن پور ضلع لاہور)

جواب:

حقیقی بھائی بہن اگر فقیر مسکین ہوں تو ان کو زکوۃ لگ سکتی ہے بلکہ امام بخاریؒ نے باب باندھا ہے محتاج ہونے کی صورت میں زکوۃ بیٹے کو بھی لگ سکتی ہے جبکہ بیٹا جوان ہو۔ اور اپنا الگ اس کا کاروبار ہو۔ اس مسئلہ کے متعلق انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں ذکر ہے کہ ایک شخص نے صدقہ مسجد نبویؐ میں رکھا کہ

---

(۱) [فتاوی ز حافظ عبداللہ روپڑی (ج ۲ ص ۱٦٥، ۱٦٦)]

کسی مسکین کو دے دیا جائے، اتفاقاً بیٹے نے آ کر اٹھالیا۔ باپ کو پتہ لگا تو کہا کہ میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس معاملہ پہنچا تو آپ نے باپ کو کہا کہ تیرا صدقہ قبول ہے۔ [اور بیٹے سے کہا کہ جو تجھے مل گیا وہ اب تیرے لیے ہے۔]

رہے والدین تو تنگدست ہونے کی صورت میں انسان کے اہل وعیال میں داخل ہیں اور ان کا نان ونفقہ اس کے ذمہ ہے چنانچہ تین شخص کی غار والی حدیث سے واضح ہے جو **مشکوٰۃ ، باب البر والصلۃ** میں مذکور ہے، اس لیے ان کو زکوۃ نہیں لگ سکتی۔ (۱)

جس ہبہ سے شرعی وارث محروم ہوں اس کا حکم؟

سوال:

زید کا ایک لڑکا بکر اور تین لڑکیاں؛ ہندہ، کلثوم، اور خدیجہ ہیں۔ زید اپنے لڑکے بکر کے ساتھ رہتا ہے۔ بکر نے اپنی بہنوں اور اپنی لڑکیوں کو محروم الارث کرنے کے خیال سے زید پر ناجائز دباؤ ڈال کر کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو اپنے لڑکوں کے نام سے ہبہ بلا معاوضہ کرالیا۔ جس کو تقریباً آٹھ نو سال ہوگئے ہیں لیکن زید اس مکان میں بود وباش رکھتا تھا اور کبھی مکان کا تخلیہ کر کے خالی نہ کرایا۔ چند روز ہوئے کہ زید فوت ہوگیا اور مذکورہ تین لڑکیاں اور چھوٹا لڑکا چھوڑا۔ ہندہ نے جب اپنے بھائی سے ترکہ طلب کیا تو بکر نے جواب دیا کہ والد کی جو کچھ جائداد تھی خود ان کے حین حیات میں ہبہ ہو چکی ہے۔ کچھ ذاتی رقم خرچ کے لیے انہوں نے البتہ علیحدہ رکھی تھی، اس میں جو کچھ بچا ہوگا اس میں سے تم کو ملے گا۔ سوال یہ ہے:

۱۔ ایسا ہبہ جس سے وارث غیر شرعی محروم ہوں اور غیر وارث کو مل جائے جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ آیا لڑکیوں کو اپنے باپ کی میراث ملے گی یا نہیں اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اکل ولد نحلت کے ضمن میں یہ داخل ہے یا نہیں؟

۳۔ ہبہ بلا قبض کا کیا حکم ہے؟

جواب:

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تصریح ہے کہ اولاد میں عدل کرو پس ایک کے نام جائیداد کر دینی خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، یہ حدیث کے خلاف ہے۔ زید کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ تمام جائیداد بکر کے نام کرتا اور اب

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۱۶۷)]

بکر کو بھی اجازت نہیں کہ وہ اس جائیداد پر قبضہ کرے۔ تلخیص الحبیر (ص ۲۶) میں ہے:

((ان ابابکر نحل عائشة جادّ عشرین وسقا فلما مرض قال وددت انك حزتیه او قبضتیه وانما هو الیوم مال الوارث مالك فی الموطا عن شهاب بن عروة عن عائشة به واتم منه رواه البیهقی من طریق ابن وهب عن مالك وغیره عن ابن شهاب عن حنظلة بن ابی سفیان عن القاسم بن محمد نحوه وقدروی الحاكم ان النبی ﷺ اهدی الی النجاشی ثم قال لام سلمة انی لأری النجاشی قد مات ولأری الهدیة التی اهدیت الیه الا استردّ فاذا رُدّت الی فهی لك فكان كذالك الحدیث .))

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اسی من (۸۰) کھجور کا پھل ہبہ کیا۔ جب بیمار ہو گئے تو فرمایا: میں نے درست رکھا کہ تو کھجوروں کو قبضہ میں کر لیتی کیونکہ آج وہ وارث کا مال ہے۔ امام مالکؒ نے اس کو موطا میں روایت کیا ہے اور بیہقی نے بھی اس کو بطریق وھب، امام مالک وغیرہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے نجاشی رضی اللہ عنہ کو تحفہ بھیجا پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ میں دیکھتا ہوں نجاشی فوت ہو گیا ہے جو تحفہ میں نے اس کو بھیجا تھا وہ لوٹایا جائے گا پس جب واپس آئے تو وہ تیرے لیے ہے، چنانچہ اسی طرح ہوا۔''

ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوا کہ ہبہ میں قبضہ ضروری ہے اگر صرف ہبہ کر دینے سے ہبہ مکمل ہو جاتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ نہ کہتے کہ آج وہ مال کا وارث ہے نہ رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو یہ کہتے کہ جب واپس آئے تو وہ تیرے لیے ہے بلکہ اس کے حق دار نجاشی کے ورثاء ہوتے۔ (۱)

اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کے لیے عاق کرنا:

سوال:

زید کے دولڑکے جوان ہیں جن کو زید نے پرورش کرنے کے علاوہ تعلیم سے بھی بہرہ ور کروایا اور بالغ ہونے پر بہت سارو پیہ صرف کر کے ان کی شادیاں کیں۔ اب دونوں لڑکے زید سے نہایت گستاخی سے پیش آتے ہیں، فحش گالیاں دیتے ہیں، وہ زید کی جائداد سے محروم الارث ہونے کے قابل ہیں یا نہیں؟

(۱) [ایضاً ج ۲ ص ۳۲۵، ۳۲۶]

جواب: قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا اِمَّا یَبۡلُغَنَّ عِنۡدَکَ الۡکِبَرَ اَحَدُہُمَاۤ اَوۡ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا وَ اخۡفِضۡ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَۃِ وَ قُلۡ رَّبِّ ارۡحَمۡہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیۡ صَغِیۡرًا﴾[سورۃ الاسراء پارہ۔۱۵۔ رکوع۳۔آیت۲۳]

''خدا نے حکم دیا کہ بجز خدا کے کسی کی پوجا نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اگر ایک یا دونوں تیرے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے سامنے اُف نہ کر اور ان کو اچھی بات کہہ اور شفقت کی وجہ سے ان کے سامنے انکساری کا بازو جھکائے رکھ اور کہہ: اے میرے رب! ان پر رحم کر جیسے بچپن میں انہوں نے میری تربیت کی۔''

حدیث میں ہے:

۱۔((اَلۡکَبَائِرُ اَلۡاِشۡرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوۡقُ الۡوَالِدَیۡنِ وَقَتۡلُ النَّفۡسِ وَیَمِیۡنُ الۡغَمُوۡسِ))[رواہ البخاری مشکوۃ باب الکبائر]

''کبیرہ گناہ یہ ہیں: خدا کے ساتھ شرک، والدین کی نافرنی، کسی کا ناحق خون، جھوٹی قسم۔''

۲۔((رَغِمَ اَنۡفُہٗ رَغِمَ اَنۡفُہٗ رَغِمَ اَنۡفُہٗ قِیۡلَ مَنۡ یَارَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ قَالَ مَنۡ اَدۡرَکَ وَالِدَیۡہِ عِنۡدَ الۡکِبَرِ اَحَدَہُمَا اَوۡ کِلَاہُمَا ثُمَّ لَمۡ یَدۡخُلِ الۡجَنَّۃَ)) [رواہ مسلم]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ذلیل ہوگیا، وہ ذلیل ہوگیا، کہا گیا کون؟ فرمایا: جس کے پاس والدین میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں پھر وہ ان کی خدمت کر کے جنت میں نہیں گیا۔''

۳۔((مِنَ الۡکَبَائِرِ شَتۡمُ الرَّجُلِ وَالِدَیۡہِ قَالُوۡا یارسول اللہ وَھَلۡ یَشۡتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیۡہِ؟ قَالَ نَعَمۡ یَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ اَبَاہُ وَیَسُبُّ اُمَّہٗ فَیَسُبُّ اُمَّہٗ)) [متفق علیہ، مشکوۃ]

''کبیرہ گناہوں سے ہے کہ انسان اپنے والدین کو گالی دے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کوئی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ فرمایا: ہاں جو دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ جو دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو گویا اس نے خود اپنے والدین کو گالی دی۔''

۴۔ ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے ایک شخص ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میری بیوی ہے اور میری

ماں کہتی ہے کہ اسے طلاق دیدے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے: ''والد جنت کے دروازوں سے ایک دروازہ ہے، مرضی ہو اس دروازہ کی حفاظت کر مرضی ہو ضائع کردے۔''

۵۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرے نکاح میں عورت تھی، میں اس کو دوست رکھتا۔ میرے والد عمر رضی اللہ عنہ اس کو برا سمجھتے، انہوں نے کہا اس کو طلاق دیدے۔ میں نے انکار کیا۔ میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اس کا ذکر کیا۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو طلاق دے دے۔''

٦۔ ((عن ابی بکرة قال قال رسول الله ﷺ كُلُّ الذُّنُوبِ يَغْفِرُ اللّٰهُ مِنْهَا مَاشَآءَ اللّٰهُ إِلَّا عقُوقَ الْوَالِدَيْنِ ......))

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام گناہوں سے جو چاہے خدا معاف کردیتا ہے مگر والدین کی نافرمانی قابلِ معافی نہیں۔ خدا اس کی سزا دنیا میں ہی مرنے سے پہلے دیتا ہے۔''

اس قسم کی احادیث بہت ہیں جن میں والدین کا حق بڑا ابتلایا گیا ہے اور نافرمانی کی صورت میں انسان سخت خطرے میں پڑجاتا ہے۔

رہا عاق کرنے کا مسئلہ سو وہ بھی انہی احادیث سے معلوم ہوگیا کیونکہ جب والدین کا حکم اولاد کے مال اور اہل وعیال پر چل سکتا ہے تو اپنے مال میں والدین کو بطریقِ اولیٰ ہر طرح کا اختیار ہوگا مگر اتنی بات ہے کہ زندگی میں صحت کے وقت جس طرح چاہے تصرف کرے خواہ سارا کھالے یا کسی کو دیدے۔ مرض الموت میں تہائی سے زیادہ تصرف کا اختیار نہیں کیونکہ اس وقت مال سے وارثوں کا تعلق ہوجاتا ہے خواہ اولاد ہو یا کوئی اور خواہ نافرمان ہو یا فرمانبردار۔ ہاں وارث کافر ہو تو وہ محروم ہیں، ان کو وراثت نہیں ملتی۔ (۱)

نافرمان اولاد کو وراثت سے محروم کرنا کیسا ہے؟

سوال:

نافرمان بیٹی بیٹے کو اپنی زندگی میں ناراض ہوکر محروم الارث کردینا جائز ہے یا نہیں؟

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۶۱۹ تا ۶۲۲)]

جواب: اولاد جب تک مسلمان ہے محروم الارث نہیں ہوسکتی ہاں اگر مسرف ہوتو امام شافعیؒ کے مذہب پر بحکمِ آیت:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾[النسآء]

اس پر حجر ہوسکتا ہے یعنی اس کے تصرفات روکے جاسکتے ہیں جب تک اس کی حالت قابل اطمینان نہ ہو۔اس کا حصہ ولی کے پاس محفوظ رہے۔ (۱)

مرتد اولاد کا حکم

سوال: جو بیٹا یا بیٹی مرتد ہو جائے اس کو قانون حکومت میں محروم الارث لکھ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مرتد کو قانونِ حکومت میں محروم الارث لکھا دینا درست ہے لیکن اگر والدین کی زندگی میں اسلام کی طرف لوٹ آیا تو وہ وارث ہوگا۔ (۲)

کسی بیٹے کی طرف سے باپ کو دیا جانے والا مال بھی وراثت میں تقسیم ہوگا؟

سوال:

ایک شخص مسمی عبداللطیف جس کا دوسرا بھائی عبدالرحمٰن اس کی سوتیلی والدہ سے ہے، ہردو کے والد مسمی عبداللہ نے ایک مربع زمین آبادکاری پر بادائے پیشگی مبلغ اڑھائی صد روپیہ مسمی عبداللطیف کے کسب وکمائی سے بشرطِ ادائیگی اقساط آئندہ خرید کیا ہے اور مربعہ مذکور کو بھی محض عبداللطیف مذکور ہی نے اپنے خرچ اور محنت وغیرہ سے آباد کیا ہے اور مسمی عبدالرحمٰن کا نہ پیشگی اڑھائی سو میں کوئی حصہ شراکت ہے اور نہ ہی زمین کے آباد کرنے میں مسمی عبدالرحمٰن کا دخل ہے۔ اب صرف مربعہ کی نامزدگی والد کے نام پر تحریر ہے۔ مقصودِ سوال یہ ہے کہ والد کے رخصت ہو جانے کے بعد مربعہ مذکور کا ہردو میں سے کس کو پہنچتا ہے، کیا دونوں کو مساوی پہنچتا ہے یا محض عبداللطیف مذکور کو؟

جواب:

عبداللطیف نے یہ روپیہ والد کو دے دیا اور والد ہی کے نام پر زمین خریدی گئی، اس لیے یہ زمین والد کی ہوگی، پس وراثت میں عبدالرحمٰن برابر کا حصہ دار ہوگا۔ معاملات میں جس کے نام کی چیز ہوتی ہے اس کی سمجھی

---

(۱) [ایضاً ج ۲ ص ۳۷۰] (۲) [ایضا ج ۲ ص ۳۷۱]

جاتی ہے، خاص کر اولاد عموماً والدین کو دیتی رہتی ہے اور لڑکا دیتے وقت تصریح کر دیتا کہ میں صرف امانت کے طور پر یہ چیز آپ کے حوالہ کرتا ہوں، ملکیت میری ہی رہے گی تو اس صورت میں اس لڑکے کا حق بدستور قائم رہ سکتا تھا۔ مگر اس صورت میں والد کے نام کرانے کا کچھ مطلب نہیں بلکہ اپنے نام کراتا، اگر کوئی قانونی رکاوٹ ہوتی تو پھر والد کے نام کرا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی امانت کی تصریح کرنا ضروری تھی مگر جب کوئی بات ہی نہ ہوئی تو والد کی ملکیت سمجھی گئی اور جب والد کی ملکیت سمجھی گئی تو لامحالہ دونوں بھائی برابر کے حقدار ہو گئے۔

حدیث میں ہے کہ جب آقا غلام کو فروخت کرے اور غلام کے پاس مال ہو تو وہ مال آقا کا ہے مگر یہ کہ خریدار شرط کرے۔ اسی طرح کوئی تابیر کیا ہوا باغ فروخت کرے تو اس سال کا پھل مالک کا ہوگا مگر یہ کہ خریدار شرط کرے۔ مال آقا کا اور اس سال کا پھل مالک کا کیوں ہے؟ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مال غلام سے اور تابیر سے پیدا شدہ پھل اصل باغ سے الگ شے ہے۔ مال کا غلام سے الگ ہونا تو ظاہر ہے اور پھل اس لیے الگ ہے کہ اس کے لیے الگ محنت کرنی پڑتی ہے اور الگ شے تصریح کے بغیر خرید کے تحت نہیں آ سکتی۔ ٹھیک اسی طرح اولاد کما کر جو کچھ والدین کو دیتی ہے عام دستور کے مطابق والدین کا اس پر پورا اختیار ہوتا ہے جو چاہیں کریں۔ اس کو امانت سمجھنا عام دستور سے الگ شے ہے پس اس کی تصریح ہونی چاہیے تھی لیکن بجائے تصریح کے والد کے نام پر زمین خریدی گئی ہے تو یہ پوری طرح سے والد کی ملکیت ہو گئی پس بلاشبہ یہ والد کے ترکہ میں سمجھی جائے گی جس میں سب ورثاء شریک ہوتے ہیں۔ [1]

مال وغیرہ میں بچوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دینا:

سوال:

کیا میرے لیے جائز ہے کہ میں ایک بچے کو کچھ دوں اور دوسرے کو اس لئے نہ دوں کہ وہ غنی ہے؟

جواب:

آپ کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ آپ بعض بچوں کو تو کوئی چیزیں دیں اور بعض کو اس سے محروم رکھیں، بلکہ ہدایت کے اصول کے تحت ان میں عدل وانصاف سے کام لینا واجب ہے۔ سب کو دیا جائے یا سب کو چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

(۱) [ایضاً (ج ۲ ص ۳۷۵،۳۷۴)]

((اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ))[متفق عليه]

''اللہ سے ڈرواور اپنے بچوں میں عدل کرو۔''

اگر تمام بچے کسی ایک کے ساتھ خصوصی سلوک پر راضی ہوں تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ بالغ اور راشد ہوں۔ اسی طرح اگر بچوں میں سے کوئی ایک کسی بیماری یا کسی اور عارضہ کی وجہ سے روزی کمانے سے قاصر ہو اور اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے اس کا باپ یا بھائی نہ ہو اور نہ حکومت کی طرف سے اس کی کفالت کا کوئی انتظام ہو تو اس صورت میں آپ اس پر بقدرِ ضرورت خرچ کر سکتی ہیں، تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ اسے بے نیاز کر دے۔ (۱)



(۱) [فتاوی برائے خواتین (ص۳۲۷، ۳۲۸)فتوی ازشیخ ابن بازؒ]

باب۱۲:

جہاد اور والدین کی اجازت کا مسئلہ

ہمارے ہاں اس مسئلہ میں بڑا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ بعض حضرات علی العموم والدین کی اجازت کو جہاد کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں جبکہ بعض حضرات مطلق طور پر والدین سے اجازت لینا درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جہاد اگر فرض کفایہ ہو تو اس کے لیے والدین کی اجازت بہر صورت ضروری ہے الا یہ کہ والدین غیر مسلم ہوں۔ لیکن اگر والدین مسلمان ہونے کے باوجود فرضِ کفایہ جہاد میں شرکت کی اجازت نہ دیں تو پھر ان کی نافرمانی کرتے ہوئے جہاد کے لیے نکل جانا یقیناً گناہ ہے۔ البتہ اگر جہاد فرضِ عین ہو جائے تو پھر والدین کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں اور فقہاء کے نزدیک درج ذیل تین صورتوں میں جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے:

❶ ......دشمن کے حملہ آور ہونے کی صورت میں

❷ ......حاکمِ وقت کے حکم دینے کی صورت میں

❸ ......حربی دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں(۱)

مزید وضاحت کے لیے یوں سمجھیے کہ اگر بالفرض پاکستان میں خالص اسلامی حکومت قائم ہو اور انڈیا، پاکستان پر بھرپور حربی حملہ کر دے تو پھر تمام پاکستانیوں پر انڈیا کے خلاف جہاد فرضِ عین ہو جائے گا۔ خواہ کسی کے والدین اجازت دیں یا نہ دیں۔ ایسے حالات میں ان سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ غور کیا جائے تو اندریں صورت خود والدین پر بھی جہاد فرض عین ہو جاتا ہے......!!

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا شرعی امیر (یا حاکم) دشمن کے خلاف جہاد کے لیے مہم بھیجنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ جس جس فرد کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دے گا، اُس اُس فرد پر اس صحیح حدیث: **"وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا......الحديث"** ["جب تمہیں (حاکمِ وقت کی طرف سے) جہاد

---

(۱) [المغنی، ازابن قدامه(ج۸ص۱۳)بدائع الصنائع،از کاسانی (ج۷ص۹۸) الفقه الاسلامی وادلته،از وهبة الزحيلی (ج۸ص۵۸٤۹)]

کے لیے نکلنے کا حکم دیا جائے تو فوراً جہاد کے لیے نکل پڑو۔''] کے تحت جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت والدین اگر جہاد سے منع کریں، تو ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ البتہ حاکمِ وقت ان مجاہدین کے والدین کے ساتھ مناسب تعاون کا پابند ہو گا۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا امیر شرعی کسی متعین دشمن کے خلاف جہاد کے لیے یہ اعلان کر دے کہ ''جو شخص جہاد میں شرکت کرنا چاہے وہ جمع ہو جائے۔''

ایسی صورت میں چونکہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور امیر وقت نے اختیاری حکم دیا ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ایسی صورت میں کسی نہ کسی طرح میدانِ جنگ میں پہنچ چکا ہو تو پھر والدین کے واپس بلانے کے باوجود وہ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خواہ وہ اتفاقی طور پر ہی میدان جنگ میں پہنچا ہو، تب بھی میدانِ جنگ سے فرار اس کے لئے جائز نہیں۔

ایسا چونکہ شاذ و نادر ہوتا ہے اور ویسے بھی یہ صورت بنیادی طور پر فرض کفایہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں شرکت کے لیے منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور والدین کو مطلع کرنا بھی اسی منصوبہ بندی کا حصہ ہوتا ہے، اس لیے یہ صورت عام طور پر والدین کی اجازت پر موقوف ہے اور اس کے علاوہ پہلی دو صورتوں میں والدین کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔ گویا خلاصہ یہ نکلا کہ عام طور پر پہلی دو صورتوں میں والدین کی اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں لیکن اس کے علاوہ تقریباً دیگر تمام صورتوں میں جہاد میں شرکت کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے اور درج ذیل احادیث انہی صورتوں پر روشنی ڈالتی ہیں جن میں والدین کی اجازت کو فرض قرار دیا گیا ہے:

1. ..... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کرنے لگا۔ آپ نے پوچھا: ((أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟)) کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: ((فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ)) پھر انہی میں جہاد کر۔'' (یعنی ان کی خدمت کر کے جہاد کو ثواب حاصل کرو)[1]

2. ..... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب الجهاد باذن الابوین (ح ٣٠٠٤) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین (ح ٦٥٠٤) ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب في الرجل يغزو وأبواه كارهان (ج٦ ص٢٥٢)]

کیا: (اے اللہ کے رسولؐ!) میں ہجرت اور جہاد کے لیے آپ کی بیعت کرتا ہوں تاکہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب حاصل ہو۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا:

((فَهَلْ مِنْ وَالِدَيْكَ اَحَدٌ حَيٌّ؟......))

''کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ موجود ہے؟''

اس نے کہا کیوں نہیں بلکہ دونوں ہی زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں! تو آپؐ نے فرمایا:

((فَارْجِعْ اِلٰی وَالِدَيْكَ ......))

''پھر اپنے والدین کی طرف پلٹ جا اور جا کر ان سے حسنِ سلوک کر۔''(1)

3 ...... حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اللہ کے رسولؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا: میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ کے ساتھ جہاد میں شرکت کروں اور میرے یہاں آنے پر میرے والدین آہ وبکا کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا:

((فَارْجِعْ اِلَيْهِمَا فَاَضْحِكْهُمَا كَمَا اَبْكَيْتَهُمَا)) (2)

''پھر تو ان کی طرف لوٹ جا اور انہیں اسی طرح خوش کر جس طرح تو نے انہیں رونے پر مجبور کیا تھا۔''

4 ...... حضرت معاویہ بن جاہمہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ

((اَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَدْتُ اَنْ اَغْزُوَ وَقَدْ جِئْتُ اَسْتَشِيْرُكَ، فَقَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَالْزَمْهَا فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَيْهَا)) (3)

''میرے باپ جاہمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! میں جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپؐ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر اس کی خدمت کر، بے شک جنت اس کے

(1) [صحيح مسلم، كتاب البر والصلة (ح ٦٥٠٧) فتح البارى (ج٦ ص ١٤٠)]

(2) [مسند احمد (ج٢ ص ١٦٥، ١٨٨، ١٩٣، ١٩٧، ٢٢١) ابو داؤد، كتاب الجهاد، باب فى الرجل يغزو وابواه كارهان (ح ٢٥٢٥) ابن ماجه (ح ٢٧٨٢) نسائى (ج٧ ص ١٤٣)]

(3) [سنن نسائى، كتاب الجهاد، باب الرخصة فى التخلف لمن له والدة (ح ٣١٠٦) الترغيب والترهيب (ج٣ ص ٢١٤) حاكم (ج٤ ص ١٥١) امام حاکم، امام ذهبی، علامہ منذری اور شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔]

قدموں تلے ہے۔''

5 ...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی یمن سے ہجرت کر کے اللہ کے رسولؐ کے پاس آیا تو آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا: ''یمن میں تمہارا کوئی رشتہ دار موجود ہے؟'' اس نے کہا: جی ہاں، والدین موجود ہیں۔ آپؐ نے پوچھا: ''تمہارے والدین نے تمہیں جہاد کے لیے اجازت دے دی تھی۔'' اس نے کہا: نہیں!

تو آپؐ نے فرمایا کہ

((اِرْجِعْ اِلَیْهِمَا فَاسْتَأْذِنْهُمَا فَاِنْ اَذِنَا لَكَ فَجَاهِدْ وَاِلَّا فَبِرَّهُمَا))

''پھر تم واپس چلے جاؤ اور اپنے والدین سے اجازت حاصل کرو۔ اگر وہ تمہیں اجازت دیں تو تم جہاد میں شرکت کرو اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو پھر انہی سے حسن سلوک کرتے رہو۔''[1]

فقہاءِ کرام کا فیصلہ:

یاد رہے کہ جہاد کے لیے والدین کی اجازت [اِذْنُ الْوَالِدَیْن] کے حوالے سے ہم نے کوئی نیا موقف پیش نہیں کیا بلکہ ایک آدھ غیر معروف فقیہ کے علاوہ باقی سبھی فقہاء کا موقف بھی یہی رہا ہے کہ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تب والدین کی اجازت ضروری نہیں لیکن جب جہاد فرضِ کفایہ ہو تو پھر والدین کی اجازت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں چند ایک فقہاء کے فیصلے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حافظ ابن حجرؒ:

حافظ ابن حجر، صحیح بخاری کی گذشتہ حدیث (نمبر1) کے تحت رقمطراز ہیں کہ

"قال جمهور الفقهاء يحرم الجهاد اذا منع الابوان او احدهما بشرط ان يكونا مسلمين

(۱) [سنن ابو داؤد۔ ایضاً (ح۲۵۲۷) اگرچہ اس کی سند میں کلام ہے تاہم گزشتہ صحیح روایات سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اسی مفہوم کی مزید احادیث بھی موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مجمع الزوائد۔ از امام ہیثمیؒ (ج۸ص۱۳۸) مستدرك حاكم (ج۲ص۱۵۲) سنن بيهقي (ج۹ص۲۶) سنن نسائي (ج۲ص۵٤) مسند احمد (ج۱ص۴۰۹،۴۳۹۔ ج۲ص۱۶۵،۱۸۸۔ ج۳ص۷۶،۴۲۹) مسند حمیدی (ح۱۰۳-۴ح۔۵۷۴۔ ح۵۸۵) صحيح ابن خزيمه (ح۳۲۷) صحيح ابن حبان (ح۳۱۸۔ ح۴۱۹۔ ح۴۲۲۔ ح۴۲۳) سنن سعيد بن منصور (ح۲۳۳۵) مصنف عبد الرزاق (ح۹۲۸۵) الادب المفرد (ج۱ص۱۹)]

لان برهما فرض عين والجهاد فرض كفاية فاذا تعين الجهاد فلا اذن .... " [1]

''جمہور فقہا کے بقول جہاد اس وقت حرام ہو جاتا ہے جب والدین یا ان میں سے کوئی ایک (اپنی اولاد کو) جہاد میں شرکت کرنے سے منع کردے بشرطیکہ والدین مسلمان ہوں۔ کیونکہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک فرضِ عین ہے اور جہاد فرضِ کفایہ۔ البتہ جب جہاد فرضِ عین ہو جائے تو پھر والدین کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔''

امام نوویؒ، امام شافعیؒ اور امام ثوریؒ:

امام نوویؒ صحیح مسلم کی مذکورہ احادیث (حدیث نمبر ا۔ اور نمبر ۲) کی شرح میں رقمطراز ہیں کہ

"هذا كله دليل لعظم فضيلة برهما وانه آكد من الجهاد وفيه حجة لماقاله العلماء انه لا يجوز الجهاد الا باذنهما اذا كانا مسلمين اوباذن المسلم منهمافلو كانا مشركين لم يشترط اذنهما عند الشافعيؒ ومن وافقه وشرطه الثوريؒ هذا اذالم يحضر الصف ويتعين القتال.... " [2]

''ان روایات سے والدین سے حسنِ سلوک کی انتہائی فضیلت اُجاگر ہوتی ہے اور یہ کہ جہاد سے کہیں زیادہ اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اس میں ان علماء کے لیے بھی دلیل ہے جن کے بقول والدین دونوں مسلمان ہوں یا ان میں سے ایک مسلمان ہو تو ان کی اجازت کے بغیر جہاد جائز نہیں۔ اگر والدین مشرک ہوں تو امام شافعیؒ اور ان کے موافقین کے نزدیک ان کی اجازت شرط نہیں اور امام ثوریؒ نے یہ تمام شرائط اس وقت عائد کی ہیں جب آدمی میدانِ جنگ میں نہ پہنچا ہو اور نہ ہی قتال فرض ہوا ہو۔''

ابن قدامہؒ:

مشہور حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہؒ رقمطراز ہیں کہ

"واذا كان ابواه مسلمين لم يجاهد تطوعا الا باذنهما.....ولان بر الوالدين فرض عين والجهاد فرض كفاية وفرض العين يقدم فاماان كان ابواه غير مسلمين فلااذن لهما

(۱) [فتح الباری شرح صحیح بخاری، لابن حجرؒ (ج٦ ص ١٤٠ تا ١٤١)]

(۲) [شرح مسلم للنوویؒ (ج۲ ص ۳۱۲)]

وبذلك قال الشافعیؒ"[1]

''جب والدین مسلمان ہوں تو جہاد کے فرضِ کفایہ ہونے کی صورت میں ان کی اجازت کے بغیر جہاد جائز نہیں.... کیونکہ والدین سے حسنِ سلوک فرضِ عین ہے جبکہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور فرضِ عین بہر حال مقدم ہوگا۔ البتہ اگر والدین غیر مسلم ہوں تو پھر ان کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں اور امام شافعیؒ کا بھی یہی موقف ہے۔''

ابن رشد قرطبیؒ:

ابن رشد قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ

"وعامة الفقهاء متفقون على ان من شرط هذه الفريضة اذن الابوين فيها الا ان تكون عليه فرض عين....."[2]

''فقہاء کے جمِ غفیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جہاد کے لیے والدین کی اجازت شرط ہے الا یہ کہ جہاد فرضِ عین ہو جائے۔''

ابن ھبیرہؒ:

ابن ھبیرہؒ رقمطراز ہیں کہ

"واتفقوا على ان من لم يتعين عليه الجهاد فانه لا يخرج الا باذن ابويه اذا كانا حيين مسلمين"[3]

''فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص پر جہاد فرضِ عین نہ ہو اس کے لیے والدین سے جہاد کی اجازت حاصل کرنا فرض ہے جبکہ والدین زندہ ہوں اور مسلمان ہوں۔''

امام بغویؒ:

امام بغویؒ رقمطراز ہیں کہ

''جہاد اگر فرضِ کفایہ ہو تو والدین کی اجازت کے بغیر کسی مسلمان کی اس میں شرکت درست نہیں۔ لیکن

(۱) [المغنی، از ابن قدامہؒ (ج۱۳ ص۲۶)]

(۲) [بدایة المجتهد، ازابن رشدؒ (ج۱ ص۷۵۸)]

(۳) [الا فصاح، ازابن هبیرةؒ (ج۲ ص۲۷۳)]

اگر جہاد فرضِ عین ہو تو پھر والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں ۔ اور اگر فرضِ عین کی صورت میں والدین جہاد سے منع کر دیں تو ان کی بات ماننے کی بجائے جہاد کے لیے نکلنا چاہیے۔ اگر والدین کافر ہوں تو پھر ان کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں خواہ جہاد فرضِ عین ہو یا فرضِ کفایہ۔"[1]

ایک شبہ کا ازالہ:

حدیث کی ایک کتاب صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"ایک آدمی اللہ کے رسولؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز۔ اس نے کہا کہ اس کے بعد کس کی فضیلت زیادہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جہاد کی۔ اس نے کہا کہ میرے والدین زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اس نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، میں ضرور جہاد کروں گا اور والدین کو چھوڑ دوں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ پھر تم بہتر جانتے ہو۔"[2]

اس روایت کی بنیاد پر بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ جہاد خواہ فرضِ عین ہو یا فرضِ کفایہ، بہرصورت والدین کی اجازت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود انسان کی صوابدید پر موقوف ہے۔ حالانکہ یہ موقف کم علمی پر مبنی ہے اور درج ذیل وجوہات کی بنا پر لائق توجہ نہیں:

۱۔ اول تو یہ روایت ہی ضعیف ہے۔ اسے امام احمد اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ احمد کی روایت میں اِبنِ لَهِيعَه اور حُيَي بن عبدالله المعافري ضعیف راوی ہیں۔ امام ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں مسند احمد ہی کی روایت نقل کی ہے جبکہ ابن حبان کی سند میں بھی حيي بن عبدالله المعافري موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس کے علاوہ بھی اس کی کوئی سند ایسی نہیں جو محدثین کے کلام سے خالی ہو۔ مشہور محدث علامہ البانیؒ نے بھی اس روایت کو کئی وجوہات کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے۔[3]

۲۔ اگر بالفرض اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا ان بے شمار صحیح روایات کے ساتھ تعارض لازم آتا ہے جن میں والدین کی اجازت کو خود آنحضرتؐ ہی نے لازمی شرط قرار دیا ہے جبکہ یہ روایت

(۱) [شرح السنة ، كتاب الجهاد (ج ۱۰ ص ۳۷۸)]

(۲) [صحيح ابن حبان (ح ۱۷۲۲) مسند احمد (ج ۲ ص ۱۷۲) مجمع الزوائد (ج ۱ ص ۳۰۶)]

(۳) [سلسة الاحاديث الضعيفة از علامه البانیؒ (ج ۳ ص ۳۱۱ ۔ حدیث ۱۰۷۹)]

ان کے برخلاف ہے۔ اس تعارض کے حل کے لیے سب سے پہلے تطبیق (جمع) کی صورتوں پر غور کیا جائے گا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ

"وهو محمول على جهاد فرض العين توفيقا بين الحديثين ......"(1)

''دونوں طرح کی احادیث کے درمیان تطبیق دینے کے لیے اس روایت کو جہاد کی اس صورت پر محمول کیا جائے گا جو فرض عین ہوتی ہے۔''

اور یہی بات گذشتہ صفحات میں جابجا بیان کی گئی ہے کہ جب جہاد فرض عین ہو تب والدین کی اجازت ضروری نہیں مگر فرض عین کے علاوہ فرض کفایہ جہاد کی تمام صورتوں میں والدین کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اور اگر دونوں روایات میں ترجیح کا قاعدہ جاری کیا جائے تو بلاشبہ یہ روایت مرجوح اور گزشتہ روایات راجح قرار پاتی ہیں۔ اس لیے کہ گزشتہ روایات اول تو کثیر طرق سے مروی ہیں اور دوم یہ کہ ان کی صحت اعلیٰ درجہ کی ہے اسی لیے بخاری و مسلم جیسے محدثین نے بھی انہیں روایت کیا ہے۔ اس لیے والدین کی اجازت کی ضرورت پر دلالت کرنے والی روایات ہی قابل ترجیح قرار پائیں گی۔ (اس کے علاوہ نسخ یا توقف کی یہاں کوئی صورت نہیں!)

دورِ حاضر میں جہاد کے لیے والدین کی اجازت:

اس وقت دنیا بھر میں کہیں بھی مسلمان اقدامی جہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے بلکہ مجموعی طور پر مسلمان تقریباً ہر جگہ دفاعی پوزیشن میں ہیں مگر یہ دفاعی پوزیشن بھی ہر جگہ ایک جیسی نہیں اور پھر دور حاضر میں حملے، قبضے اور دفاع وغیرہ جیسی بے شمار صورتیں پہلے کی نسبت یکسر بدل چکی ہیں مثلاً کشمیر پر انڈیا نے غاصبانہ قبضہ کر کے اہل کشمیر کو نصف صدی سے دفاعی صورت میں کھڑا کر رکھا ہے مگر اس کے باوجود کشمیر میں تعلیمی وسیاسی ادارے اور معاشی وصنعتی سرگرمیاں پوری طرح سے جاری وساری ہیں حالانکہ جس علاقے پر دشمن کا حملہ ہو وہاں ایسی سرگرمیاں جاری رہنا محال ہو جایا کرتی ہیں لیکن کشمیر میں ایسا نہیں! پھر عجیب بات یہ کہ کشمیر میں آئے روز چند ایک کشمیریوں کی انڈین فوج کے ہاتھوں شہادت بھی معمول کا حصہ بن چکی ہے!!

علاوہ ازیں تقریباً اسی طرح کا معاملہ فلسطین اور بعض دیگر مسلم مقبوضات سے بھی ہے۔ اس لیے ان

(1) [فتح الباری (ج٦ ص١٤١)]

حالات میں کشمیر و فلسطین یا کسی اور خطہ میں جہاد کے لیے جانے سے قبل والدین کی اجازت ضروری ہے یا نہیں؟ اس کا تعلق صریح طور پر اجتہاد سے ہے اور کسی بھی اجتہادی معاملے میں فیصلہ کرتے وقت اہل علم کے مابین اختلاف ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔ اگرچہ بہتر یہی ہے کہ ایسے کسی بھی اہم مسئلہ میں اہلِ حل وعقد اور اصحابِ علم وبصیرت باہمی منصوبہ بندی کے ساتھ کسی ایسی رائے پر اتفاق کرلیں جو شریعت و مصلحت دونوں کے قریب تر ہو۔ بہرصورت اظہارِ رائے کا حق چونکہ ہر صاحبِ علم کو حاصل ہے، اس لئے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے میری رائے یہ ہے کہ دورِ حاضر میں کشمیر و فلسطین یا کسی اور خطہ میں جہاد کے لیے جانے سے قبل والدین سے اجازت لینا فرض ہے۔ اور اگر والدین اجازت نہ دیں تو پھر ان کی حکم عدولی کرتے ہوئے ایسے جہاد میں شرکت کے لئے جانا واضح طور پر والدین کی نافرمانی اور کارِ گناہ ہے البتہ جن علاقوں پر دشمن حملہ آور ہو چکا ہو وہاں پر موجود نوجوانوں کے لیے والدین کی اجازت ضروری نہیں۔ علماء کی بھی اس مسئلہ میں بالعموم یہی رائے ہے۔ آئندہ سطور میں بطورِ مثال چند اہل علم کی آراء و فتاوٰی درج کیے جا رہے ہیں۔

مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ (شیخ الحدیث، جامعہ محمدیہ، گوجرانوالہ)

سوال:

۱)...... کشمیر اور دوسرے ممالک میں جو جہاد شروع ہے، کیا یہ درست ہے؟

۲)...... اور اس جہاد میں بالعموم ہندو کے ساتھ یعنی کشمیر میں جہاد کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے؟

۳)...... اگر والدین اجازت نہ دیں تو پھر جہاد میں شرکت کیسی ہے؟

۴)...... اگر کوئی والدین کی اجازت کے بغیر کشمیر میں شہید ہو جائے تو اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ [عتیق الرحمٰن بن محمد رفیق ظفر وال، 7-3-1999]

جواب:

☆...... درست ہے۔

☆...... ان جہادوں میں جانے کے لیے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ صحیح بخاری اور ابوداؤد میں حدیثیں دیکھ لیں اور اس سلسلہ میں مجلۃ الدعوۃ میں حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ تعالیٰ کا ایک مضمون چھپا تھا، وہ مطالعہ فرمالیں۔

☆ .....اگر والدین سے اجازت لیے بغیر جہاد میں چلا گیا تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حقوق الوالدین کو کبائر میں شمار فرمایا ہے۔

☆ .....دین وقرض کے علاوہ شہید فی سبیل اللہ کے تمام گناہ شہادت کے ساتھ معاف ہو جاتے ہیں۔ (1)

مولانا گوہر رحمانؒ (شیخ الحدیث، جامعہ تفہیم القرآن، مردان)

سوال: کیا میں والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے جا سکتا ہوں؟

جواب:

جہاد اگر فرض عین ہو جائے یعنی امیر المومنین یا امیر المجاہدین کی جانب سے ہر ایک کو جہاد پر جانے کا حکم دیا گیا ہو جسے فقہی اصطلاح میں نَفِيرِ عَام کہا جاتا ہے تو ایسی صورت حال میں والدین کی اجازت کے بغیر جانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر سب کو جانے کا حکم نہ دیا گیا ہو تو پھر والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہیے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ وہ خدمت کے محتاج بھی ہوں۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جہاد کا ارادہ کرنے والے ایک صحابی کو والدین کی خدمت کے لیے رک جانے کا حکم آیا ہے۔ [گوہر رحمانؒ، دسمبر ۱۹۳۰ء] (2)

حافظ عبداللہ محدث امرتسری روپڑیؒ:

سوال: جہاد مقدم ہے یا اطاعتِ والدین؟

جواب: اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاءُكُمْ وَأَبْنَاءُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴾[سورة التوبه: ٢٤]

''یعنی تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، رشتہ دار، مال کماتے ہوئے تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، اگر یہ اشیاء خدا اور رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے

---

(1) [احکام و مسائل، از حافظ عبدالمنان، حفظہ اللہ (ص ٤٦١)]

(2) [تفہیم المسائل از گوہر رحمان، رحمہ اللہ (ج ١ ص ٢٨٦)]

تمہیں زیادہ پیاری ہیں تو پھر عذاب کے منتظر رہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد اطاعتِ والدین سے مقدم ہے مگر یہ عند الضرورت اور امام کے مطالبہ کے وقت ہے، ورنہ خدمتِ والدین افضل ہے چنانچہ حدیث میں ہے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد کے لیے اِذْن مانگا تو آپؐ نے فرمایا: تیرے والدین حیات ہیں؟

اس نے کہا: ہاں!

تو آپؐ نے فرمایا: انہی میں جہاد کرو۔

اور ایک روایت میں ہے ان کی طرف لوٹ جا اور ان کے ساتھ اچھا رہ۔[1]

فضیلۃ الشیخ ابوبکر جابر الجزائری:

موصوف نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب: منهاج المسلم میں جہاد کے پانچ ارکان بیان فرمائے ہیں:

(۱) نیت کا درست ہونا۔

(۲) امام (حکمران) کی قیادت۔

(۳) حکمران کی اطاعت۔

(۴) ماں باپ کی اجازت۔

(۵) پوری قوت وطاقت کی فراہمی۔

ماں باپ کی اجازت کے حوالے سے موصوف رقم طراز ہیں کہ

''ماں باپ یا ان میں سے کوئی ایک زندہ ہے تو ان کی رضا حاصل کرنی چاہیے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مرد آیا اور جہاد کی اجازت طلب کی، تو آپؐ نے پوچھا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا 'ہاں' تو آپؐ نے فرمایا: ''ان کی خدمت کا جہاد ادا کر۔'' (صحیح بخاری) الا یہ کہ دشمن مسلم آبادی پر حملہ آور ہو جائے یا امام کسی کو متعین کر کے جہاد کا حکم صادر کر دے تو ماں باپ سے اجازت لینا ساقط ہو جاتا ہے۔''[2]

---

۱) [فتاوی اهلحدیث، از حافظ عبدالله امرتسری روپڑیؒ (ج۲ ص ۷۰۵)]

۲) [منهاج المسلم، از ابو بکر جابر الجزائری (ص ۵۰۸) ترجمه از محمد رفیق اثری، طبع دارالسلام، ریاض]

شیخ الحدیث مولانا عبدالسلام بستویؒ (دہلوی):

مولانا اپنی مشہور کتاب: ''اسلامی خطبات'' میں رقم طراز ہیں کہ

''اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے، وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اُس جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں جس کو ان کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا۔ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر یہ عرض کیا:

یا رسول اللہ! میں جہاد کرنا چاہتا ہوں اور آپ کے پاس مشورہ لینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تیری ماں موجود ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کی خدمت میں حاضر رہنے کو لازم پکڑ لے کیونکہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔'' (احمد، نسائی)[1]



(۱) [اسلامی خطبات، از مولانا عبدالسلام بستویؒ (ج ۲ ص ۶۹۵)]

خاندان کا نظام توجہ کا مرکز کیوں نہیں؟!

[دینی تحریکوں سے وابستہ افراد کے لیے غور و فکر کا پیغام]

اسلام خشک اور بے روح قوانین اور ضابطوں کا نام نہیں ہے یہ فطرت انسانی کی ہر ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی جامع اور ہمہ گیر تعلیمات پیش کرتا ہے۔ یہ انسان کے فطری جذبوں کے لیے اظہار کی پر حکمت اور پر اصلاح راہیں تجویز کرتا ہے۔ خواہشات اور آرزؤں کو کچلتا نہیں، ان کے لیے افادیت وتعمیر کی حد بندی کرتا ہے۔ تہذیبی اقدار و روایات اور تمدنی مظاہر کی نشو و نما اور فروغ کے لیے رہنما اصول دیتا ہے۔ سوچ وفکر اور احساس وشعور کے لیے گہری اور پر راحت بنیادیں مہیا کرتا ہے۔ تمدن کے آثار مٹانے پر اصرار نہیں کرتا، انہیں ایک سانچہ فراہم کر کے اس میں ڈھالنے کی تاکید کرتا ہے۔ فطری تمدنی اداروں کے استحکام کا جیسا اہتمام اسلام نے کیا ہے کسی اور دین اور کسی اور نظامِ زندگی نے نہیں کیا۔

خاندان قدیم ترین، مستحکم ترین اور مفید ترین فطری اور تمدنی ادارہ ہے۔ خیر اور بھلائی کے سرچشموں کی حفاظت کرنے کی جیسی صلاحیت اس ادارے میں ہے کوئی اور ادارہ اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ نسلِ انسانی کی بقا اور تسلسل کا انحصار خاندان کے استحکام ہی پر ہے۔ اگر اس کا شیرازہ بکھر جائے تو ساری انسانی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ سید مودودیؒ ادارۂ خاندان کی زبردست اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا، ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے۔ اس ملاپ سے نئی نسل وجود میں آتی ہے پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرے تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر خاندان ہی وہ ادراہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہ اداراہ تمدنِ انسانی کے بقا اور نشو و نما کے لیے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا بلکہ اس کے کارکن دل سے اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کی جگہ لینے والے خود ان سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی

صحت وطاقت پر خود تمدن کی صحت وطاقت کا مدار ہے۔اسی لیے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو صحیح ترین بنیادوں پر قائم کیا جائے۔'' ['اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات': از مولانا مودودیؒ]

طاغوتی اور باطل طاقتوں کا خاص طور پر یہودی سازشوں کا ایک بہت بڑا ہدف یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کے اندر خاندان جیسے مستحکم ترین ادارے کی چولیں اکھاڑ دی جائیں۔اس میں انتشار اور ضعف کے بیج بو دیے جائیں اور مسلمانوں کو اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ دین، اخلاق اور اعلیٰ ترین تہذیبی اقدار کو وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کر سکیں۔انیسویں صدی کے نصف اول ہی سے عیسائی مشنری ادارے اور دوسری کافر سازشی طاقتیں مسلمانوں کے خاندانی نظام کو برباد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

طویل دورِ غلامی کے بعد آزادی کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا، ادھر اس کے ساتھ ہی احیائے اسلام، بیداریِ امت اور غلبۂ دین کے لیے اسلامی تحریکوں کی کونپلیں بھی چمن ملت میں پھوٹنے لگی تھیں۔یہ اسلامی تحریکیں فطری طور پر اسلام کی مبلغ، اسلامی روایات کی محافظ، تمدنِ اسلامی کی پشت پناہ اور تہذیبی روایات کی حامل بن کر اٹھی تھیں۔دین وملت کے دشمن اسلام کے جس گوشے پر حملہ آور ہوتے، یہ اس دفاع میں آگے بڑھ کر وار کو روکتی تھیں، بلکہ اس کے فکری جرنیلوں نے اپنے قلم کی توپوں سے مغرب کی فاسد اور شیطانی تہذیب پر اس حملے پر ایسے جوابی حملے کیے کہ دانشِ فرنگ کے قلعوں میں دراڑیں صاف نظر آنے لگیں۔

دلیل کے محاذ پر شکست سے دوچار ہونے کے باوجود تمدن اسلام کے سب سے بڑے اور مضبوط ادارے یعنی خاندان کے خلاف شیطانی افکار کی یلغار ہوتی رہی۔اسلامی تحریکوں کو چاہیے تھا کہ دعوتِ اسلام کے عمل میں خاندان کے نظام پر خاص توجہ دیتیں اور عمومی تربیت کے لیے اس ادارے سے کام لیتیں، فرد کا رابطہ گھر سے مستحکم کرنے پر زور زیادہ ہوتا۔خاندان اور اہل وعیال سے رشتہ کمزور یا منقطع کر کے آنے والے کسی شخص کو دین کی سپاہ میں شامل نہ کرتیں۔تحریکوں کو یہ بھی چاہیے تھا کہ دعوت وتربیت اور تحفظ وبقائے اسلام کے لیے گھر اور خاندان کی اکائی کو مرکزی حیثیت دے کر اس کو مضبوط ترین حصار فراہم کر دیتیں لیکن یہاں دین کے تقاضوں پر تنظیموں کے تقاضے غالب آئے۔گھر سے لاتعلق رہ کر، بال بچوں کی ضروریات سے بے پروا ہو کر اہل خانہ کی تربیت وتعلیم کی حاجت سے آنکھیں پھیر کر اور بیوی بچوں کو فطری جذبوں سے محروم کر کے تنظیم کے کاموں میں ڈوب جانے والوں کی تحسین وتعریف کا رجحان پیدا ہوا۔

ایسا کرنے والوں کے اخلاص وایثار سے ہمیں بھی انکار نہیں ہے لیکن خدمتِ اسلام کے لیے جتنی ضرورت

اخلاص اور ایثار کی ہوتی ہے، اس سے کہیں بڑھ کر حکمت اور تعین ترجیحات کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکمت وتدبر اور ہدف وترجیح سے خالی اخلاص وایثار اکثر اوقات قافلوں کی توانائیاں اور شوقِ سفر تو چوس لیتا ہے لیکن منزل سے دور کر دیتا ہے۔

آج ایک احساس اور خیال سامنے آنے لگ گیا ہے کہ اسلامی تحریکوں سے وابستہ ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی ہے جن کے نظریات وافکار، جن کے اخلاق وکردار اور جن کے عقائد کا ہلکا سا رنگ بھی ان کے خاندان پر دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ جن کی اولاد کنٹرول سے باہر اور بیویاں دینی مطالبات سے آزاد ہیں۔

تین طرح کے میلانات تحریکی خاندانوں میں پروان چڑھ رہے ہیں۔

اولاً......: ایسے گھرانے ہیں جہاں صاحب خانہ تحریک وتنظیم کی سرگرمیوں میں گم رہتا ہے، اس کے بیوی بچے دین کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہیں کرتے۔ وہ اقوام کی انتہا پسند سوچ کے ردعمل میں ایک دوسری انتہا کی طرف چل پڑے ہیں۔ غیر اسلامی رویے منفی ردعمل کے نتیجے میں ایسے گھرانوں کے اندر جڑیں پکڑ رہے ہیں۔

ثانیاً......: ایسے گھرانے ہیں جہاں میاں بیوی اور اولاد اور والدین کے اندر ربط وتعلق، ہم آہنگی اور خوشگواری کا فقدان ہے، دین سے بغاوت نہیں ہے لیکن آپس میں سب ایک دوسرے سے مائل بہ بغاوت ہیں۔ خانگی فضا سرگرمی، جوش، باہمی احترام ومحبت اور شفقت وپیار سے خالی ہے۔ سب گھر میں ایسے رہتے ہیں جیسے ہوٹل میں مقیم انجانے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے لاتعلق سے ہوتے ہیں۔ بعض گھرانوں میں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسلام سے وابستگی اور اسلام کی دعوت وخدمت کا کام بھی گھر کی بے زارکن، گھٹن سے بھری ہوئی فضا اور کھچاؤ سے آلودہ ماحول سے فرار کا ایک بہانہ ثابت ہوتا ہے۔

ثالثاً......: ایسے گھرانے ہیں جہاں مرد جاہلی روایات کے تحت سمجھ بیٹھا ہے کہ محض مرد ہونے کی وجہ سے وہ جابرانہ اور آمرانہ اختیارات کا مالک ہے۔ تحریکی ہوتے ہوئے بھی اسلامی طرز عمل اپنانے کے بجائے گھر کی چار دیواری کے اندر وہ پورے ڈکٹیٹر کی حیثیت میں سامنے آتا ہے۔ وہ خانگی اور خاندانی معاملات میں نہ بیوی بچوں سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا ہے اور نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ نہ کسی اظہار کی اجازت دیتا ہے اور نہ اعتراض اور سوال کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں افہام وتفہیم اور معقولیت کی بنیاد پر احترام وقبولیت کا امکان نہیں ہوتا۔ باہر اسلام کے پرکشش تصورات کو پیش کرنے والا شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بدو اور ایک بڑھیا کے سوالات کو اسلام میں آزادیِ اظہار رائے اور امیر کے تحمل وبرداشت کے لیے نظیر بناتا ہے، لیکن اپنے گھر کے اندر اپنی رائے اور اپنے فیصلے سے اختلاف کو سنگین جرم سمجھتا اور ایسے مجرم کو خواہ وہ اس کی بیوی ہو یا بیٹا

یا بیٹی سخت سزا کا مستوجب گردانتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں رجحان اسلامی تقاضوں اور تعلیمات کے منافی اور خاندانی نظام و استحکام کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ گو کہ صحیح اسلامی رنگ رکھنے والے تحریکی گھرانے ابھی ایک اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن ضعف کی طرف خاندانی ادارے کی ڈھلان ایسی علامت ہے جو فی الحال مستقبل کے ایک بڑے خطرے اور فتنے کی طرف انتباہ کا نشان ہے۔ اسلامی تحریکوں کو اپنے مراکز میں تربیتی کورسوں اور نشستوں کے قیام سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ تربیت کے مطلوبہ معیار و ہدف کو وہ پا رہی ہیں۔ اسلام کے بکھرے بکھرے تصورات دوسروں تک پہنچانے پر اکتفا کرنے کی بجائے پوری تہذیبی عمارت اور سارے تمدنی ڈھانچے کو اسلام کے تابع کرنے کی تدبیر کی ضرورت ہے۔ خاندان اور گھر کو مسافر خانے، کسی کمرشل، کسی رفاہی فورم پر قیاس کرنے کی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔

معروف عرب دانشور اور اسکالر رشدی فکار نے اپنے ایک انٹرویو میں بڑی زبردست اور قابل غور بات کی تھی کہ:

''اسلام کی رو سے خاندان ...... مرد اور عورت کا رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر، شریک سفر بن کر نئی زندگی کا آغاز کرنا ...... مالی منفعتوں اور اقتصادی تحفظات کا کمرشل ادارہ نہیں بلکہ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ کی روشنی میں یہ اللہ کی نشانیوں میں ایک نشانی اور اس کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔'' [روزنامہ 'اتحاد' ابوظہبی۔ ۶ جنوری ۱۹۸۹ء]

اسلامی تحریکوں کو چاہیے کہ کوئی بڑی خرابی رونما ہونے اور دشمنان اسلام کی خواہش و کوشش کے مطابق خاندان جیسے ادارے کے مسلم معاشرے میں اور خاص طور پر تحریکوں سے وابستگان کے ہاں روبہ انہدام ہونے سے پہلے اس رخ پر توجہ دیں۔ اپنی سرگرمیوں کی تربیت اس طرح رکھیں کہ ہر سرگرمی تمدنی مظاہر کی شوکت اور مضبوطی پر منتج ہو۔ خاندانی نظام کی تعمیر میں وہ ترتیب ملحوظ رہے جو مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے پیش کی تھی:

''خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تا کہ وہ گھر میں ضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام خاندانی کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی ذمہ دار نہ ہو۔ نظم بہرحال ایک ذمہ دار ناظم ہی سے قائم ہو سکتی ہے اور اسلام کے نزدیک اس ذمہ داری کے لیے خاندان کا باپ ہی فطرتاً موزوں ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر فرماں روا بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو

اصلاح کے لیے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لیے۔'' ['اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات' از مودودیؒ]

ہمیں امید ہے کہ اسلامی تحریکوں کی قیادتیں سڑکوں اور چوراہوں پر اپنی طاقت کا اظہار اور جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کرتے ہوئے احساس وشعور سے دیوالیہ ہونے کا مظاہرہ نہیں کریں گی کہ مسلمان عورت کو گھر کے قلعے کی دائمی محافظ کی ڈیوٹی سے فارغ نہیں کیا جانا چاہیے۔ خاندان اور گھر اسلامی تہذیب کی آخری اور مضبوط ترین پناہ گاہ ہے۔ اس پناہ گاہ کو مضبوط بنانے کے لیے ہمارے ماہرینِ عمرانیات کو اسی طرح منصوبہ سازی کرنی چاہیے جس طرح اسلام کے دشمن اسے مسمار کرنے کی منصوبہ بندی میں طویل عرصہ سے مصروف ہیں۔ مسلمان عورت کو دین و دنیا کے علوم سے آراستہ کرنا، وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کے قابل بنانا، اردگرد کی دنیا میں رونما ہونے والے حالات سے باخبر رکھنا بہت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ اسے ان فتنوں اور ان خطروں سے آگاہ کردیا جائے جو مسلم امہ کے خلاف برپا اور اسے درپیش ہیں۔ اسے اس بات کا احساس دلانا بھی وقت کی سب سے بڑی پکار ہے کہ خاندان کے نظام کا استحکام و انضباط اسی پر منحصر ہے کہ وہ خاوند کی مطیع و فرماں بردار، معاون و مددگار اور بچوں کی مربیہ اور معلّمہ اور اسلامی اقدار کی گھر اور خاندان کے ماحول کے اندر سب سے بڑی نگہدار ہے۔

اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تحریک اسلامی کی سپاہ کا ایک اہم حصہ ہے تاہم اس کا محاذ جدا ہے اور وہ مرد سے مختلف محاذ پر بیٹھ کر اسلامی تہذیب وثقافت، اسلامی اخلاقیات اور اسلامی اذہان وقلوب کی حفاظت پر مامور ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اسلامی تحریکوں کو صالح، خداترس، پاکباز، بلند کردار اور اعلیٰ ایمانی صفات کی حامل نئی نسل کے سپاہیوں کی سپلائی لائن قائم رکھے۔ عمدہ تربیت سے آراستہ کارکنانِ تحریک کو اپنی آغوش میں پروان چڑھا کر تحریکِ اسلامی کے حوالے کرے۔

تحریکِ اسلامی کے فکر سے متاثر خواتین کے لیے یہ بڑا ضروری ہے کہ وہ قرآن وحدیث میں عورت سے متعلق جتنے احکام اور جو بھی تعلیمات آئی ہیں ان سے واقف اور ان پر عمل پیرا ہوں☆، اور ان احکام وتعلیمات پر اس کی مستقل نظر رہے تاکہ اس کی بھول جانے والی فطرت غالب آکر اسے اسلام کی تعلیمات اور اپنے فرائض کے شعور سے غافل نہ کردے۔(1)



(۱) [بشکریہ:'عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں' :از منیر احمد خلیلی (ص۲۳۹تا۲۴۵)]

☆......[خواتین کے احکام ومسائل پر ہماری کتاب: هدية النسآء کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ ان شاء الله (مؤلف)]

باب ۱۳:

والدین کے لیے ایصالِ ثواب

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر شخص قیامت کے روز اپنے اعمال کا جواب دہ ہوگا۔ دنیا میں بھی ہر انسان کو اپنی نیکی خود کرنا ہے۔ نماز ہر شخص پر فرض ہے، اور ہر شخص کو اپنے حصے کی نماز خود ادا کرنا ہے۔ ایک شخص کی نماز دوسرا نہیں پڑھ سکتا اور نہ ہی ایک کو چھوڑ کو دوسرے سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

والدین اس بات کے تو جواب دہ ہوں گے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو نیکی کی راہ پر چلانے کی کوشش کی یا نہیں، لیکن اگر ان کی تمام تر کوشش کے باوجود اولاد نیکی کی راہ اختیار نہیں کرتی تو اس کی ذمہ داری پھر والدین سے ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر والدین اس سلسلہ میں کوئی کوشش ہی نہیں کرتے بلکہ بگڑتی ہوئی اولاد کو مزید بگاڑنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں تو پھر وہ بھی اولاد کے گناہوں میں ان کے شریک بن جاتے ہیں۔ جتنا گناہ اولاد کو ہوگا، اتنا ہی والدین کو بھی ہوگا۔

اس کے برعکس اگر والدین کی کوششوں سے اولاد نیکی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اولاد کی طرف سے کیا جانے والا ہر نیک عمل خود اولاد کے لیے بھی باعثِ ثواب ہوگا اور والدین بھی اتنا ہی ثواب مفت میں حاصل کریں گے جیسا کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ عِلْمًا عَلَّمَهُ وَنَشَرَهُ وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ أَوْ مَسْجِدًا بَنَاهُ أَوْ بَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ أَوْ نَهْرًا أَجْرَاهُ أَوْ صَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ يَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ)) (1)

''مومن آدمی کو اس کے عمل اور نیکیوں سے اس کی موت کے بعد بھی جو فائدہ ملتا رہتا ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہیں:

ا۔ ایسا علم جس کی اس نے تعلیم دی اور اسے نشر کیا۔

(۱) [سنن ابن ماجه، المقدمه، باب ثواب معلم الناس الخير (ح۲۴۲) ابن خزيمه (ح۲۴۹۰) شعب الايمان، للبيهقيؒ (ح۳۴۴۸) صحيح الجامع الصغير، للالبانيؒ (ح۲۲۳۱)]

۲۔ایسی اولاد جسے اس نے نیکی کی راہ دکھائی۔

۳۔وہ نسخۂ قرآن (یا دینی کتابیں) جسے اس نے اپنے وِرثہ (ترکہ) میں چھوڑا۔

۴۔وہ مسجد جو اس نے تعمیر کی۔

۵۔وہ مسافر خانہ جو اس نے تعمیر کیا۔

۶۔وہ نہر جو اس نے کھدوائی۔ (جاری کی)

۷۔وہ مال جو اس نے اپنی زندگی میں حالتِ صحت کے ساتھ صدقہ کیا۔''

والدین کے لیے ایصالِ ثواب......جائز اور ناجائز صورتیں:

قرآن وحدیث کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعمال ایسے ہیں کہ اگر والدین کی طرف سے انہیں کیا جائے تو والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا فائدہ اور ثواب والدین کو پہنچتا ہے۔لیکن یاد رہے کہ یہ وہی چند مخصوص اعمال ہیں جنہیں قرآن وحدیث میں بیان کر دیا گیا ہے، ان کے علاوہ اور کوئی ایسا عمل نہیں کیا جاسکتا جو قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو۔افسوس کہ ہمارے ہاں ایصالِ ثواب کے نام پر عجیب وغریب رسمیں بن گئی ہیں، اس سلسلہ میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ثواب کے سلسلہ میں الٹا گناہ ہی ہمارے اعمال نامے میں لکھا جائے۔

آئندہ سطور میں ہم غیر جانبدارانہ طور پر ان تمام صورتوں کی نشاندہی کررہے ہیں جن سے والدین کو مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح فائدہ اور ثواب پہنچتا ہے، مگر یہ یاد رہے کہ یہ فائدہ اور ثواب صرف اسے ہوگا جو ایمان اور توحید کی حالت میں فوت ہوا لیکن جو شخص حالتِ شرک میں فوت ہوا، اس کے ایصالِ ثواب کی نیت سے ان نیک اعمال کو انجام دینا ہی درست نہیں اور اگر یہ اعمال اس کی بخشش کی نیت سے کر بھی لیے جائیں تو تب بھی اسے ان چیزوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اللہ ہمیں ہر طرح کے کفر و شرک سے بچائے اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

۱)......دعا:

والدین سمیت ہر وہ مسلمان جو توحید و ایمان کی حالت میں فوت ہوا، اس کے لئے مغفرت و بخشش کی دعا

کی جاسکتی ہے اوراس دعا کا مرنے والوں کوفائدہ بھی ہوتا ہے۔مرنے والوں کے لیے دعائے مغفرت درج ذیل دلائل سے ثابت ہے:

☆......﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾[الحشر۔١٠]

''اور جو لوگ ان (اہل ایمان) کے بعد آئے ،وہ (اپنے اور مرنے والوں کے لیے یہ) دعا کرتے ہیں:''اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کوبھی (بخش دے) جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کینہ نہ بنا۔اے ہمارے پروردگار! بلاشبہ تو مشفق و مہربان ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ فوت شدگان کے لئے کوئی بھی مسلمان مغفرت کی دعا کرسکتا ہے۔اور اولاد تو اس بات کا زیادہ حق رکھتی ہے کہ اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔

اسی طرح یہ بات درج ذیل حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے:

☆......((عن عائشةؓ: ان النبی ﷺ كَانَ يَخْرُجُ إِلَى الْبَقِيعِ فَيَدْعُوا لَهُمْ فَسَأَلَتْهُ عَائِشَةُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَدْعُوَ لَهُمْ)) (۱)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ بقیع کے قبرستان کی طرف جایا کرتے اور وہاں مدفون مُردوں کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ) میں نے آپؐ سے اس بارے میں پوچھا،تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے ان کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

۲)......والدین کے لیے صدقہ جاریہ:

صدقہ جاریہ سے مراد وہ نیک کام ہیں جن کا ثواب آدمی کو وفات کے بعد بھی ملتا رہتا ہے مثلاً اللہ کی راہ میں کسی چیز (گھر،ہسپتال،وغیرہ) کو وقف کردینا۔جب تک وہ چیز موجود رہے گی،تب تک وقف کرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں خود اس طرح کا کوئی صدقہ نہ کرسکے مگر اولاد اس کی طرف سے ایسا صدقہ کردے تو اس کا ثواب مرنے والے کو پہنچتا رہے گا۔اس کے دلائل درج ذیل ہیں:

---

(۱) [مسند احمد (ج٦ص٢٥٢)]

☆......حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَامَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ ")) (1)

''جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا ہر عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے:

۱۔صدقہ جاریہ

۲۔اس کا پھیلایا ہوا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے۔

۳۔اور وہ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔''

ان تینوں چیزوں کا ثواب اسے مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو نیک بنا جائے تو اولاد یقیناً والدین کو دعائیں دیتی ہے اور اگر اولاد کو نفع مند علم بھی سکھایا ہو تو اس علم کی روشنی جب تک جگمگاتی رہے گی، اس کا ثواب بھی مرنے والے کو ملتا رہے گا۔ اور اگر مرنے والا اپنی زندگی میں صدقہ جاریہ بھی کر جائے تو اس تیسری چیز کا ثواب بھی اسے پہنچتا رہے گا۔ اور اگر وہ خود صدقہ جاریہ نہ کر سکا ہو تو اولاد کو چاہیے کہ اپنے والدین کی طرف سے کچھ صدقہ جاریہ کر دیں تاکہ اس کا ثواب بھی انہیں پہنچتا رہے۔ آج اگر ہم اپنے والدین کے لیے یہ عمل کریں گے تو کل کو ہماری اولاد بھی ہمارے لیے اس طرح کی نیکیاں کرتی رہے گی۔ ان شاء اللہ!

☆......حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بلاشبہ مومن آدمی کو اس کے عمل اور نیکیوں سے اس کی موت کے بعد بھی جو فائدہ ملتا رہتا ہے اس میں یہ چیزیں شامل ہیں:

۱۔ایسا علم جس کی اس نے تعلیم دی اور اسے نشر کیا۔ (۲) اور نیک اولاد۔ (۳) مصحف (قرآن) جو اس نے ورثہ کے لیے چھوڑا۔ (۴) یا جو اس نے مسجد تعمیر کی۔ (۵) یا مسافر خانہ تعمیر کیا۔ (۶) یا نہر جاری کی۔ (۷) یا اپنی زندگی اور تندرستی میں اپنے مال سے صدقہ نکالا، تو اسے مرنے کے بعد بھی ان کا اجر ملتا رہے گا۔'' (2)

---

(۱) [صحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاته (ح ۱۴۔۱۶۳۱)]

(۲) [ابن ماجه، المقدمه، باب ثواب معلم الناس الخیر (ح ۲۴۲) ابن خزیمه (ح ۲۴۹۰) شعب الایمان، للبیهقیؒ (ح ۳۴۴۸) صحیح الجامع الصغیر، للالبانیؒ (ح ۲۲۳۱)]

۳)......والدین کی طرف سے عام صدقہ:

اگر کوئی شخص اپنے فوت شدہ والدین کی طرف سے ان کی وفات کے بعد عام صدقہ وخیرات بھی کرے تو صدقہ جاریہ کی طرح اس صدقے کا بھی مرنے والے کو ثواب پہنچتا ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ صدقہ جاریہ کا ثواب اس وقت تک پہنچتا رہتا ہے جب تک صدقہ جاریہ کے طور پر دی جانے والی چیز موجود رہتی ہے جبکہ عام صدقے کا ثواب اپنی حیثیت اوراہمیت کے اعتبار سے ایک ہی مرتبہ مرنے والے کو پہنچ جاتا ہے۔

والدین کی طرف سے صدقہ خیرات دینے کے دلائل درجِ ذیل ہیں:

☆......حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ اِنَّ اُمِّیْ اُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَاُرَاهَا لَوْتَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ، اَفَاَ تَصَدَّقُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ تَصَدَّقْ عَنْهَا))(۱)

''ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:''میری ماں اچانک فوت ہوگئی ہے،میرا خیال ہے کہ اگر وہ مرتے وقت بات کر لینے کا موقع پالیتی تو ضرور صدقہ کرتی۔کیا اب میں اس کی طرف سے صدقہ کردوں؟''آپ ﷺ نے فرمایا:''ہاں تو اس کی طرف سے صدقہ کر۔''

☆......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اُمَّهُ تُوُفِّيَتْ اَيَنْفَعُهَا اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَاِنَّ لِيْ مِخْرَافًا فَاَنَا اُشْهِدُكَ اَنِّيْ قَدْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا "(۲)

''ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا:میری ماں فوت ہوگئی ہے،اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں،تو کیا اسے کوئی نفع پہنچے گا؟''آپ نے فرمایا:''ہاں۔''تو اس آدمی نے کہا:''میرا ایک پھل دار باغ ہے،میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے وہ باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کردیا۔''

میت کی طرف سے ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ کرنے کے حوالے سے یہ بات واضح رہے کہ صرف

---

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الوصایا، باب مایستحب لمن توفی فجاۃ ان یتصدقوا عنه وقضاء النذور عن المیت (ح۲۷٦۰۔ ۱۳۸۸)صحیح مسلم،کتاب الزکاۃ،باب وصل ثواب الصدقة عن المیت (۱۰۰٤)ابو داؤد (۲۸۸۱)]

(۲) [صحیح بخاری، کتاب الوصایا(ح۲۷۷۰،۲۷۵٦،۲۷٦۲)ابو داؤد، کتاب الوصایا(ح۲۸۸۲) ترمذی، کتاب الزکاۃ (ح٦٦۹)نسائی (ح۳٦۵٦،۳٦۵۷)سنن بیهقی (ج٦ص۲۷۸)]

اولاد ہی اپنے والدین (اور دادا، نانا وغیرہ) کی طرف سے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کرسکتی ہے۔ کسی اور کی طرف سے میت کے لیے صدقہ کرنے کی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔

۴)...... والدین کی طرف سے حج کرنا:

والدین پر ان کی زندگی میں حج فرض ہوا ہو مگر وہ کسی عذر کی وجہ سے حج کا فریضہ ادا نہ کرسکے ہوں تو ان کی وفات کے بعد ان کی طرف سے ان کی اولاد حج کرسکتی ہے۔ اس طرح اگر اولاد ان کی طرف سے حج کرلے تو ان کا یہ فرض ادا ہو جاتا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

((اِنَّ اِمْرَاَۃً مِنْ جُھَیْنَۃَ جَاءَ تْ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَتْ: اِنَّ اُمِّیْ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ حَتّٰی مَاتَتْ اَفَاَحُجُّ عَنْھَا؟ قَالَ: نَعَمْ، حُجِّیْ عَنْھَا اَرَاَیْتِ لَوْ کَانَ عَلٰی اُمِّكِ دَیْنٌ اَکُنْتِ قَاضِیَتِہٖ؟ اُقْضُوا اللّٰہَ فَاللّٰہُ اَحَقُّ بِالْوَفَاءِ)) (۱)

''جُھَیْنَہ قبیلے کی ایک عورت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی۔ اس نے کہا: میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی مگر وہ فوت ہوگئی ہے اور حج نہیں کرسکی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں، تم اس کی طرف سے حج کرو۔'' (پھر آپؐ نے اس سے کہا:) ''بتاؤ! تمہاری ماں پر اگر قرض ہوتا تو کیا تم اس کا قرض ادا نہ کرتی؟'' (جس طرح قرض بندوں کا حق ہے اور اسے ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح) اللہ کا حق ادا کرو۔ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کا حق ادا کیا جائے۔''

۵)...... والدین کی طرف سے قربانی:

اس مسئلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم تو حج پر کی جانے والی قربانی پر قیاس کرتے ہوئے اور چند دیگر دلائل کی بنیاد پر اسے جائز قرار دیتے ہیں جبکہ بعض اس کے جواز کے قائل نہیں۔ دونوں طرف دلائل موجود ہیں، تاہم اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ والدین کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے، کیونکہ قربانی سے متعلقہ دلائل اس مسئلہ میں مجھے زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم!

۶)...... والدین کے فرضی روزوں کی ادائیگی:

اگر والدین پر روزے فرض ہوں خواہ وہ رمضان کے روزے ہوں یا نذر کے، مگر وہ لمبی بیماری یا بڑھاپے

---

(۱) [بخاری، کتاب جزاء الصید، باب الحج والنذور عن المیت (ح ۱۸۵۲) نسائی، کتاب المناسك، (ح ۲۶۳۲، ۲۶۳۱) مسند احمد (ج ۱ ص ۲۳۹، ۲۷۹، ۳۴۵)]

کے علاوہ کسی اور وجہ سے موقع اور صحت ملنے کے باوجود اپنے روزوں کی قضا نہ دے سکیں تو اولاد، والدین کی طرف سے ان روزوں کی قضا دے سکتی ہے۔ ان کی قضائی کے بعد والدین سے اس مسئلہ میں باز پرس نہ ہوگی، بلکہ اولاد کی طرف سے ان کی ادائیگی تسلیم کرلی جائے گی جیسا کہ درج ذیل دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔

☆......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

((جَاءَتْ اِمْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ يَارَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ أُمِّيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ نَذْرٍ أَفَأَصُومُ عَنْهَا؟ قَالَ: أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ فَقَضَيْتِيهِ أَكَانَ يُؤَدِّيْ ذٰلِكَ عَنْهَا؟ فَقَالَتْ: نَعَمْ، قَالَ: فَصُومِيْ عَنْ أُمِّكِ))(1)

''ایک عورت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس کے ذمے نذر کے روزے ہیں، کیا میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے بتاؤ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا اور تم وہ ادا کرتی، تو کیا اس کی طرف سے اس کی ادائیگی ہوجاتی یا نہیں؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں، ہوجاتی!'': آپؐ نے فرمایا: ''پھر تم اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھو۔'' [یعنی یہ بھی قرض کی طرح قابل ادائیگی ہے]

☆......اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ))(1)

''جو آدمی مر جائے اور اس کے ذمے روزے ہوں تو اس کی جانب سے اس کا ولی روزے رکھے۔''

☆......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

((أَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ اِسْتَفْتٰى رَسُولَ اللّٰهِ فَقَالَ: إِنَّ أُمِّيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا نَذْرٌ؟ فَقَالَ: اِقْضِهِ عَنْهَا))

---

(۱) [صحيح بخاری، کتاب الصوم، باب من مات وعليه صوم (ح۱۹۵۳)صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب قضاء الصيام عن الميت (ح۱۵٦،۱۱٤۸)]

(۲) [صحيح بخاری، کتاب الصوم، باب من مات وعليه صوم (ح۱۹۵۲)صحيح مسلم، كتاب الصيام، باب قضاء الصيام عن الميت (ح۱۵۳)سنن ابو داؤد، کتاب الصيام،باب فيمن مات وعليه صيام (ح۲٤۰۰) سنن بيهقی (ج٦ص۲۷۹)مسنداحمد (ج٦ص۲۹)]

''حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''میری والدہ فوت ہوگئی ہیں ان کے ذمہ نذر تھی، اس کا کیا کیا جائے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اس کی طرف سے اس نذر کو پورا کرو۔''[1]

☆......اسی طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ:

((إِذَا مَرِضَ الرَّجُلُ فِيْ رَمَضَانَ ثُمَّ مَاتَ وَلَمْ يَصُمْ أُطْعِمَ عَنْهُ وَلَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ قَضَاءٌ وَإِنْ كَانَ عَلَيْهِ نَذْرٌ قَضَى عَنْهُ وَلِيُّهُ))[2]

''جب کوئی آدمی رمضان میں مریض ہونے کے بعد مر جائے اور اس نے روزے نہ رکھے ہوں، تو اس کی طرف سے کھانا (یعنی فدیہ) دیا جائے اور اس کی طرف سے روزوں کی قضا نہیں ہوگی اور اگر اس پر نذر کے روزے ہوں، تو پھر اس کی طرف سے اس کا ولی ان کی قضائی دے گا۔''

واضح رہے کہ میت کے متروکہ فرضی (یعنی رمضان کے) روزے رکھنے کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض تو نذر کی طرح اس کے بھی جواز کے قائل ہیں جبکہ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ صرف نذر کے روزے جائز ہیں رمضان کے روزوں کی قضائی نہیں دی جائے گی، بلکہ میت کے متروکہ رمضان کے روزوں کی جگہ فدیہ ادا کیا جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ میت کی طرف سے روزے رکھنے والی عمومی احادیث کی بنیاد پر ہر طرح کا فرضی روزہ ان کی طرف سے رکھا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر میت کی طرف سے بڑھاپے وغیرہ کے عذر کی وجہ سے روزے نہیں رکھے گئے تو پھر ان روزوں کی قضائی نہیں بلکہ فدیہ دیا جائے گا۔ اس کی مزید تفصیلات ہم اپنی عبادات سے متعلقہ کتاب میں پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ!

۷)...... والدین کی طرف سے قرض کی ادائیگی:

والدین کے ذمہ اگر قرض ہو اور وہ اپنے پیچھے اتنی جائیداد چھوڑ کر نہ مرے ہوں جس سے ان کا یہ قرض ادا کیا جاسکتا ہو تو پھر اولاد، اولیاء اور ورثاء سمیت کوئی بھی شخص ان کا یہ قرض ادا کرسکتا ہے۔ البتہ سب سے

---

(۱) [صحیح بخاری، کتاب الوصایا (ح۲۷۶۱) مسلم، کتاب النذر، باب الامر بقضاء النذر (ح۱۶۳۸) ابو داؤد، کتاب الایمان والنذور، باب فی قضاء النذر عن المیت (ح۳۳۰۷) ترمذی، کتاب النذور والایمان، (ح۱۵۴۶) نسائی، کتاب الوصایا (ح۳۶۶۲، ۳۶۶۴) ابن ماجه، کتاب الکفارات (ح۲۱۳۲)]

(۲) [ابو داؤد، کتاب الصیام، باب فیمن مات وعلیه صیام (ح۲۴۰۱) المحلی، لابن حزم (ج۷۔ص۷)]

زیادہ اولاد اس ذمہ داری کی اہل قرار پاتی ہے۔

اولاد کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرض کا معاملہ بڑا نازک ہے حتی کہ شہید فی سبیل اللہ اگر مقروض ہو کر مرا ہو تو اسے بھی اس وقت تک نہ بخشا جائے گا جب تک اس کی طرف سے قرض ادا نہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ بھی اسے اتنا اہم قرار دیتے تھے کہ مقروض کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''ایک آدمی فوت ہو گیا۔ ہم نے اسے غسل دے کر کفن پہنایا، خوشبو لگائی اور جنازہ گاہ میں رکھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو نمازِ جنازہ کے لیے اطلاع دی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''میرے خیال میں تمہارے اس ساتھی کے ذمے کوئی قرض باقی ہے؟''

صحابہ کرامؓ نے کہا: ''ہاں! دو دینار اس پر قرض ہے۔'' آپؐ پیچھے ہٹ گئے اور فرمایا: ''اپنے ساتھی کا جنازہ تم خود ہی پڑھ لو۔''

اسی دوران ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسولؐ! میں اس کی طرف سے اس قرض کی ادائیگی کر دوں گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر تم پر وہ دو دینار اپنے مال میں سے ادا کرنا فرض ہے اور میت ان سے بری ہے۔'' [اس ضمانت کے بعد آپؐ نے اس میت کی نمازِ جنازہ ادا کی]

بعد میں نبی اکرم ﷺ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے ملے تو ان سے پوچھا: ''تم نے دو دیناروں کا کیا کیا؟''

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ وہ تو ابھی کل ہی فوت ہوا ہے۔'' (اس لئے ابھی میں وہ قرض ادا نہیں کر پایا)۔

پھر آپؐ دوبارہ ان سے ملے تو اس قرض کے بارے میں پوچھا۔ اس مرتبہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں، اللہ کے رسولؐ! میں نے وہ قرض ادا کر دیا ہے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب اس (میت) پر اس کی جلد ٹھنڈی ہوگئی ہے۔'' (یعنی قرض کی ادائیگی سے اس پر سے سختی اٹھ گئی ہے)[1]

حاصلِ بحث:

مندرجہ بالا سطور میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وہ تمام صورتیں ذکر کر دی گئی ہیں جن کا فائدہ کسی نہ کسی

(۱) [مستدرك حاكم (ج٦ ص٥٨) سنن بيهقى (ج٦ ص٧٤، ٧٥) مسند طيالسى (ح١٦٧٣) مسند احمد (ج٣ ص٣٣٠) مجمع الزوائد (ج٣ ص٣٩)]

طرح والدین کو مرنے کے بعد پہنچتا ہے، البتہ اس کے علاوہ ایصالِ ثواب کے دیگر طریقے مثلاً قل، تیجہ، ساتواں، چالیسواں، مختلف لوگوں سے قرآن خوانی وغیرہ سب لوگوں کی بنائی ہوئی رسمیں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ بھی انہیں رسمیں ہی تسلیم کرتے ہیں، اخباروں میں بھی اسی طرح اعلان کیا جاتا ہے: فلاں صاحب کی "**رسمِ قل**" فلاں تاریخ کو ہوگی۔...... فلاں صاحب کی "**رسمِ چہلم**" فلاں تاریخ کو ہوگی......!

یاد رہے کہ ان رسموں کا قرآن وحدیث سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے دور میں فوت شدگان کے لیے اس طرح کی کوئی رسم نہیں کی جاتی تھی، اس لیے ہمیں بھی ان سے ہر ممکنہ اجتناب ہی کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں لوگ ان رسموں کو عبادات کا درجہ دیتے ہیں حالانکہ عبادات میں ہم اپنی مرضی سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتے، اگر کریں گے تو وہ بدعت کہلائے گا جس کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ:

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"لم یکن من عادة السلف اذا صلوا تطوعا وصاموا وحجوا وقرءوا القرآن انهم کانوا یهدون ثوابهم الی الاموات انما کانوا یدعون لهم ویستغفرون لهم فلاینبغی للناس ان عدلو عن الطریق السلف فانه افضل واکمل"[1]

'سلف صالحین کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ نفلی نماز پڑھنے، روزہ رکھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد اس کا ثواب میت کو پہنچاتے ہوں (جس طرح کہ ہمارے ہاں معمول بنالیا گیا ہے!) وہ تو ان کے حق میں دعا کرتے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کیا کرتے تھے۔ اس لئے لوگوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سلف کا طریقہ چھوڑ دیں کیونکہ سلف ہی کا طریقہ افضل اور اکمل ہے۔'



۱) [مجموع الفتاویٰ، لابن تیمیةؒ (ج۲۴ ص۲۲۳)]

والدین کی طرف سے نیکی کرنے کے بارے میں چند سوالات

والدین کے لیے حج بدل کی ادائیگی

سوال:

میں نے ۶ برس قبل فریضۂ حج ادا کیا تھا۔اس سال میں دوبارہ حج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔ میرے والدین حیات ہیں۔کیا میں ان کی جانب سے حج بدل کرسکتا ہوں؟اس صورت میں مجھے پہلے کس کی جانب سے حج ادا کرنا چاہیے؟ کیا اس صورت میں مجھے قربانی کرنی ہوگی ؟ قربانی کی صورت میں کیا میں گائے یا اونٹ میں حصہ لے سکتا ہوں؟

جواب:

آپ یقیناً اپنے والدین میں سے کسی ایک کی جانب سے حج ادا کر سکتے ہیں، کیونکہ آپ اپنی جانب سے یہ فریضہ چھ برس پہلے ادا کر چکے ہیں۔آنحضرت ﷺ جب حج پر تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے ایک شخص کو تلبیہ پڑھتے سنا۔تلبیہ بندے کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ اے اللہ! میں تیرے حکم کی تعمیل میں حج کے لیے حاضر ہوں۔لیکن وہ شخص تلبیہ کے کلمہ کے آخر میں یہ اضافہ کررہا تھا کہ وہ ایسا (حج) شبرمہ کی جانب سے کررہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا کہ شبرمہ کون ہے؟اس شخص نے جواب دیا کہ میرا بھائی ہے۔نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم حج ادا کر چکے ہو؟اس شخص نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے تم خود حج کرو،اس کے بعد شبرمہ کی جانب سے حج ادا کر سکتے ہو۔اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج بدل کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ حج بدل کرنے والا پہلے خود حج کر چکا ہو۔

آپ اپنی والدہ اور والد......دونوں کی جانب سے بیک وقت حج ادا نہیں کر سکتے ۔ایک وقت میں کسی ایک ہی شخص کی جانب سے حج کیا جاسکتا ہے۔یہ بات اہم نہیں ہے کہ پہلے کس کی جانب سے حج کریں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ پہلے والدہ کی جانب سے حج بدل کرنا چاہیے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ پہلے والد کی

طرف سے حج کیا جانا چاہیے۔ بہر حال آپ پہلے جس کی جانب سے بھی حج بدل کریں وہ درست ہوگا۔
اگر آپ تمتع یا قران کے طریقے سے حج کریں گے تو یقیناً آپ کو قربانی بھی کرنا ہوگی۔ والدین کی جانب سے حج کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ آپ گائے یا اونٹ کی قربانی میں شریک ہو سکتے ہیں۔
حج بدل ایک سہولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فراہم کی ہے، جو لوگ حج کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، لیکن بیماری یا کسی اور جائز مجبوری کی وجہ سے حج کا سفر نہیں کر سکتے، انہیں یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی جانب سے کسی دوسرے شخص کو حج پر بھیج دیں۔ اس صورت میں انہیں حج بدل پر جانے والے شخص کے سفر کے تمام اخراجات ادا کرنا ہوتے ہیں۔ جو حضرات ملازمت کے سلسلہ میں سعودی عرب میں مقیم ہیں انہیں یہ موقع میسر ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر عزیزوں کی جانب سے فریضہ حج ادا کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حضرات ایسا کرتے ہیں وہ اپنے والدین اور دیگر بزرگوں کے لیے نہایت خلوص اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہیں، تاہم انہیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ حج ایک شخصی عبادت ہے اور جو شخص سفر کرنے کی قوت رکھتا ہو، اسے خود یہ فریضہ ادا کرنا چاہیے۔
لہٰذا اگر آپ کے والد حج کے سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو انہیں حج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ حج کی ادائیگی کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر آپ ان کے سفر کے اخراجات ادا کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس صورت میں آپ کو چاہیے کہ آپ انہیں ٹکٹ فراہم کریں تاکہ وہ خود آ کر حج ادا کر سکیں۔ یقیناً آپ کو اس نیکی کا بڑا اجر ملے گا۔ آپ ان کی جانب سے حج ادا کرنے کا ارادہ اسی وقت کریں جب آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہو کہ آپ والد کو سفر کے اخراجات فراہم کر سکیں۔ [1]

والدین کو حج کے وسائل مہیا کرنا:

سوال:

ایک بار آپ نے کسی قاری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ بیوی کے حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں شوہر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیا یہی بات والد کے معاملے پر بھی منطبق ہوتی ہے؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے والد کو سفرِ حج کے اخراجات کے لیے رقم بھیجی ہے۔ کیا اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

(۱) [اسلامی طرز فکر، از عادل صلاحی (ج ۱ ص ۱۹۴ تا ۱۹۶)]

جواب:

حج ،ایک انفرادی عبادت ہے۔اگرایک شخص حج کی ادائیگی کے لیےضروری شرائط پوری کرسکتا ہے تواس پرحج فرض ہےاوراگرکوئی شخص ان شرائط کو پورانہیں کرسکتا تواس پرحج فرض نہیں ہے۔اسلامی عبادت میں ایک شخص کے فرائض کی ادائیگی کاذمہ داردوسرے شخص کونہیں بنایاگیاہے۔ہرشخص کواپنافرض خود ادا کرنا ہے۔اوراگرکسی شخص کے حالات ایسے ہیں کہ وہ متعلقہ فرض ادانہیں کرسکتا تواس سے روز قیامت اس سلسلے میں جواب طلبی نہیں کی جائے گی۔

باپ اور بیٹے کے معاملے میں بھی یہی صورت ہے کہ اگر والد حج کے لیےضروری شرائط پوری نہیں کرسکتے توان پرحج فرض نہیں ہوتااوراگربغیرحج اداکیےان کاانتقال ہوجاتاہےتوان سےاس بارے میں باز پرس نہیں ہوگی۔لیکن بیٹے کااس لائق ہوناکہ وہ اپنے والدکوسفرِ حج کے اخراجات فراہم کرے،بیٹے کی فرمانبرداری اورسعادت مندی کاثبوت ہے۔یہ اعتراض کیاجاسکتاہے کہ باپ کے مذہبی فرائض،بیٹے کی ذمہ داری نہیں ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھناہے کہ کیاواقعتاًایساہی ہے؟

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:''کیامجھےاپنے مرحوم والدکی جانب سے حج اداکرناچاہیے،کیونکہ وہ اپنی زندگی میں یہ فرض ادانہیں کرسکے تھے؟''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اگرتمہارے والد اپنے پیچھے کچھ قرض چھوڑ گئے ہوتے،توکیاتم وہ اداکرتے؟''صحابی رضی اللہ عنہ نے اس بات کاجواب اثبات میں دیا،تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اللہ کاجوقرض باقی ہےاس کی ادائیگی زیادہ حق رکھتی ہے۔''

اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ باپ کےقرضوں کی ادائیگی بیٹے پرواجب ہے۔ خواہ یہ قرضے دنیاوی اورمالی ہوں یامذہبی عبادات کےسلسلے میں ہوں۔

مندرجہ بالابیان کےمطابق اگروالدکی وفات کے بعداس کےواجبات کی ادائیگی بیٹے کی ذمہ داری ہےتووالدکی زندگی میں ہی انہیں اپنےوسائل مہیاکرناکہیں زیادہ بہترہےکہ وہ اپنے مذہبی فرائض سےعہدہ برآہوجائیں۔اولادکایہ فعل نہ صرف باپ کے لیے باعثِ مسرت واطمینان ہے بلکہ خود بیٹے کے لیےبھی باعثِ سعادت ہوگااوراجرِخیرکاموجب بنے گا۔حرمِ کعبہ،یومِ عرفات اوردیگرمقدس مقامات پرباپ کی جانب سےاپنی اولاداورخاص طورپراس بیٹے کے لیے جواس فریضۂ حج کی ادائیگی کاذریعہ بنا،جودعائیں مانگی جائیں گی،یقیناًاللہ تعالیٰ انہیں قبولیت بخشیں گے۔[ایضاً ص۱۹۹]

والدین کو حج پر بلانے اور بیٹی کی شادی کے بعد حج کرنے کا مسئلہ:

سوال 1:

میں نے اپنے والد کو دعوت دی کہ وہ عمرے اور حج کی ادائیگی کے لیے آئیں۔ ان کی عمر ۰ ۷ سال ہے، صحت اچھی نہیں ہے، دل کا عارضہ بھی ہے۔ والد نے لکھا کہ جب تک تمہاری چھوٹی بہن کی شادی نہیں ہو جاتی، میں حج نہیں کروں گا۔ میرے والد کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ گھر کے تمام اخراجات میرے ذمہ ہیں اور ان کے حج کے اخراجات بھی میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات میں اپنے والد اور والدہ کی جانب سے میں حج اور عمرہ کر سکتا ہوں؟

سوال 2:

میری ایک بہن ہے جس کی عمر شادی کے قابل ہے، میں اپنی والدہ اور بڑے بھائی کو حج کے لیے بلانا چاہتا ہوں۔ میرے بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب تک بہن کی شادی نہیں ہو جاتی، والدہ کو حج پر نہیں جانا چاہیے۔ والدہ کے حج کے اخراجات کے لیے مجھے اپنے ادارے سے پیشگی تنخواہ لینی ہوگی۔

ازراہِ کرم بتایئے کہ ان حالات میں والدہ کو حج کے لیے بلانا درست ہے؟

جواب:

ان دونوں قارئین کے پیش نظر ایک نہایت ارفع مقصد ہے کہ وہ اپنے والدین کو حج پر بلانا چاہتے ہیں تا کہ اس فرض کی ادائیگی کے بعد، وہ (والدین) اپنے سابقہ گناہوں کی معافی کا موقع حاصل کر سکیں۔ ان دونوں معاملوں میں کئی پہلو ایسے ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔

☆...... پہلا مسئلہ اہلیت کا ہے۔ دونوں معاملوں میں والدین حج کے اخراجات خود برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے لہٰذا وہ فریضہ حج ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ حج صرف ان پر فرض ہے جو اس کی ادائیگی کی اہلیت رکھتے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے حج کی اہلیت کی وضاحت جس طرح کی ہے، اس کے مطابق عازمِ حج کے پاس کھانے اور سفر کے لیے ذاتی طور پر معقول رقم ہونی چاہیے۔ اگر کوئی دوسرا اس رقم کو بطورِ تحفہ پیش کرے تو اسے یہ پیشکش قبول کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ قبول کرتا ہے اور حج ادا کرتا ہے تو اس کا حج ادا ہو جائے گا۔ چونکہ ان دونوں معاملوں میں حج کے اخراجات کی پیشکش بیٹے کی جانب سے ہے، اس لیے یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ شافعی فقہ اور بعض دوسرے مکاتبِ فکر کے مطابق

اگر ایک شخص کا بیٹا یا بیٹی اس کے حج کے اخراجات ادا کر سکتے ہیں تو مذکورہ شخص حج کا اہل تصور کیا جائے گا۔

☆......دوسرے سوال میں جہاں بھائی کو حج کی دعوت دی گئی ہے تو یہ بھائی پر منحصر ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے یا نہ کرے۔

☆..... اگر ایک شخص کے والد خرابی صحت کی بناء پر حج کے سفر کے قابل نہ ہو تو اس کے لیے حج کی ادائیگی ضروری نہیں ہے کیونکہ اہلیت میں سفر کی دشواری برداشت کرنے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔اس صورت میں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے کہ وہ فضائی سفر کر سکتے ہیں یا نہیں ۔اگر ڈاکٹر انہیں سفر سے منع کرے تو اس صورت میں بیٹا، والد کی جانب سے حج اور عمرہ ادا کر سکتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب لگتی ہے کہ اگر ایک شخص بیماری کی وجہ سے حج ادا نہ کر سکے اور کوئی دوسرا اس کی جانب سے حجِ بدل ادا کرے، لیکن بعد میں وہ شخص صحت یاب ہو جائے اور حج ادا کرنے کی قوت رکھتا ہو، تو اسے لازماً خود حج ادا کرنا چاہیے۔

☆......والدہ کے حج کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے پیشگی تنخواہ لینا میری رائے میں درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت نہیں کی کہ حج ادا کرنے کے لیے دوسروں سے رقم لی جائے۔

☆......دونوں قارئین کے معاملات میں، انہیں اپنی والدہ کی جانب سے حجِ بدل ادا نہیں کرنا چاہیے، سوائے والد کی طرف سے حج بدل کے کیونکہ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے خود اس کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن چونکہ دونوں کی والدہ ،اللہ کے فضل سے صحت مند ہیں اور صرف رقم کی کمی کی وجہ سے حج کی ادائیگی نہیں کر سکتیں، اس لیے انہیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک خاصی رقم جمع ہو جائے۔

☆......دونوں سوالوں میں ،بہن کی شادی اور حج کی ادائیگی کے معاملے میں الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ والدین اور خاندان کے بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کی شادی تک حج کو مؤخر کرنا چاہیے۔

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے ۔غالباً یہ محض تہذیبی اور سماجی اثرات کی وجہ سے ہے۔ان سماجی روایات کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ایک شخص کے دینی فریضہ کی ادائیگی میں تاخیر کا سبب بن رہا ہے جب کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ بیٹی کی شادی کے مسئلہ کو فریضۂ حج کی ادائیگی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔حج کا فریضہ مسلمانوں پر اللہ نے عائد کیا اور قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ شادی ایک سنت ہے، اگر شرائط پوری ہونے کے باوجود حج کا

فریضہ ادا نہ کیا جائے تو یہ بات اللہ کے حکم سے روگردانی کے مترادف ہے۔ اگر ہم سماجی روایات کا پابند ہونا پسند کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ''سنت'' کو ''فرض'' پر فوقیت دے رہے ہیں۔ یہ رویہ کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

☆......شادی کرنا سنت ہے اور اسلام اس بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا کہ مسلم معاشرے میں جوان عورتیں اور مرد غیر شادی شدہ رہیں لیکن بعض معاشروں میں غیر ضروری طور پر شادی کو ایک معاشی بوجھ بنا دیا گیا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خاصی رقم جمع ہو جائے تو پھر شادی کی جائے۔ اس طرزِ عمل سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق جوان لڑکیوں کے والدین یا بھائیوں کو مناسب جوڑے کے لیے دو باتیں دیکھنی چاہییں، ایک ایمان کی پختگی دوسری دیانت۔ (۱)

والدین کو حج کروانے کے لیے قرض لینا:

سوال:

اپنے والدین کو حجِ بیت اللہ کی ادائیگی کے لیے وطن سے یہاں بلانے کی غرض سے میں قرض کا بندوبست کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنے اس ادارے کے مالکان سے بات کی ہے جہاں میں ملازمت کرتا ہوں۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

جواب:

والدین کو حج بیت اللہ کروانے کے لیے آپ کا جوش و جذبہ نہایت قابلِ تعریف ہے۔ آپ اس غرض سے قرضہ کا بندوبست کر رہے ہیں، یہ آپ کی فرض شناسی کی واضح علامت ہے، تاہم آپ پر ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ والدین کو قرضہ لے کر حج کروائیں۔ قرضہ لینا، ایسا عمل ہے جس کی اسلام نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ خواہ وہ کسی مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لیے لیا جائے۔

ایسا حج جس کی ادائیگی کے اخراجات جزوی طور پر قرض لے کر پورے کیے جائیں، درست ہے چنانچہ اگر آپ اپنے ادارے کے مالکان سے قرض لے کر والدین کو حج پر بلا رہے ہیں تو ان کا حج درست ہوگا۔ تمام قرضہ جات یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے مثلاً اگر آپ مقابلتاً کم رقم قرض لے رہے ہیں جس کی کٹوتی آپ کی تنخواہ سے قسطوں سے ہوتی رہے گی، اس طرح کہ آپ کی ضرورت بھر تنخواہ آپ کو ملتی رہے

(۱) [ایضاً ص ۲۰۰۔۲۰۲]

گی تو ایسا کرنا مناسب ہے۔ اس قسم کا انتظام نجی نوعیت کے قرضے لینے سے بہتر ہوگا کہ جس کی ادائیگی بھی دشوار ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر آپ کے اور آپ کے ادارے کے مالکان کے مابین اس قسم کا معاہدہ ہے کہ ملازمت کے اختتام یا برطرفی کی صورت میں وہ ایک طے شدہ رقم آپ کے حوالے کریں گے اور یہ رقم آپ کے قرضہ کی ادائیگی کے لیے کافی ہوگی تو ادارے سے قرض لے کر والدین کو حج پر بلانا بالکل درست ہے۔(۱)

والدین کا حق کیسے ادا ہو؟

سوال:

میری والدہ کا پندرہ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا جب کہ میرے والد صاحب زندہ ہیں۔ میں ابھی تک اپنی والدہ سے گہرا جذباتی تعلق رکھتا ہوں۔ اس لیے جب ذاتی کاغذات پر کچھ لکھنا ہوتا ہے تو ڈبلیو بی ایم (With The Blessing Of Mam) یعنی ''میری ماں کی رحمت کے ساتھ'' سے شروع کرتا ہوں۔ کیا اس طرح کرنا غلط ہے؟

علاوہ ازیں کیا میں اپنی والدہ کی جانب سے نماز ادا کرسکتا ہوں یا روزہ رکھ سکتا ہوں؟ نیز اگر ایک شخص غریب اور قرض دار ہو تو کیا اس کا بیٹا زکوٰۃ سے اس کی مدد کرسکتا ہے یا یہ صدقہ میں شمار ہوگا؟

اگر کسی کی ذاتی آمدنی اس کے زیر کفالت افراد کی ضرورت سے تھوڑی سی زیادہ ہو تو اس شخص کو اپنے والد کی مدد کس طرح کرنا چاہیے، جب کہ اس کے والد کی آمدنی بہت تھوڑی ہو۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے والد مجھ سے بہت زیادہ توقعات رکھتے ہیں چنانچہ ان کے اور میری بیوی بچوں کے درمیان ہمیشہ تنازعہ رہتا ہے۔ دوسرے رشتہ دار اگر کسی کی پرورش میں حصہ دار ہوں، ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وہ اپنی امداد کے سلسلے میں اس فرد سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟

جواب:

والدین کے بارے میں آپ کی یہ سوچ والدین کے لیے آپ کی محبت کا اظہار ہے اور یہ آپ کی فرمانبرداری اور فرض شناسی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ حقیقت میں بڑی بات ہے کہ آپ اپنی والدہ محترمہ کے انتقال کے اتنے عرصے بعد بھی ان سے اتنا جذباتی تعلق رکھتے ہیں تاہم لوگ اپنے مرحوم رشتہ داروں کے

(۱) [ایضاً (ج۲، ص۲۵۰)]

لیے جو کچھ کرتے ہیں، ان میں بعض سے منع کیا گیا ہے اور بعض عمل ان کے لیے بڑے اجر کا موجب ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات جاننا بہت اہم ہے کہ ہم اپنے مرحوم رشتہ داروں کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں اور ان کے لیے ہمیں کیا نہیں کرنا چاہیے۔

آپ اپنے ذاتی کاغذات کے اوپر اپنی مرحومہ 'والدہ کی رحمت کے ساتھ' کے الفاظ لکھتے ہیں، ہو سکتا ہے اس سے آپ کو سکون ملتا ہو، لیکن یہ بے فائدہ ہے۔ کوئی فوت شدہ شخص کسی زندہ شخص کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ وفات پا جائیں، وہ نہ اپنے لیے کچھ کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کے لیے۔

ہمارے نبی کریم ﷺ نے ایک مستند حدیث میں واضح طور پر فرمایا ہے کہ

''جب ایک شخص مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال کا اختتام ہو جاتا ہے سوائے تین باتوں کے، ایک ثوابِ جاریہ، دوسرے نفع بخش علم اور تیسرے فرض شناس (نیک) اولاد، جو اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔''

پس جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مردہ اور زندہ لوگ ایک دوسرے کی قسمت پر کس قدر اثر انداز ہو سکتے ہیں، تو یہ واضح رہے کہ مرے ہوئے لوگ زندہ لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر زندہ لوگ، وفات پا جانے والوں کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔

جس طرح مندرجہ بالا حدیث میں واضح طور پر کہا گیا ہے، اس کی بنیاد پر آپ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اپنی والدہ کو شامل کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائیں، ان پر رحم وکرم فرمائیں، ان کے درجات بلند فرمائیں وغیرہ۔ بے شک یہ ان کے لیے باعثِ اجر ہوگا۔

لیکن اس کے علاوہ آپ اپنی والدہ محترمہ کو فائدہ پہنچانے اور اللہ تعالیٰ سے انہیں اجر دلوانے کے لیے اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان میں سب سے بہترین عمل ان کی جانب سے حج کرنا ہے۔ ایسا آپ اسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ اپنا حج ادا کر لیں۔ اس کے بعد آپ ان کے لیے حجِ بدل کر سکتے ہیں۔ آپ چونکہ سعودی عرب میں رہتے ہیں، اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو، اپنے لیے حج کا اہتمام کر لیں۔ اگلے سال آپ اپنی والدہ محترمہ کی جانب سے حج کر سکتے ہیں۔ اس دوران آپ ان کی جانب سے عمرہ بھی ادا کر سکتے ہیں۔

آپ اپنی والدہ صاحبہ کے لیے جو کچھ بھی صدقہ خیرات کریں گے، اس کا انہیں بہت ثواب ملے گا۔ آپ

کو خود اپنی ذمہ داری نبھانے کا اجر ملے گا مگر خیرات کا ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مرحومہ والدہ کو ملے گا۔

عبادت کی دوسری اقسام مثلاً نماز، روزہ اور قرآن کی تلاوت کے بارے میں علماء مختلف رائے رکھتے ہیں۔ بعض کی رائے میں اس قسم کی (نفلی) عبادات مرحومین کے لیے اجر کا باعث بنتی ہیں۔☆ آپ کے والد صاحب کی کیفیت بالکل مختلف ہے۔ وہ بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں طویل عمر عطا فرمائیں۔ اپنا اطاعت گزار بنائیں اور آرام اور خوشیاں عطا فرمائیں۔ اگر وہ غریب اور مقروض ہیں تو یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ ان کی مدد کریں۔

مگر آپ کی مدد صدقہ اور زکوٰۃ کی ذیل میں نہیں آئے گی۔ آپ اپنے والدِ محترم کو خیرات نہیں دے سکتے۔ وہ اس سے بہت زیادہ کے مستحق ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ ان کا سہارا بنیں، جس طرح آپ اپنے بیوی بچوں کا سہارا بنتے ہیں۔

آپ نے بتایا کہ ان کی توقعات بہت اونچی ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کی ضروریات اس سے زیادہ ہوں جتنی آپ نے ان کے لیے طے کی ہوں۔ اگر ان کی آمدنی کم اور افرادِ خانہ کی تعداد زیادہ ہے، تو یقیناً ان پر زیادہ بوجھ ہے اور آپ کو ان کی مدد کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ آپ کا فرض ہے۔

میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ والدین بالکل اسی طرح زیرِ کفالت ہونے چاہییں جس طرح کسی کا اپنا بچہ اس کے زیرِ کفالت ہوتا ہے۔ والدین کی دیکھ بھال اور ان کی ضروریات پوری کرنا، اپنے بچوں کی دیکھ بھال سے بڑھ کر واجب ہے۔

آپ کو چاہیے کہ اپنے حالات کا خود اچھی طرح جائزہ لیں اور تمام لوگوں کی مدد کے سلسلے میں بہتر فیصلہ کریں۔ آپ کا فرض ہے کہ اپنے ذرائع آمدنی کے مطابق اپنے والد محترم اور ان کے خاندان کو بہتر سہولیاتِ زندگی فراہم کریں۔

آپ کے والد کو حق نہیں کہ وہ آپ کی آمدنی کے تین چوتھائی حصے کا مطالبہ کریں اور بیٹے کو بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے باپ کو انتہائی معمولی رقم دے جب کہ وہ اس سے زیادہ دے سکتا ہو۔

آپ کو توازن قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ کو اپنے والد صاحب کے قرض کی ادائیگی کے

☆...... [فوت شدگان کے لیے کون سا عمل کیا جاسکتا ہے اور کون سا نہیں، اس کی تفصیلات ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں۔ (مؤلف)]

سلسلے میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کل کلاں آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے تو آپ کو ان کا تمام قرض ادا کرنا ہوگا کیونکہ یہ آپ کا فرض ہے۔بہترین بات یہ ہے کہ آپ اپنے مالیاتی امور کا اس طرح انتظام کریں کہ آپ کے تمام متعلقین کے حقوق صحیح طور پر ادا ہوسکیں۔

اگر آپ کی آمدنی آپ کی ضروریات سے زیادہ ہو تو آپ دوسرے رشتہ داروں کی بھی مدد کر سکتے ہیں۔ان کا آپ پر اس طرح حق نہیں ہے کہ آپ فرض سمجھ کر ادا کریں۔لیکن آپ کہتے ہیں کہ آپ کی پرورش میں انہوں نے بھی حصہ لیا ہے،اس لیے ان کا آپ سے اپنے بڑھاپے میں امید رکھنا،قابلِ فہم ہے۔مجھے اندازہ ہے کہ اس سے آپ پر بوجھ بڑھ جائے گا لیکن آپ کی تھوڑی سی مہربانی زیادہ اجر وثواب کا باعث ہوگی،اور ہمیشہ اس کا اعتراف کیا جائے گا۔

اگر آپ کی بیگم ان اخراجات پر اعتراض کرتی ہیں کہ آپ اپنی تمام تر آمدنی والد صاحب اور دیگر رشتہ داروں پر صرف کر دیتے ہیں تو آپ ان کو سمجھا سکتے ہیں کہ والد صاحب کی خدمت کرنا،آپ کے فرائض میں شامل ہے اور دوسرے رشتہ داروں کی مدد کرنا،دراصل ان کی مہربانیوں کے جواب میں ہے۔خاتون کو یاد دلائیے کہ ان رشتہ داروں نے آپ کے بچپن میں آپ کی مدد کی تھی۔ہوسکتا ہے کہ آپ کے بچوں کو بھی مستقبل میں کبھی دوسرے اَعِزّہ کی مدد کی ضرورت پڑے۔میں دعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے بچوں کی بہترین پرورش خود کریں مگر مستقبل کا کسی کو علم نہیں۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے فرائض کو ادا کرنے پر پوری توجہ دیں،اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔ہم اپنے بچوں کی جتنی دیکھ بھال کر سکتے ہیں،اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر ان کی خبر گیری کر سکتے ہیں۔[1]

بیٹا ماں کو غسل دے سکتا ہے؟

سوال: والدہ کی میت کو اس کے بیٹے نے غسل دیا،باوجودیکہ اس کے بیٹے کی بیوی موجود تھی۔ایسی صورت میں بیٹے کا ماں کو غسل دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: سبل السلام [شرح بلوغ المرام] میں ہے:

((واما فی الاجانب فانه اخرج ابوداؤد وفی المراسیل من حدیث ابی بکر بن عیاش عن محمد بن ابی سہل عن مکحول قال قال رسول اللهﷺ اذا ماتت المرأة مع الرجال

(۱) [ایضاً(ج۲ص۲۵۲تا۲۵۵)]

لیس فیهم امراء ة غیرها والرجل مع النساء لیس معهن رجل غیره فانهما یتممان ویدفنان وهما بمنزلة من لایجد الماء انتهیٰ محمدبن ابی سهل هذاذکره ابن حبان فی الثقات وقال البخاری لایتابع علی حدیثه وعن صلی الله علیه وسلم قال قال رسول الله ﷺ لاتبرز فخذك ولاتنظر الی فخذ حیی ولامیت رواه ابوداؤد وابن ماجة وفی اسناده اختلاف)) [ص۱۹۳]

یعنی مکحولؒ کہتے ہیں ،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت مر جائے اور کوئی دوسری عورت وہاں نہ ہو یا مرد مر جائے اور کوئی دوسرا مرد وہاں نہ ہو تو تیمم کر کے دفن کر دیے جائیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنی ران ننگی نہ کر اور کسی کی ران کی طرف نہ دیکھ خواہ زندہ ہو یا مردہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ خاوند بیوی کے سوا کوئی مرد عورت کو اور کوئی عورت مرد کو غسل نہ دے جس شخص نے ماں کو غسل دیا ہے، اس نے بہت بُرا کیا ہے۔ [1]



(۱) [فتاوٰی اهلحدیث ،ازحافظ عبدالله روپڑی (جلد ۲ صفحه۱۰۹)]

باب ۱۴:

سوتیلی اولاد، لے پالک اور سوتیلے والدین

[باہمی مسائل اور حقوق و فرائض]☆

'سوتیلی' اور 'سوتیلا' یہ لفظ ہی ایسا ہے جسے سن کر کبھی بھی اچھا تاثر نہیں ابھرا۔ دنیا کا ہر وہ فرد جسے سوتیلے رشتوں سے سابقہ پڑا اس کی یہ خواہش ہی رہی کہ کاش لغات میں یہ لفظ ہی نہ ہوتا...... مگر بعض سچائیاں موجود ہیں، انہیں تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ سوتیلے رشتوں کا وجود بھی ایک سچائی ہے، اسے تسلیم کرنا ہی چاہیے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر وہ خاتون محترمہ ہے جسے ماں کے برابر کا رشتہ یا عمر حاصل ہو مثلاً سوتیلی ماں، دادی، نانی، خالہ، پھوپھی، چچی، ممانی، ساس، رضاعی ماں اور ایسی خاتون جو عمر کے ایسے دورِ حیات میں داخل ہو چکی ہو جہاں عورت کے لیے ماں کے محترم رشتہ کے سوا کوئی نام جچتا ہی نہیں۔ عورت کی یہ سب حالتیں بمنزلہ ماں ہیں، قابلِ احترام ہیں، البتہ والدہ (جننے والی) ہر شخص کی صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ اور وہی حقیقی ماں ہوتی ہے جو اپنی اولاد کو محبت، شفقت، خلوص اور پیار سے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ متبادل ماں فطری طور پر ایسا نہیں کرسکتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ سے خوشخبری حاصل کرنے، اور اللہ کے رسول ﷺ سے مرحبا لینے کا مقصد جس عورت کے دل میں پیدا ہو جائے، تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایسے عظیم کارنامے سرانجام دیتی ہے کہ عقل حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔ چونکہ سوتیلی ماں بھی ماں کی جگہ پر متمکن ہوتی ہے اس لیے وہ ماں ہی کی طرح محترم ہے۔

سوتیلی ماں اور اولاد میں بُعد کی وجوہات:

بچے کا حقیقی ماں سے خون اور رحم کا رشتہ ہوتا ہے لہذا اسے کسی ایسے خارجی محرک کی ضرورت نہیں ہوتی، جو ماں اور بچے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں خاص محبت پیدا کرے۔ جبکہ بچے کا سوتیلی ماں سے کوئی خونی تعلق نہیں ہوتا، اس لیے وہ سوتیلی ماں سے مانوس ہونے کی بجائے کھچا کھچا رہتا ہے۔ خاص طور پر جب

☆......[بشکریہ ماھنامہ "طیبات" لاھور (جولائی ۲۰۰۴ء) مضمون نگار، محترمہ ام عبدمنیب]

وہ دیکھتا ہے کہ وہ تمام امور جن میں اس کی ماں کو اختیار حاصل تھا، اب کسی دوسری خاتون کے ہاتھ میں ہیں، تو بچے کے دل میں حسد کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ لاشعوری طور پر سوتیلی ماں کو ناپسند کرنے لگتا ہے، حتیٰ کہ سوتیلی ماں کی ہمدردی کو بھی دشمنی پر محمول کرنے لگتا ہے۔ ادھر قائم مقام ماں کو بھی چونکہ بچے سے کوئی خونی تعلق نہیں ہوتا، اس لیے وہ بھی عام طور پر اسے غیر ضروری بوجھ تصور کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس بچے کی وجہ سے میری مصروفیات بڑھ چکی ہیں۔ یہ بچہ میری ذات، میرے گھر، میرے خاندانی تعلقات یا دیگر مشاغل میں ایک رکاوٹ ہے۔ پھر یہ احساس دن بدن پختہ ہوتا جاتا ہے۔ ہمہ وقت ساتھ رہنے کی وجہ سے بچے کی خامیاں ماں کو کھٹکنے لگتی ہیں۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ:

☆...... بچے کو کام کرنے کی عادت ڈالنے کے لیے اس سے بے تحاشا کام لیا جاتا ہے۔

☆...... بچے کو تہذیب سکھانے کے نام پر مارا جاتا ہے، اور بات بات پر ڈانٹا جاتا ہے۔

☆...... ''بچہ باادب ہو''، اس تذکرے کے ساتھ لوگوں کے سامنے بار بار اس کی غلطیاں دہرائی جاتی ہیں۔

☆...... ''فلاں چیز کھانے سے طبیعت خراب ہو جائے گی''، اس مفروضے پر مختلف کھانے پینے کی اشیاء سے بچے کو دور رکھا جاتا ہے۔

غرض اس طرح کی بہت سی وجوہات پیش کر کے بچے کو ڈانٹا جاتا ہے جن میں سے کچھ یا واقعتاً سبھی موجود ہوتی ہیں مگر جب سوتیلی ماں کے اپنے بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو ان پر یہ اصولِ تربیت نافذ نہیں کیے جاتے......!

مندرجہ بالا وجوہات حقیقی ماں کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ بسا اوقات وہ سوتیلی ماں سے زیادہ سخت بھی واقع ہوتی ہے، چونکہ وہ اولاد اور ماں حقیقی ہوتے ہیں، اس لیے بچے اور ماں میں سے کوئی بھی محسوس نہیں کرتا...... جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھتی ہے، سوتیلی ماں اور اولاد کی چپقلش بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ماں اور بچہ دونوں باپ کو مرکزِ شکایات بناتے ہیں۔ باپ کے لیے مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ ساتھ دے تو کس کا؟

ناسمجھ والد اکثر ایک طرف جھک جاتے ہیں، غصہ آنے پر کبھی بیوی پر بگڑ بیٹھتے ہیں اور کبھی بچوں کو پیٹ ڈالتے ہیں۔ چونکہ ہمارے یہاں مشترکہ رہائش کا نظام ہے، اس لیے اس تصادم میں گھر کے دیگر افراد مثلاً دادا، دادی، چچا، چچی وغیرہ بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح گھر میں ایک نہ ختم ہونے والا تصادم شروع ہو جاتا ہے۔

بہترین سوتیلی مائیں بھی ہیں:

معاشرے میں ہمیشہ ہر قسم کے لوگ موجود رہتے ہیں۔ جہاں بہت سی غیر ذمہ دار سوتیلی مائیں ہیں، وہاں ایسی مائیں بھی کم نہیں جنہوں نے اپنے حقیقی بچوں پر سوتیلے بچوں کو ترجیح دی ہے، اپنے بچوں کی طرح ان کو بھی حقیقی والدہ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ وہ ان سے بہترین حسنِ سلوک اور حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان سے محبت شفقت، ایثار، احسان اور پیار کرنے میں فراخی سے کام لیتی ہیں۔

بہترین سوتیلی اولاد بھی ہے:

اس طرح ایسی سوتیلی اولاد بھی ہے جس نے اپنی سوتیلی ماں کی عزت، خدمت، ادب، احترام اس انداز سے کیا کہ کوئی یہ بھی نہ جان سکا کہ یہ اولاد سوتیلی ہے یا سگی...... آیئے تھوڑی دیر کے لیے ہم سوتیلے رشتوں کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو بالائے طاق رکھ دیں اور دینِ اسلام کے معاشرتی وخاندانی روابط کو سامنے رکھ کر اس موضوع پر بات کریں۔

سوتیلی ماں اور اولاد کا سر رشتہ والد:

سوتیلی ماں اور اولاد کے درمیان والد بنیادی کردار ہے جو ان رشتوں کے ظہور کا سبب ہے۔ سوتیلے رشتوں کو خوشگوار رکھنے میں والد کافی حد تک اثر انداز ہوسکتا ہے کیونکہ اسلام کے عطا کردہ عائلی نظام میں اَمِیرُ الْبَیْتُ کا منصب والد کے پاس ہی ہے اور وہی اہل خانہ کے مسائل حل کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر اس کے بچے چھوٹے ہوں اور بیوی وفات پا جائے تو اس کے گھر کا نظام درہم برہم ہوتا ہے، ایسے میں اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ اسے کوئی ایسی زوجہ ملے جو اس کے گھر کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کی پرورش بھی کر سکے۔ اگر اس کو بیوی کی بہن یا اس کی خالہ یا بیوی کی بھانجی بحیثیت زوجہ مل جائے تو یہ اس کے بچوں کے حق میں بہتر ہے کیونکہ ان رشتوں میں رحم کے قرب کی وجہ سے محبت ومودت زیادہ ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا کہ "خالہ ماں کی طرح ہوتی ہے۔" [اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ]

جب سوتیلے بچوں اور ماں کے تعلقات کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ جہاں بیوی کا کوئی قریب الرحم رشتہ دوبارہ مرد کے نکاح میں آیا، وہاں سوتیلی ماں اور بچے کو بہت کم مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ رسول اللہ ﷺ

نے خود اپنی لختِ جگر رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ اس وقت رقیہؓ کے بچے بھی تھے جو ام کلثومؓ کے بھانجے بھانجیاں تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے غالباً اپنے بچوں کی تربیت ہی کے پیشِ نظر وفات سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تاکید کی تھی کہ میرے بعد میری بھانجی امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لینا تاکہ رحم کا قریبی تعلق قائم رہے۔

بہر حال مرد دوسرا نکاح جہاں بھی کرے اس کو چاہیے کہ وہ اولاد کی نگرانی سے لاپروانہ ہو۔ کچھ نہ کچھ وقت ضرور اپنے بچوں کے ساتھ گزارے۔ ان کی باتیں، اور ان کے مسائل غور سے سنے۔ اگر وہ ماں کے متعلق کوئی منفی بات کریں تو اسے درست سمجھنے کی بجائے ماں اور بچے کے تعلقات کا خاموش مطالعہ کرے۔ اولاد کو مارنے پیٹنے کی بجائے مشقت سے سمجھانے اور تہذیب سکھانے کا فرض انجام دے۔

☆......والد کو اپنی بیوی کے مسائل میں دلچسپی لینا چاہیے، انہیں حل کرنے کے لیے مثبت طریقہ اپنانا چاہیے، ڈانٹ ڈپٹ، بدگمانی اور غصہ کرنے سے مسائل مزید بگڑ جاتے ہیں۔

☆......بیوی پر بچوں کی تربیت کا بوجھ کم سے کم ڈالے۔ اگر بہت چھوٹا بچہ ہو تو اس کے لیے آیا کا انتظام کر سکتا ہو تو کرے۔

☆......بچوں کے بارے میں بیوی کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے نہ مان لے بلکہ پورے غور و خوض اور تحقیق کے بعد فیصلہ کرے۔

☆......اولاد اور ماں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بدگمانی سے بچنے کی تلقین کرے۔

بچے کی پرورش کا حق کس کو؟

بچے کی سوتیلی ماں کے پاس پرورش پانے کی عموماً دو بڑی وجوہات ہوتی ہیں:

۱۔ والدہ قضائے الٰہی سے وفات پا گئی۔

۲۔ والدہ کو والد نے طلاق دے دی۔

قانونی طور پر سوتیلی ماں سوتیلے بچوں کی پرورش کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ یہ ذمہ داری والد کی ہے۔ اگر سوتیلی ماں بخوشی آمادہ نہ ہو یا اس کا رویہ سوتیلی اولاد سے اچھا نہ ہو تو والد کا یہ فرض ہے کہ بچوں اور بیوی دونوں کو مجبور نہ کرے بلکہ اس کا متبادل سوچے مثلاً اگر ماں کو طلاق دے دی ہے اور ابھی اس نے دوسرا نکاح

نہیں کیا تو بلوغت تک ماں کو حق حاصل ہے کہ وہ بچے کی تربیت کرے۔نبی اکرم ﷺ کے عہد میں ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے، میرا پیٹ اس کے لیے پناہ، میری چھاتی اس کے لیے مشکیزہ اور میری گود اس کے لیے گہوارہ تھی۔اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور بچہ مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔
آپ ﷺ نے فرمایا''جب تک تو دوسرا نکاح نہ کرے بچے کی تو زیادہ حق دار ہے۔'' [سنن ابو داؤد، تحقیق ازالبانیؒ (ح ۱۹۹۱)]

معلوم ہوا کہ بچے کی تربیت کا اولین حق اس کی والدہ ہی کو حاصل ہے۔اگر والدہ دوسرا نکاح کر لے یا اس میں دین و اخلاق کی کوئی ایسی خرابی ہو جو بچے کے بگاڑ کا سبب بن سکتی ہو تو اس صورت میں والد کو اختیار ہے کہ وہ بچے کو اپنے پاس رکھے۔

اگر بچے کی اپنی ماں فوت ہو جائے یا دوسرا نکاح کر لے یا باپ کسی وجہ سے ماں کے پاس بچے کو نہ رکھنا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کا متبادل حل سوچے جس میں سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ بچے کو اس کی کسی رحمی رشتہ کی خاتون کا انتخاب کر کے اس کے سپرد کر دے مثلاً نانی، خالہ، دادی، پھوپھی، بہن وغیرہ۔رحم کی وجہ سے ان رشتوں میں بچے کے لیے ہمدردی اور ایثار کے جذبات دوسروں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ایسا بھی نہ ہو سکے تو پھر کسی اچھے اخلاق والی عورت کو بطور آیا رکھا جا سکتا ہے۔

صورت کوئی بھی ہو، بچے کے اخراجات کا ذمہ دار والد ہے بلکہ اگر خواہش کا اظہار کرے یا ضرورت مند ہو تو بچے کی طلاق یافتہ ماں ...... یا دیگر رشتہ دار پرورش کرنے والی عورت ...... کو بھی اجرت دی جا سکتی ہے۔قرآن پاک میں اس بارے میں حکم موجود ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾[البقرة:۲۳۳]

''اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دوسال دودھ پلائیں، یہ اس کے لیے ہے جو رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہے۔ بچے کے باپ پر ان کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق ہے۔ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے۔ اسی طرح وارثوں کی بھی ذمہ داری ہے۔ پس اگر کوئی آپس کی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر تم اپنی اولاد کو کسی اور سے دودھ پلانا چاہو تو کوئی حرج نہیں بشرطیکہ دستور کے مطابق اس کا حق دے دو۔ اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

سوتیلی ماں کے فرائض:

قائم مقام ماں ایک ایسے مرد جس کے بچے ابھی ماں کے محتاج ہوں، سے نکاح کر کے بہت بڑا ایثار کرتی ہے۔ وہ ایک بہت بڑی امانت کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ اسے ماں سے محروم بچوں کو نہ صرف تربیت دینا ہوتی ہے بلکہ انہیں ماں کی محرومی کے احساس سے بھی نجات دلانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے قدم قدم پر بہت سی مشکلات ہوتی ہیں، خصوصاً ایسی ماں جس کا یہ پہلا نکاح ہو۔ وہ خود ناتجربہ کار ہوتی ہے۔ خاوند کی طبیعت سے ناواقف ہوتی ہے۔ بچوں کے مزاج سے ناآشنا ہوتی ہے۔ والدین سے جدائی کا دکھ اٹھا کر نئے گھر میں آتی ہے۔ جہاں مشترکہ رہائش ہو وہاں دیگر سسرالی رشتہ داروں کے مزاج کو سمجھنا اور ان سے بھی نباہ کرنا ہوتا ہے۔ اپنی اولاد نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ماں بن کر آتی ہے۔ اسے خاوند کے بچوں کو ماں کی سی محبت، شفقت، ایثار اور خلوص مہیا کرنا ہوتا ہے۔ وہ حقیقی ماں تو نہیں بن سکتی لیکن شیریں مزاجی، خندہ روئی، نگہداشت، اور تربیت کا فریضہ ادا کر کے وہ ان بچوں کا دل جیت سکتی ہے۔ بالفرض اس کا جی نہیں چاہتا تو بھی اسے یہ ذمہ داری ادا کرنی چاہیے...... کیوں؟ اس لیے کہ:

☆...... یہ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ماں سے محروم بچے کو جب ماں مل ہی گئی ہے تو اسے اس سے نگہداشت، تربیت، ہمدردی اور پیار بھی ملے۔

☆...... انسان کے اپنے تزکیہ نفس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی جس منصب پر فائز ہے، وہاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے اسے ادا کرے۔

☆......یہ دنیا دَارُ الْمُکَافَاتْ ہے۔کل کونا معلوم اس کے اپنے ساتھ بھی ویسی ہی صورت پیش آئے۔ہو سکتا ہے اس خاتون کو خود بھی کسی قائم مقام ماں ہی نے پرورش کیا ہو یا پھر اپنے بچے اس حالت میں چھوڑ کر چل چلاؤ ہو جائے۔اس وقت هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ کے تحت امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بچوں کو اسی طرح کے ہمدرد، شفیق اور مہربان ہاتھ مہیا کرے گا جیسے اس نے خود کسی اور بچے کے لیے کیا ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ﴾[النسآء:٩]

''اور چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ، کہ جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو وہ ان کی (پرورش کے) بارے میں خوف کھاتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں۔''

اس مضمون کی تائید نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے:

''تم میں سے کوئی تب تک صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ کسی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' [صحیح مسلم کتاب الایمان]

☆......ایک مسلمان کلمہ طیبہ کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔اس عہد کا تقاضا ہے کہ اب وہ چون وچرا کرنے کی بجائے اس کے احکام تسلیم کرے یہی اس کی دنیوی اور اُخروی فلاح کے لیے بہتر ہے۔

بحیثیت رَبَّةُ الْبَيْت عورت کا فرض:

عائلی زندگی میں بیوی کی حیثیت رَبَّةُ الْبَيْت کی ہے یعنی گھر کی مالکہ۔گھر اس کی ریاست ہے جس کے مالی، خارجی اور اقتصادی معاملات کا سربراہ (قَوَّامُ) مرد ہے۔رَبَّةُ الْبَيْت کے ہاتھ میں گھریلو ضروریات کا انتظام اور اس کی منصوبہ بندی کرنا شامل ہے۔اسے اپنی ریاست کے معاملات کو حسنِ تدبیر، حسنِ انتظام اور حسنِ سلوک سے انجام دینا چاہیے۔چونکہ خاوند کے بچے بھی اس ریاست کے معزز شہری ہیں اس لیے ان کے حقوق کی نگہداشت کرنا......ان کی ادائیگی میں خاوند کی معاونت کرنا......اس کی غفلت پر اسے ترغیب دینا عورت کی ذمہ داری ہے۔

بحیثیت راعیۃ سوتیلی ماں کی ذمہ داری:

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِھَا))[صحیح بخاری وصحیح مسلم]

''عورت اپنے خاوند کے گھر والوں اور اولاد کی رَاعِیَۃ (نگران) ہے۔''

خاوند کے گھر کا کوئی بھی فرد ہو اس کے اپنے بچے ہوں، سوتیلے بچے ہوں، دیگر اقرباء ہوں، غلام، خادم، ملازم، مہمان یا جانور ہوں۔ ان سب کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنا اس کا فرض ہے۔ جس میں اس کا خاوند بحیثیتِ سربراہ (قَــوَّامُ) بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔ میاں اور بیوی دونوں میں سے جو بھی اس میں سستی کرے، اسے دوسرے کو احساس دلا کر فرض ادا کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔

سوتیلے بچوں کے حوالے سے سوتیلی ماں کے فرائض

سوتیلے بچوں کے حوالے سے سوتیلی ماں کو مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیے:

۱)......نگہداشت و پرورش:

اگر بچہ بہت چھوٹا ہو اور ابھی اپنے کام خود کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کے کاموں کو انجام دینا، اس کے سلانے، خوراک دینے، نہلانے دھلانے کا اہتمام کرنا سوتیلی ماں کی اولین ذمہ داری ہے۔

۲)......اخلاقی و دینی تربیت:

بچے کی اخلاقی اور دینی تربیت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ چونکہ ماں نگران ہے لہذا ماں بچے کو وقت پر نماز ادا کرنے اور ہر کام کو اسلامی طریقے کے مطابق انجام دینے کا پابند بنائے۔ زبان کی حفاظت کرنے اور اسے برے الفاظ سے دور رکھنے کی کوشش کرے۔ بچے کو بری مجلس سے بچائے، خراب کھیلوں سے دور رکھے اور صحت مند کھیل کی جانب راہنمائی کی کوشش کرے۔

۳)......صحت:

بچے کے لیے خوراک کی فراہمی والد کا ذمہ ہے، لیکن خوراک تیار کرنے اور بچوں کو کھلانے کا کام مائیں ہی کرتی ہیں، اس لیے ماں کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بچے کو مالی حیثیت کے مطابق اچھی غذا مہیا کرے۔

بچے کونہانے، ناخن کاٹنے، بال بنانے اور طہارت کرنے کا طریقہ سکھائے۔

۴)......لباس:

یہ ذمہ داری بھی بنیادی طور پر والد کی ہے۔سوتیلی ماں کو چاہیے کہ اس سلسلے میں والد کو مشورہ دے اور ایسا لباس منتخب کرے جو بچے کو گرمی اور سردی سے محفوظ رکھنے کے علاوہ اس کے جسم پر مناسب لگتا ہو۔لباس اسلامی آداب کے مطابق منتخب کرے۔اس پر ہندو،عیسائی، یہودی یا دیگر غیر مسلم اقوام کے مذہبی شعائر کی تصاویر نہ ہوں اور وہ ستر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہو۔

۵)......تعلیم:

یہ بھی بنیادی طور پر والد کی ذمہ داری ہے۔ ماں اس سلسلے میں باپ کی معاونت کرے اور اسے ترغیب دلائے کہ وہ تمام بچوں کو یکساں تعلیم دلوائے۔اگر کوئی بچہ اُفتادِ طبع کی وجہ سے پیچھے رہ جائے تو علیحدہ بات ہے لیکن کوشش سب کے لیے ایک سی ہونی چاہیے۔کاغذ،قلم،کاپی،کتاب،فیس غرضیکہ تمام تعلیمی ضروریات پورا کرنے میں وہ والد کی معاونت کرے۔

۶)......علاج:

یہ بھی بنیادی طور پر والد کی ذمہ داری ہے لیکن ماں چونکہ نگران ہے،اس لیے وہ بہتر سمجھتی ہے کہ بچے کو کون سی تکلیف ہے،لہٰذا وہ والد کو بروقت آگاہ کرے اور علاج کرنے میں والد کی معاونت کرے۔ بیماری میں ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے بچے سے اظہارِ ہمدردی کرے۔

۷)......تفریح:

کھیلنا بچوں کا حق ہے۔ بچہ چھوٹی عمر میں صرف کھیلتا ہے پھر جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے،اسے اس کی عمر اور سمجھ کے کاموں کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ماں کو چاہیے کہ بچے کو تفریح کا موقع مہیا کرے۔ساتھ ساتھ کام کرنے کی بھی عادت ڈالے لیکن ضرورت سے زیادہ یا اس کی عمر سے بڑھ کر اس پر بوجھ نہ ڈالے،ورنہ یہ زیادتی ہوگی۔ بچے کو مناسب حد تک اپنے دوستوں یا سہیلیوں سے ملنے ملانے کا موقع دے۔اسے اچھے مطالعے کی طرف راغب کرے۔

۸)...... بچے کی ملکیت کا تحفظ:

جو کچھ بچے کو اپنی فوت شدہ ماں کی وراثت سے ملے، وہ بچے کی ملکیت ہے۔ ہمارے یہاں بیوی کی چھوڑی ہوئی جائیداد، زیور، مہر، جہیز وغیرہ سب اسی گھر میں رہتے ہیں اور ساس، جیٹھانیاں، دیورانیاں، نندیں یا آنے والی دوسری بیوی کے زیر استعمال رہتے ہیں حالانکہ یہ سب مرنے والی کا ترکہ ہے جس میں اس کے بچے کا بھی حق ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ﴾[النساء: ۱۱]

''اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے، ایک مرد کا دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔''

اس کے مطابق سوتیلی ماں کو چاہیے کہ اگر شوہر نے پہلی بیوی کے ترکے کو تقسیم نہیں کیا تو اسے شریعت کے مطابق تقسیم کرے۔ بچے کو جو حصہ ملے اسے حفاظت سے رکھے تاکہ بڑا ہونے پر اسے لوٹا سکے۔ بچے کو اس کے ننھیال یا دیگر اقرباء جو کچھ خاص اسی کے لیے دیں وہ بچے ہی کا حق ہے، البتہ ہمارے ہاں جو عرف ہے کہ جو مہمان آئے وہ بچے کو کچھ نہ کچھ دے، اسے سوتیلی ماں تصرف میں لا سکتی ہے۔

۹)......دس سال کی عمر پر:

بچے کو اِسْتِیذَانْ (اجازت لینے کی عادت) کے اصول سکھائے جائیں۔ حیا سے روشناس کرایا جائے۔ لڑکے کے لیے اگر الگ کمرے کا انتظام ہو جائے تو یہ سب سے بہتر ہے کیونکہ دس سال کے بعد بچے باشعور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ نہ کرے انہیں سوتیلی ماں کے رویے سے کوئی شکایت ہو یا طبعی طور پر وہ اسے ناپسند کرتے ہوں تو اس عمر میں بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتی ہے، لہٰذا الگ کمرے یا رہائش کا انتظام کرنے سے اس پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

۱۰)......سوتیلے بچوں کو اپنے بچوں سے مانوس رکھنا:

سوتیلی ماں کی یہ سب سے اہم ذمہ داری ہے کیونکہ اپنے بچوں کی بھاگ دوڑ مکمل طور پر اس کے ہاتھ ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو اپنے بچوں کے دل میں سوتیلے بہن بھائیوں کے لیے پیار، محبت، ہمدردی، ایثار، خلوص اور شفقت کے جذبات کو ابھار سکتی ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو انہیں ایک دوسرے سے ایسا متنفر کر دے

کہ زندگی بھر وہ ایک دوسرے سے دور رہیں۔ ماں کو اپنے بچوں کی تربیت اس انداز سے کرنا چاہیے کہ وہ اپنے یا سوتیلے بہن بھائیوں میں کوئی بُعد یا فرق محسوس نہ کریں۔

ان کو ہمیشہ یہ احساس دلائے کہ یہ ان کے بہن بھائی ہیں اور ان کے ان پر کچھ حقوق وفرائض ہیں بچوں کو مل کر کھانے، مل کر کھیلنے، مل کر پڑھنے کی ترغیب دے۔ اگر ان میں جھگڑا ہو جائے تو اسے خوش اُسلوبی سے ختم کرادے۔ اپنے بچوں کی بے جا حمایت سے گریز کرے۔ انہیں آپس میں محبت پیدا کرنے کے نبوی اصول سکھائے مثلاً:

اسلام میں پہل کرنا، مل کر کھانا، باہم تحائف لینا دینا، اپنی ضرورت پر دوسرے بہن بھائی کی ضرورت کو ترجیح دینا، لکھنے پڑھنے اور دیگر امور میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا، بہن بھائی کی غلطی کو معاف کر دینا وغیرہ، وغیرہ۔

۱۱)......احساسِ امانت:

بچہ ماں کے پاس ایک امانت ہے، اس کا تقاضا ہے کہ وہ بچے کی ہر طرح سے حفاظت کرے۔ اس کے اخلاق، اس کی صحت، اس کی ملکیت اور اس کے وقت کو ضائع ہونے سے بچائے۔ اسے آخرت کے عذاب سے بچانے کے لیے دینی آداب سے آراستہ کرے۔ حکم باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾[التحريم۔٦]

''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال (گھر والوں) کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی تین علامتیں ہیں: ایک ان میں سے یہ ہے کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔'' لہٰذا سوتیلی ماں کو چاہیے کہ بچے کی ایک امانت کے طور پر پرورش کرے، اور کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس پر امانت میں خیانت کا اطلاق ہوتا ہے۔

۱۲)......شفقت:

بچے کو شفقت دینا اس کا حق ہے لہٰذا ماں کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ بچے سے محبت وشفقت سے پیش آئے۔ اس کو ڈانٹ کم اور پیار زیادہ کرے۔ اچھے کام پر اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس کی اچھائیوں کا تذکرہ کرے۔ اپنے بچوں کی طرح سوتیلے بچوں سے بھی حسن سلوک سے پیش آئے۔

۱۳)......نکاح:

والد کا فرض ہے کہ بچے کا بلوغت کے بعد نکاح کر دے۔ ماں کو پوری خیر خواہی سے اس معاملے میں والد کی معاونت کرنا چاہیے اور ارشاد نبی ﷺ کے مطابق جس شخص میں اخلاق اور دین کی خوبی دیکھے، اس کو ترجیح دے۔

۱۴)......مساوات:

تمام اولاد میں برابری کرنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ مال، لباس، رہائش، خوراک، تعلیم، شفقت، محبت، تفریح کے مواقع فراہم کرنا اور کام کرانا، غرض ہر معاملے میں تمام اولاد میں برابری کرنا چاہیے۔ بیٹے، بیٹیوں، سوتیلے اور سگے میں فرق کرنا ہرگز درست نہیں۔ بعض مائیں والد کو مجبور کر کے اپنی اولاد کو کچھ مراعات دلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ ایسا کرنا ظلم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی والدہ نے ان کے والد سے اصرار کیا کہ وہ ایک غلام ان کے بیٹے کو ہبہ کر دیں۔ حضرت بشیرؓ نے اقرار کر لیا تو وہ کہنے لگیں: ''اس پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بناؤ۔'' چنانچہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: ''میں نے اپنا ایک غلام اس بیٹے نعمان کو ہبہ کر دیا ہے آپ گواہ رہیے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے دوسرے بچوں کو بھی اسی طرح ایک ایک غلام ہبہ کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔'' [بخاری و مسلم]

۱۵)......چند نفسیاتی احتیاطیں:

بچوں کی غلطی کا تذکرہ کسی دوسرے فرد کے سامنے نہ کرے، اس طرح بچوں میں ضد اور بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کے باپ کے سامنے بھی ان کی غلطیوں کا تذکرہ کرنے سے گریز کرے۔ ان کی غلطیوں کو مناسب طریقہ سے از خود دور کرنے کی کوشش کرے۔ بالفرض قابو نہ پایا جا سکے تو پوری خیر خواہی سے والد کے سامنے معاملہ پیش کرے۔ سوتیلی ماں یا ایسی خاتون جس کے پاس بن ماں کے بچے پرورش پا رہے ہیں، اسے قرآن پاک اور احادیث میں دیئے گئے وہ تمام احکام مدنظر رکھنے چاہییں جو یتیم بچوں کے متعلق ہیں کیونکہ باپ سے محروم بچوں کا معاملہ بھی ماں سے محروم بچوں کا سا ہے۔

بہترین سوتیلی ماں کی صفات:

اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے، خالقِ موت وحیات ہے، خالقِ جذبات واحساسات ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ انسانوں میں خونی رشتے اور اجنبی رشتے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ خونی تعلق کے لیے محرک کی کوئی ضرورت نہیں، خون بذاتِ خود ایک محرک ہے جو بچے کے لیے ماں کے دل میں محبت، شفقت، ہمدردی، ایثار اور خلوص کے جذبات پیدا کرتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن ایک ایسی خاتون جو نہ بچے کی بار آوری کے دور سے گزری، نہ اسے جننے کی تکلیف برداشت کی، نہ اپنے خون سے اس کے جسم کی آبیاری کی، اس کے قلبی جذبات واحساسات میں بچے کے لیے محبت، ہمدری، ایثار اور خلوص ایسی صفاتِ حسنہ کہاں سے آئیں گی؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہمیں قرآنِ حکیم اور تعلیماتِ رسول ﷺ سے تلاش کرنا ہے۔

ایک مسلمان کی سب سے بڑی صفت تقوٰی ہے۔ تقوٰی وہ صفت ہے جو انسان کو اس کی کاملیت تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ تقوٰی سے مراد یہ ہے کہ آدمی ظاہر اور پوشیدہ۔۔۔۔۔ چھوٹے اور بڑے۔۔۔۔۔ ہر کام میں ۔۔۔۔۔ ہر وقت۔۔۔۔۔ اور ہر فرد کے ساتھ۔۔۔۔۔ معاملہ کرتے ہوئے یہ خوف پیش نظر رکھے کہ کہیں مجھ سے میرا اللہ ناراض نہ ہو جائے۔ بے شک اس احساس سے لبریز ایسی مائیں بھی ہیں، جو سوتیلے بچے کو اپنے لیے ایک امانت، ایک فرض، اور ایک امتحان سمجھتی ہیں۔ ان کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس امتحان میں بہترین نمبر لے کر پاس ہوں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی ممتا کی صفات کو آخری درجہ پر لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یقین جانیے ایسی مائیں بھی دنیا میں موجود ہیں!

امہات المومنین بحیثیت سوتیلی مائیں:

بہترین ماں بننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دنیا بھر میں سب سے بہترین، سب سے اعلیٰ، اور سب سے معیاری سوتیلی ماؤں کے دورِ مقدس پر دستک دیں۔ ان کے اندر جھانک کر گہرائی سے مطالعہ کریں کہ کس طرح انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ حسنِ سلوک، محبت، شفقت، اخلاص اور ایثار کا مظاہرہ کیا۔

رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْن نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ اس وقت ان کی چار بیٹیاں تھیں جن میں سے صرف ایک ابو العاص رضی اللہ عنہ کی زوجہ بن چکی تھیں جبکہ مختلف عمر کی باقی تین

بیٹیاں موجود تھیں...... فاطمہؓ اور ام کلثومؓ ان سب سے چھوٹی تھیں...... انہیں ماں کی زیادہ ضرورت تھی۔ رسولِ دانش وحکمت ﷺ نے پھر حضرت سودہؓ سے نکاح کیا جو سَابِقُونَ الْاَوَّلُوْن کے مبارک قافلے کی ایک رکن تھیں۔ یقیناً ان کے پاس خلوص، ایثار، محبت، شفقت کی لازوال دولت تھی۔ انہوں نے رَحْمَةً لِلْعَالَمِیْن ﷺ کی صاحبزادیوں...... یعنی اپنی سوتیلی بیٹیوں...... کی پرورش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نبی الاولین والآخرین ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو بعد ازاں آپ ﷺ نے ابو رافع رضی اللہ عنہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تا کہ وہ آپ ﷺ کے اہل بیت کو ہمراہ لے آئیں۔ حضرت سودہؓ کی معیت میں ام کلثومؓ، فاطمہؓ...... سب کا قافلہ چلا اور مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ [وفاء الوفاء، للسمهودی]

رسولِ علم وحکمت ﷺ اس حکمت سے خوب واقف تھے کہ دس سال کے بعد بچے کی خوابگاہ الگ کر دینی چاہیے...... چنانچہ آپ ﷺ نے مسجد کی تعمیر کے ساتھ ہی امہات المومنینؓ کے لیے گھر بھی بنائے۔ اس وقت آپ ﷺ کی دو زوجہ محترمہ تھیں: حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ۔ علاوہ ازیں ایک گھر اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے بھی بنایا، گو نگہداشت کا فریضہ اب بھی حضرت سودہؓ کے سپرد تھا، لیکن رہائش یا کمرہ دونوں بہنوں کا والدہ سے الگ تھا...... اس کے بعد دیگر امہات المومنین آتی گئیں اور فاطمہ اور ام کلثوم کی سوتیلی ماؤں میں اضافہ ہوتا گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اس قدر پیار اور حسنِ تعلق تھا کہ دونوں کے گھروں کے درمیان ایک کھڑکی کھلتی تھی جب جی چاہتا اس کے ذریعے ایک دوسرے کی خیر خیریت دریافت کر لیتیں۔ [وفاء الوفاء، للسمهودی]

حضرت زینبؓ کی بیٹی 'امامہ' تو اکثر ننھیال ہی کے گھر میں رہتیں۔ رسول اللہ ﷺ امہات المومنین میں سے جس گھر میں ہوتے، وہ ادھر پہنچ جاتیں۔ رقیہؓ اور فاطمہؓ کے بچے بھی اکثر ان کے گھروں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ یہ آمد ورفت ظاہر ہے امہات المومنین جو فاطمہ ورقیہ کی سوتیلی مائیں تھیں، انہی سے پیار محبت اور شفقت کے باعث تھی۔

حضرت عائشہؓ کی فاطمہؓ سے بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ جب اللہ کے رسولؐ نے اپنے آخری وقت فاطمہؓ کے کان میں کوئی بات کہی تھی تو انہوں نے وفات کے بعد فوراً فاطمہؓ سے پوچھ لیا اور فاطمہؓ نے اپنی امی محترمہ

کووہ بات بتادی۔[صحیح بخاری، کتاب الاستئذان]

فاطمہؓ چونکہ عمر میں چھوٹی تھیں اور چھوٹا بچہ والدین کالاڈلہ ہوتا ہے، شاید اسی باعث امہات المومنین اپنی اہم سفارشات کے لیے انہیں ہی وکیل بنا کر بارگاہِ رسالت میں بھیجتیں۔

جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا فتح خیبر کے بعد ام المومنین کے منصبِ عظیم پر فائز ہوکر مدینہ منورہ میں اپنے بیست التلاوۃ میں اتریں..... خواتین صفیہ رضی اللہ عنہا کو دیکھنے آئیں..... فاطمہؓ نے بھی بڑی چادر اوڑھی اور اپنی والدہ محترمہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئیں..... ام المومنین صفیہؓ نے اپنی بیٹی سے محبت اور خلوص کا اظہار یوں فرمایا کہ آپ کو اپنی کلائی سے سونے کی چوڑیاں اتار کر پہنا دیں!

ہم امہات المومنین کے اپنی سوتیلی اولاد سے اس حسنِ سلوک کی بنا پر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سوتیلی ماں کو اپنی اولاد کے لیے کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے، خصوصاً اس صورت میں کہ جب وہ ابھی کم سن بھی ہو۔

اچھی ماں بننے کے لیے چند تدابیر:

ہر ماں اچھی ہی ہوتی ہے جس کی وجہ رحم اور خون کا تعلق ہے، البتہ ہر غیر حقیقی ماں اچھی نہیں ہوتی۔ اقصائے عالم میں یہی مشہور ہے اور تجربہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ بہترین ماں بننے کے لیے مندرجہ ذیل امور معاون ہوسکتے ہیں، اپنے اپنے حالات وواقعات کے بعد ان میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔

☆..... ماں کو چاہیے کہ وہ بچے کے ساتھ اپنے تعلقات کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرے۔

☆..... بچے کو مارنے پیٹنے سے ہر ممکن گریز کرے۔ یوں تو کسی بھی بچے کو مارنا مستحسن نہیں لیکن سوتیلے بچوں پر کبھی بھی ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔

☆..... بچے سے کوئی غلطی ہوجائے تو اسے یہ محسوس کرائے بغیر کہ اس سے غلطی ہوئی ہے، اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب واقعہ گزر جائے تو پھر بچے کو مناسب طریقے سے سمجھائے۔

☆..... بچے سے کوئی نقصان ہوجائے تو اس پر بگڑنے کی بجائے تحمل سے کام لے۔ نفع ونقصان کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا بچے پر بگڑنے کی بجائے اللہ سے اس کا بدل طلب کرے۔

☆......بچوں سے محبت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً حسب استطاعت چھوٹے موٹے تحائف یا انعامات دیئے جائیں۔

☆......بچوں سے نرم روی کا مظاہرہ کرے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

((اَللّٰهُ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِيْ اِلَى الْعنفِ))[صحیح مسلم]

''بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہے، وہ نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرم روی پر وہ چیز دیتا ہے جو سخت روی پر نہیں دیتا۔''

لہذا بچوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے سے ان کے دلوں میں ماں اپنی محبت پیدا کر سکتی ہے۔

☆......اگر کوئی سوتیلا بچہ شیر خوار ہو......اور ماں اس حالت میں ہو کہ بچے کی رضاعت خود کر سکے تو ایسا کرنا اس کے اور بچے کے حق میں بہتر ہے۔ اس طرح ماں اس سوتیلے بچے کے جسم میں اپنے خونی اجزاء شامل کر کے اس سے مزید قربت پیدا کر سکتی ہے۔

ایثار کا ایک اور پہلو:

بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ والد کے معاشی حالات سازگار نہیں ہوتے لیکن بیوی صاحب حیثیت ہوتی ہے، اس صورت میں اگر وہ خاوند اور اس کی اولاد (سگی ہو یا سوتیلی) پر خرچ کرے تو یہ اس کے لیے دوہرے اجر کا باعث ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے، ان کی بیوی زینب رضی اللہ عنہا اپنے ہاتھ سے کماتیں اور اسے اپنے خاوند اور بچوں پر خرچ کر دیتیں......ایک روز وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں اور اس بارے میں عرض کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے لیے یہ دوہرے اجر کا باعث ہے۔ ایک قرابت پر خرچ کرنے کا اور دوسرا صدقہ کرنے کا۔'' [صحیح بخاری و مسلم، کتاب الزکاۃ]

سوتیلی اولاد یا سگی اولاد پر بھی خرچ کرنا اور ان کی کفالت کرنا ماں کی ذمہ داری نہیں بلکہ باپ یا دیگر سرپرستوں کی ذمہ داری ہے لیکن اگر عورت ایسا رضا کارانہ طور پر کرتی ہے تو اس کے لیے یہ دوہرے اجر کا باعث ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ والد وفات پا گیا، اس کی پہلی بیوی سے بھی اولاد تھی، وہ بے سہارا ہو گئی اور سوتیلے یا سگے سب بچے ماں کی زیر کفالت آ گئے، ایسے میں اگر سوتیلی ماں ان بچوں کی کفالت کرے تو یہ اس کے لیے یقیناً اجر کا باعث ہے۔

اکثر مائیں ایسی بھی ہیں جو تنگ دستی کے باوجود سوتیلی اولاد پر خرچ کرنے کو اپنی اولاد پر ترجیح دیتی ہیں۔
حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے بچوں پر اجنبی مہمان کو ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾[الحشر :۹]

''اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ وہ خود تنگی میں ہوں۔''

بعینہ یہی صورتِ حال ایسی ماؤں کو پیش آتی ہے اور وہ اسی قسم کے ایثار کا مظاہرہ کر کے خود کو اس آیت کے موصوفین میں شامل کر سکتی ہیں۔

سوتیلی اولاد کی ذمہ داریاں:

زندگی ایک معاملہ ہے کبھی لینے کا اور کبھی دینے کا۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ حقوق ادا کئے جاتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان کی واپسی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اولاد کو والدین پالتے پوستے ہیں، ان کی پرورش، تربیت، تعلیم، صحت اور ادب وتہذیب سکھانے کے لیے ہمہ وقت کوشش کرتے ہیں......اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے کہ جب اولاد بڑی ہو جاتی ہے اور اس پر والدین کے حقوق ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اولاد جب بچپن کے مراحل میں ہوتی ہے، اس پر والدین کے حقوق برائے نام ہوتے ہیں جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی ہے، اس پر والدین کی اطاعت، خدمت اور احترام کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔

والدین سوتیلے ہوں یا سگے۔ دادا، دادی، نانا، نانی ہوں یا رضاعی والدین۔ پھوپھی، خالہ، چچا، ماموں یہ سب والدین کی صف میں شامل ہیں اور سب کی عزت وخدمت اور ادب واحترام کرنا فرض ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے جو جتنا قریبی ہے، اس کا حقِ خدمت وادب اتنا ہی زیادہ ہے۔ لہٰذا زیادہ قریبی پر دور والے کو ترجیح نہیں دینا چاہیے۔

سوتیلی ماں بھی والدین میں سے ہے اور اس کی خدمت، اطاعت اور احترام کرنا فرض ہے، جس کی وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ وہ ماں کی قائم مقام ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں خالی جگہ کو پر کرنے کے لیے جب وہاں کوئی دوسری چیز رکھی جاتی ہے تو اس کو وہی حقوق، وہی مراعات، وہی مقام، اور وہی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے جن رشتوں کو محرم قرار دیا ہے، ان میں اس کے سگے بیٹوں کے علاوہ اس

کے خاوند کے بیٹے بھی شامل ہیں۔ چنانچہ سوتیلی ماں کی خدمت واطاعت، سوتیلی اولاد پر فرض ہے۔ اسلام اپنے متبعین سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ دل مانے یا نہ مانے فطری داعیہ ہو یا نہ ہو، پھر بھی سوتیلے والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے۔

۲۔ اگر سوتیلی ماں اس دور میں آتی ہے کہ جب بچے تھے ہی چھوٹے، تو یہ اس کا بدرجہ اولیٰ حق ہے کیونکہ پھر وہ اولاد کی مربیہ بھی رہی ہوتی ہے۔

۳۔ اگر بحیثیت مربیہ پرورش نہ بھی کی ہو تو بھی والد کی منکوحہ ہونے کی وجہ سے وہ احسان کی مستحق ہے۔

۴۔ جب رضاعت سے عورت پر ماں کے احکام مرتب ہو جاتے ہیں تو پھر والد کی منکوحہ ہونے کی وجہ سے بھی وہ احسان کی مستحق ہے۔

۵۔ ''محبت کی قدر کرنا، محبت کی علامت ہے۔'' جب اسلام میں ماں باپ کے دوست احباب سے بھی حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے، تو پھر باپ کی شریکِ حیات کو یہ حق حاصل کیوں نہ ہو؟ سوتیلی ماں نے اپنا منصب سنبھالنے کے بعد اولاد سے کیسا سلوک کیا؟ اولاد کو یہ سوال نظر انداز کر کے صرف اس نکتے پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے کہ یہ ہماری والدہ کے قائم مقام ہے، ہمارے والدِ محترم کی زوجہ ہے، ہمیں اس نے پرورش کیا، بالفرض نہیں بھی کیا تو بھی وہ حسنِ سلوک، خدمت اور احترام کی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو والدین کے بارے میں حکم دیا:

﴿وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ [بنی اسرائیل :۲۳]

''پس تم ان (والدین) کو اُف تک نہ کہو اور نہ ان کو ڈانٹو۔''

مختلف حالات میں سوتیلی ماں کے ساتھ احترام وخدمت کی ادائیگی بھی مختلف انداز اختیار کر سکتی ہے۔

☆......بعض اوقات اپنی والدہ بھی بقید حیات ہوتی ہے اور سوتیلی ماں بھی موجود ہوتی ہے۔ اس صورت میں دونوں کے حقوق ادا کرنا فرض ہے۔ البتہ حقیقی والدہ کو ترجیح اس صورت میں دی جائے گی جب کہ دونوں میں سے کسی ایک کی بات یا کسی ایک کی خدمت یا کسی ایک سے حسنِ سلوک کو اختیار کرنے کا معاملہ ہو۔

☆......بعض اوقات حقیقی والدہ، سوتیلی ماں سے حسنِ سلوک سے منع کرنے آتی ہے۔ ایسی صورت میں

حکمت اور تدبر کے ساتھ حقیقی والدہ کو سمجھایا جاسکتا ہے۔

☆......اگر والدہ نہ سمجھے تو اسے بتائے بغیر سوتیلی ماں سے حتی الامکان حسنِ سلوک کیا جائے۔

☆......بعض حالات میں سوتیلی ماں کا سوائے سوتیلی اولاد کے اور کوئی ہوتا ہی نہیں۔اس صورت میں تمام ذمہ داری سوتیلی ماں اٹھاتی ہے ،لہذا اس سے حسنِ سلوک کرنا ،حسنِ اخلاق سے پیش آنا ،اس کی خدمت کرنا،اس کی کفالت کی ذمہ داری لینا،اور اس کی ضروریات پوری کرنا سوتیلی اولاد کا فرض ہے۔

سوتیلی ماں کے حقوق:

سوتیلی ماں چونکہ ماں کی قائم مقام ہے،اس لیے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ ہمارے دین میں ہر وہ عورت جو ماں کے برابر ہو،باعثِ تعظیم ہے۔پھر جب سوتیلی ماں بھی ماں ہی کی جگہ ہے تو یقیناً اس کا استحقاق زیادہ ہے۔رسول اللہ ﷺ عمر بھر اپنی رضاعی والدہ کی تعظیم کرتے رہے۔ایک بار وہ آپ سے ملنے مدینہ منورہ آئیں،تو آپ ﷺ ان کے لیے اٹھے،اپنی چادر بچھا کر انہیں بٹھایا،ان کی باتوں کو توجہ، محبت اور احترام کے ساتھ سن کر رخصت فرمایا۔

ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہیں جارہے تھے،انہیں اثناءِ راہ ایک بدو ملا۔آپ کے سر پر ایک قیمتی عمامہ تھا۔آپ نے وہ عمامہ اتار کر اس بدو کو پہنا دیا۔ایک صاحب آپ کے ہمراہ تھے،انہوں نے کہا:اگر آپ بدو کو کوئی کم قیمت چیز بھی دے دیتے تو وہ خوش ہوجاتا۔آپؓ نے کہا:یہ بدو میرے والد کا دوست تھا۔[صحیح مسلم، کتاب البر والصلة]

خدمت:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾[سورة الاسرآء:۲۳]

''اور مہربانی سے اپنی عاجزی کا بازو ان کے لیے جھکادو۔''

اس لحاظ سے سوتیلی ماں بھی اس میں شامل ہے اور اس کا حق ہے کہ اس کی خدمت کی جائے۔خدمت سے مراد ہے کسی کا ایسا کام انجام دینا جو بغیر کسی جسمانی مشقت کے نہ ہوسکتا ہو۔اولاد کے لیے والدین

بہت زیادہ جسمانی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ بھی ان کے بدلے میں ان کی خدمت انجام دے۔

عطیہ اور ہدیہ:

سوتیلی ماں اگر اپنے ہی زیر کفالت ہو تو اس کی تمام ضروریات پوری کرنا فرض ہے۔ بالفرض وہ اپنے خاوند یا اپنے بہن بھائیوں میں سے کسی کے پاس ہو تو اسے عطیات اور تحائف دینے چاہییں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی رضاعی والدہ اور رضاعی بہنوں کو تحائف دیتے تھے۔ ام ایمن جنہوں نے آپ ﷺ کو اپنی گود میں کھلایا تھا، ان کو بھی آپ نے تحائف سے نوازا تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک بار انہوں نے آپ ﷺ سے اونٹ مانگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم تمہیں اونٹ کا بچہ دیں گے۔ وہ گھبرا کر بولیں: ''بچہ لے کر میں کیا کروں گی؟ مجھے تو اونٹ چاہیے۔'' آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا: ''اونٹ ہی ملے گا، ہر اونٹ اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے......!''

جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تو اس وقت مہاجرین کی مالی حالت کمزور تھی۔ انصار نے مہاجرین کے لیے اپنا گھریلو سامان، مکان، باغات اور زمینیں تک ان مہاجروں میں بانٹ دیں۔ آپ ﷺ نے ام ایمن کو بھی انصار کے کھجور کے درخت عطا فرمائے۔ جب خیبر فتح ہوا تو انصار کے دیئے ہوئے باغ اور کھیت واپس فرما دیئے۔ جب ام ایمن کا واپس کرنے لگے تو انہیں ناگوار گزرا۔ چنانچہ ان کو آپؐ نے اپنی طرف سے کھجور کے درخت عطا فرمائے۔ [بخاری، کتاب المغازی، باب مرجع النبی من الاحزاب]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب گود کھلانے والی عورت پر آپ ﷺ نے عطیات کا سلسلہ جاری رکھا تو پھر سوتیلی والدہ تو اس سے کہیں زیادہ مستحق ہو گی!

کفالت:

اگر سوتیلی ماں کی کفالت کے لیے کوئی اور معقول انتظام نہ ہو تو اس کی کفالت کرنا چاہیے۔ سوتیلی ماں کی پسند کو مدنظر رکھ کر اس کی تمام مالی ضروریات پوری کی جائیں۔

احسان:

سوتیلی ماں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا چاہیے، اگر بالفرض اس نے بچپن میں اچھا سلوک نہ بھی

کیاہوتو پھر بھی اس کے محترم رشتے کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے تو غزوہ بنوہوازن کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا تھا، صرف اس لیے کہ ان کا تعلق آپؐ کے رضاعی قبیلے سے تھا!

دعا:

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا﴾[بنی اسرائیل]

''اور (والدین کے لیے یہ) دعا کرو: ''اے میرے مالک! تو ان پر رحم کر جیسے انہوں نے (مجھ پر رحم کرتے ہوئے) بچپن میں مجھے پالا پوسا ہے۔''

والدین کے لیے دعا کرنا، اولاد کا فرض ہے۔ اس دعا سے سوتیلی ماں کو بھی اس کا حق پہنچانا چاہیے۔ اس کے احسان، شفقت، محبت کو یاد کر کے اس کے لیے دعائے خیر کرتے رہنا چاہیے۔

اعتراف احسان:

اعترافِ احسان بھی احترام و محبت کا آئینہ ہوتا ہے۔ بالفرض ماں نے احسانات نہیں بھی کیے تو بھی اس کا ذکر ادب و احترام سے کرنا فرض ہے۔

ماں کے اقرباء سے محبت اور سلوک:

سوتیلے بہن بھائیوں سے حسنِ سلوک کرنا، ان کی مدد کرنا، ان کو تحفے تحائف بھیجنا، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، اگر تنگدست ہوں تو مالی مدد کرنا اولاد پر فرض ہے۔ اسی طرح سوتیلی ماں کے دیگر اقرباء سے بھی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

دنیا میں کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا مقصدِ زندگی صرف رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ ان کے نفع و نقصان کا پیمانہ دنیاوی حالات و واقعات نہیں بلکہ اسلام کا عظیم اخلاق ہوتا ہے۔ ایمان کا وہ اعلیٰ درجہ ہوتا ہے جو ایک بندے کو عبادت کا حُسن اور معراج عطا کرتا ہے۔ جب انسان حسنِ عبادت کا خواہش مند ہو جائے تو پھر اس کے ایمان، اخلاق اور اعمال کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر مرحلے پر خیر، احسان، مروت، تحمل، صداقت، عدل، باہمی اخوت، اور ایثار کا

مظاہرہ کرتا ہے۔سوتیلی ماں کے ساتھ معاملات میں یہ حسن کیسے حاصل کیا جائے، یہی سوال اس وقت پیشِ نظر ہے۔

دراصل کچھ حالات ایسے ہیں کہ جب تک ان سے سابقہ پیش نہ آئے، آدمی یہ حتمی فیصلہ نہیں کرسکتا کہ ان کو عملی طور پر کیسے کیا جاسکتا ہے۔جس شخص کو رضائے الٰہی کے حصول کی خواہش ہوتی ہے، اسے اس کے حصول کی مختلف تدبیریں اللہ تعالیٰ خود ہی سمجھا دیتے ہیں۔

سوتیلی ماں کے حوالے سے رضائے الٰہی کی خاطر حسنِ سلوک اوراحسان کے لیے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سوتیلی ماں کو اپنے حسنِ سلوک، خدمت اورادب واحترام کے ذریعے اس احساس سے نکالا جائے کہ یہ اس کی حقیقی اولاد نہیں، اس لیے ان سے خدمت واحسان کی توقع رکھنا ہی بے کار ہے۔

بے شک حقیقی والدین کے ساتھ پیار، ایثار، خدمت، احترام اوراحسان کرنا فطری تقاضا ہے کیونکہ اولاد والدین ہی کے جسم کا ایک حصہ ہوتی ہے۔لیکن سوتیلی ماں کے لیے ان جذبات واحساسات اپنے اندر ابھارنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔اس کے لیے مسلسل عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔مسلسل کوشش درکار ہوتی ہے اورسب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب داعیہ اللہ کی رضا ٹھہرے، تو پھر اپنے آپ کو آمادہ کرنا چنداں مشکل نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر معاملے میں تقویٰ واحسان کی صفات عطا فرمائے۔آمین!



باب ۱۵:

سوتیلی اولاد اور لے پالک سے متعلقہ چند معاشرتی سوالات

سوتیلی بیٹی کی حیثیت:

سوال:

میں ایک ایسی خاتون سے شادی کا خواہش مند ہوں جو حال ہی میں مسلمان ہوئی ہے۔اس خاتون کی پہلے شوہر سے ایک بیٹی بھی ہے۔میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ خاتون سے شادی کے بعد اس بچی سے میرا کیا رشتہ ہوگا اور مجھے اس بچی کے ساتھ کیسا سلوک رکھنا ہوگا؟

جواب:

آپ جب اس خاتون سے نکاح کرلیں گے اوران سے ازدواجی تعلقات قائم کرلیں گے تو ان کے پہلے شوہر سے جو بچی ہے وہ آپ کے لیے محرم ہوجائے گی یعنی اب آپ اوراس بچی کے درمیان شادی کبھی نہیں ہوسکے گی، چاہے آپ اس خاتون کو طلاق دے دیں یا خاتون اللہ تعالیٰ کے حکم سے وفات پا جائے۔ بلکہ اگر یہ خاتون آپ سے طلاق لینے کے بعد کسی اور شخص سے شادی کرلے، تب بھی اس شخص اوراس بچی کے درمیان شادی کی اجازت کبھی نہیں ہوگی۔

آپ جب ان خاتون سے شادی کرلیں تو ان کی یہ بچی آپ کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہ سکتی ہے۔آپ کو چاہیے کہ اس بچی کے ساتھ محبت اور نرمی کا برتاؤ رکھیں اوراس کی مناسب دیکھ بھال کریں اوراسے اچھی اور سچی مسلمان خاتون بنانے کی کوشش کریں۔اگر آپ ایسا کریں گے تو ان شاء اللہ آپ کو اس کا اجرِ عظیم ملے گا۔جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ آپ کی حقیقی بیٹی ہے یا نہیں تو یہ واضح ہے کہ وہ آپ کی حقیقی بیٹی نہیں، نہ ہی آپ اس کے حقیقی والد ہیں۔[بلکہ آپ اس کے سوتیلے باپ ہیں]

---

(۱) [اسلامی طرزفکر،(ج۲ ص۳۶۷)]

بچے کو گود لینا:

سوال:
میری اہلیہ نے ایک نرسنگ ہوم سے ایک ماہ کی ایک بچی کو گود لے لیا تھا۔ اس بچی کا اندراج میرے نام کے ساتھ کیا گیا۔ اب وہ بچی ۶ برس کی ہو چکی ہے۔ میرے اپنے تین بچے ہیں جو اس بچی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہمیں اب احساس ہو رہا ہے کہ ہم سے ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: بچے کو گود لینے کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ جس بچے کو گود لیا جائے آپ اسے اپنا بیٹا یا بیٹی نہیں کہہ سکتے، نہ ہی اسے اپنا خاندانی نام دے سکتے ہیں، نہ لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ آپ کا اپنا بیٹا یا بیٹی ہے۔ یہ سب کہنا جھوٹ ہے کیونکہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ بچہ آپ کا اپنا نہیں اور آپ اس کے والدین نہیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ کسی ایسے بچے کو گود لینا ایک عظیم نیکی ہے جو تنہا رہ گیا ہو یا جس کا خاندان نہ ہو اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو۔ اگر آپ کی اہلیہ نے بچی کو نرسنگ ہوم سے اس لیے گود لیا کہ اس بچی کے خاندان کے افراد نہیں ہیں اور آپ کی اہلیہ اس بچی کو اس حال میں چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہو تو انہوں نے نیکی اور مہربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔

بہر حال، آپ اس بچی کو اپنی حقیقی بچی نہیں کہہ سکتے۔ آپ اسے اپنا خاندانی نام بھی نہیں دے سکتے یا اندراجات میں اپنا نام بطور والد درج نہیں کروا سکتے، آپ کو چاہیے کہ اسے حقیقتِ حال بتا دیں۔ گو کہ وہ آپ کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن آپ اس کے ساتھ محبت اور شفقت کا سلوک جاری رکھیں گے اور اس کی پرورش اسی طرح کریں گے جس طرح آپ اپنے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ اگر آپ بچی کے خاندانی نام سے واقف نہیں ہیں تب بھی آپ کو چاہیے کہ بچی پر واضح کر دیں کہ اس کا آپ کے خاندان سے خونی رشتہ نہیں ہے۔ اس طرح سے اس کے وراثتی حقوق پر اثر پڑے گا اور آپ کے اپنے بچوں کے بارے میں اس کے رویے میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اگر آپ کا کوئی بیٹا ہے تو اس سے اس کی شادی ہو سکے گی۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ دونوں اس کے لیے راضی ہوں یا نہ ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بچی کا آپ کے خاندان سے جو حقیقی تعلق ہے، اس سے بچی کو واقف ہو جانا چاہیے۔ [ایضاً (ص ۳۶۸)]

بچے کو گود لینے کا طریقہ:

سوال:

میں اور میرے شوہر ریاض میں کام کرتے ہیں لیکن عنقریب واپس جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے لیکن اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک ایسا بچہ گود لینا چاہتے ہیں جس کا ہم سے خون کا رشتہ نہ ہو۔ ہم اس کے لیے بے چین ہیں لیکن اس کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ براہِ کرم اس ضمن میں ساری تفصیلات سے آگاہ کیجیے تا کہ ہم ان پر عمل کر سکیں؟

جواب:

آپ بطورِ فیشن کسی بچے کو گود نہیں لے سکتیں، جس طرح مغربی ممالک میں رواج ہے جہاں ایک بچہ جس کا ایک خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہاں وہ قانونی طور پر بیٹا یا بیٹی کہلاتا ہے، اس عمل کو جو دوسرے معاشروں میں رائج ہے، اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اس سلسلے میں رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

آپ جو عمل کریں گے اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عطا کریں گے۔ اگر آپ کسی بچے کی پرورش کریں تو بھی یقیناً اجر کے مستحق ہوں گے۔ اس بچے یا بچی کو اس کے اصلی باپ کے نام سے منسوب رکھیں۔ وہ بچہ کبھی بھی آپ کا بیٹا یا بیٹی نہیں کہلائے گا۔ اس لیے کہ یہ بات درست نہیں۔ اسی طرح وہ بچہ آپ کی وراثت کا حق دار نہیں ہوگا اور نہ آپ اس بچے کے ورثاء میں شامل ہوں گے، آپ نے اگر اس سے زیادہ حیات پائی۔ آپ اور اس کے درمیان ورثہ کی تقسیم اگر ہوئی بھی تو وہ وصیت کے مطابق ہوگی جب کہ اسلام میں غیر وارث لوگوں کے لیے اپنے ترکہ کے تہائی حصے تک کی وصیت کی جا سکتی ہے۔

اگر آپ اپنی مرضی سے کسی بچے کی پرورش کرتے ہیں تو اسلام چاہتا ہے کہ آپ اس کے ساتھ والدین کی طرح محبت کا سلوک رکھیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ بچہ ضروری دینی اور عمومی تعلیم حاصل کرے تا کہ وہ مستقبل میں اچھا مسلمان بنے۔ اس میں صرف یہ فرق ہے کہ اگر بچہ آپ کا اپنا ہوتا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے فرائض میں شامل ہوتا۔ بچہ کسی اور کا ہو تو آپ رضا کارانہ طور پر اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقینی طور پر آپ کو اس کا اجر عطا کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''جس نے دولڑکیوں کی پرورش کی ، یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغت کو پہنچ گئیں تو وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔''

اس حدیث کومختلف روایتوں میں بیان کیا گیا ہے۔بعض روایتوں میں صرف ایک لڑکی کی پرورش کرنے والے کے لیے بھی جنت کا اجر بیان کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی امیدوں کو پورا فرمائیں اور آپ کو اس کی مہربانیوں کا اجر عطا فرمائیں۔ (۱)

بچوں کو گود لے کر اپنے سگے بچوں سے ان کی شادی کرنا:

سوال: میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں کسی یتیم بچے کو گود لوں، گو کہ میرے اپنے چار بچے ہیں۔میری خواہش ہے کہ میں بوسنیا کی دو بچیوں کو گود لوں اور ان کی پرورش کروں۔جب وہ بڑی ہو جائیں تو میرا ارادہ ہے کہ اپنے دو بیٹوں سے ان کی شادی کردوں۔کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

جواب: میں اس سے قبل کئی مواقع پر بتا چکا ہوں کہ قانونی طور پر متبنیٰ بنانا (یعنی گود لینا) اسلام میں ممنوع ہے۔اس میں ایک جھوٹا رشتہ قائم ہو جاتا ہے، جسے اسلام قبول نہیں کرتا جب کہ دوسری طرف ایک یتیم بچے کو تعلیم دینا، یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکے، انتہائی قابلِ تعریف ہے اور جو ایسا کرتا ہے اسے بہت بڑا اجر مل سکتا ہے۔

اس قسم کی پرورش میں ایک بات جو یاد رکھنے کی ہے، یہ ہے کہ وہ بچہ گود لینے والے خاندان میں کوئی قانونی حیثیت نہیں پاتا۔اس خاندان کے کسی بھی رکن سے اس کا وہی رشتہ ہوگا جو متبنیٰ بنانے سے پہلے تھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بوسنیا یا کہیں سے بھی دو بچیاں لیں اور آپ کے گھر والے ان کی دیکھ بھال کریں اور وہ بڑی ہو جائیں تب بھی وہ اسی خاندان کی کہلائیں گی، جو ان کا اپنا خاندان ہے۔آپ کی بیٹیاں نہیں کہلائیں گی۔اگر آپ اپنے بیٹوں سے ان کی شادی کریں تو یہ جائز ہوگا لیکن آپ ان کو 'اپنی سگی بیٹیاں' کسی بھی وقت نہیں کہہ سکیں گے۔ (۲)



(۱) [ایضاً (ص ۳۶۹)] (۲) [ایضاً (ص ۳۷۰)]

مصنف کی دیگر تحقیقی واصلاحی مطبوعات

[جدید اسلوب اور عام فہم انداز کے ساتھ]

نام کتاب	اللہ اور انسان	قیمت-/60

یہ کتاب توحید باری تعالیٰ کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں وجود باری تعالیٰ، مذاہب عالم اور اسلام کا تصوراللہ، اللہ تعالیٰ کا تفصیلی تعارف وغیرہ شامل ہے۔ دوسرے باب میں انسان کی پیدائش، مقصد پیدائش اور نظریہ ارتقاء کا جائزہ وغیرہ شامل ہے۔ تیسرے باب میں اللہ اور انسان کا باہمی تعلق تین پہلوؤں سے واضح کیا گیا ہے یعنی خالق اور مخلوق۔ عابد اور معبود۔ غنی اور محتاج۔ اس کتاب میں نظریہ توحید قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور کسی پر کیچڑ نہیں اچھالا گیا۔ کسی کا عقیدہ توحید درست کرنا ہو تو یہ کتاب اسے ضرور پیش کریں۔

نام کتاب	انسان اور فرشتے	قیمت-/65

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانوں اور فرشتوں کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ مشہور فرشتے کون سے ہیں؟ فرشتوں کی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں؟ فرشتے انسانوں کے لیے دعائیں کب کرتے ہیں؟ کن بدبختوں پر فرشتے بددعائیں کرتے ہیں؟ فرشتے کن انسانوں کی مدد کے لیے اترتے ہیں؟ اور وہ کب اور کیسے مدد کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، اس کے علاوہ اس کتاب میں منکرین ملائکہ کے دلائل کا رد بھی شامل ہے۔

نام کتاب	انسان اور شیطان	قیمت-/75

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان کیا ہے؟ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ انسان کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ ابلیس [یعنی شیطان اکبر] اور عام شیاطین میں کیا فرق ہے اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا شیطان ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے؟ شیطان انسان کو گمراہ کیسے کرتا ہے؟ شیطان سے بچاؤ کی تدابیر کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں فلسفہ خیر وشر کی تفصیلات اور منکرینِ شیاطین کے دلائل کا رد بھی شامل ہے۔

نام کتاب	انسان اور نیکی	قیمت-/70

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ...... نیکی کیا ہے؟ نیکی کا حصول اور نیک بننے کا طریقہ کار کیا ہے؟ نیک اعمال کی قبولیت کی صورت کیا ہے؟ گناہ میں لذت زیادہ ہے یا نیکی میں؟ دنیا اور آخرت میں کام آنے والی نیکیاں کون سی ہیں؟ گناہوں کو دھوڈالنے والی نیکیاں کون سی ہیں؟ نیکی کرنے کا دنیا میں کیا انعام ملتا ہے؟

نام کتاب	انسان اور گناہ	زیرطبع

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہ کیا ہے؟ انسان گناہ کیوں کرتا ہے؟ گناہوں کے جسمانی، طبی، اخلاقی، روحانی اوراُخروی نقصانات کیا ہیں؟ دنیا میں گناہوں کی سزا کیسے ملتی ہے؟ اور گناہ چھوڑنے سے انعامات کیسے ملتے ہیں؟ اسکےعلاوہ مہلک گناہوں کی تفصیل، توبہ کا طریقہ، توبہ کے موانع اور دیگر متلعقہ تفصیلات بھی اس میں یکجا کردی گئی ہیں

نام کتاب	جدیدفقہی مسائل	زیرطبع

اس کتاب میں اکیسویں صدی میں پیش آنے والے جدید فقہی مسائل پرقرآن وسنت کی روشنی میں بحث کی گئی ہے مثلاً شیئرز [حصص] کے کاروبار کی شرعی حیثیت، کلوننگ، ٹیسٹ ٹیوب بے بی، ڈبل سٹوری قبرستان، انتقال خون، پوسٹ مارٹم، اعضاء کی پیوندکاری، ملٹی لیول مارکیٹنگ سکیمیں اوران کا کاروبار، زکاۃ کے جدید مسائل، وغیرہ وغیرہ

نام کتاب	عاملوں، جادوگروں اور جنات کا پوسٹ مارٹم	زیرطبع

اس کتاب میں دست شناسی، چہرہ شناسی، قیافہ شناسی، علم رمل، جفر، اعداد، علم نجوم، کہانت، ہپناٹزم وغیرہ جیسے ان تمام علوم کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے جن کے ذریعے غیب دانی کا دعوی کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جادو اور جنات کا توڑ اور مختلف بیماریوں کا روحانی علاج معالجہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اپنی موضوع پرایک اہم کتاب۔

نام کتاب	قیامت کی نشانیاں	زیرطبع

اس کتاب میں قرب قیامت کی ان تمام علامات اورنشانیوں کوجمع کردیا گیا ہے جنہیں آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ اس سلسلہ میں زمانی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے، صحیح احادیث کا بالخصوص اہتمام کیا گیا ہے، ہر بحث کے بعد فوائد ونکات بیان کیے گئے ہیں۔ قیامت کی جونشانیاں ظاہر ہوچکی ہیں، ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ الحمدللہ اردو زبان میں اپنے موضوع پر یہ سب سے مقبول کتاب ہے۔

نام کتاب	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اورموجودہ مسلمان	زیرِطبع

اس کتاب میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مستند سوانح حیات، ان کا عقیدہ وفقہی مسلک، ان کی مؤحدانہ تعلیمات وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔علاوہ ازیں ان کی طرف منسوب غلط باتوں کی تردیداوران کی آڑ میں کیے جانے والے بعض شرکیہ کاموں کی تفصیل بھی اس میں پیش کی گئی ہے۔اپنے موضوع پر ایک منفرداوراہم کتاب ہے۔شیخ سے محبت وعقیدت رکھنے والے ہر شخص کو کھلے ذہن اور بغیر تعصب کے اس کتاب کا لازماً مطالعہ کرنا چاہیے

نام کتاب	نمازنبویؐ[باتصویر]	زیرِطبع

اس کتاب میں نماز،وضواورتیمم وغیرہ کا طریقہ صحیح احادیث اور عملی تصاویر کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

نام کتاب	هدية النسآء	قیمت-/200

خواتین کے احکام ومسائل اوران کی دینی واخلاقی تربیت پرایک جامع کتاب۔صحیح احادیث اور فتاوٰی سے مزین۔

نام کتاب	هدية الوالدين	قیمت-/140

اولاداوروالدین کے باہمی حقوق وفرائض۔باہمی مسائل وتنازعات کے اسباب اوران کے تدارک پرلاجواب کتاب

نام کتاب	خوشگوارازدواجی زندگی کے اصول	زیرِطبع
نام کتاب	احکام لباس اوربے پردگی	زیرِطبع
نام کتاب	زیب وزینت اورمروجہ فیشن	زیرِطبع
نام کتاب	موسیقی حرام نہیں؟	زیرِطبع

تصنیف: محدث العصر علامہ ناصرالدین البانیؒ۔ترجمہ: مولانا جمیل اختر۔اعدادواضافہ: حافظ مبشرحسین لاہوری

نام کتاب	جادو،جنات اورنظربد	قیمت-/60

تصنیف: شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔ ترجمہ: مولانا جمیل اختر۔ نظرثانی: حافظ مبشرحسین لاہوری

نام کتاب	پیش گوئیوں کی حقیقت	زیرطبع

اس کتاب کا تعلق بنیادی طور پر آنحضرت ﷺ کی ان پیشگوئیوں کی تعبیر سے ہے جو قربِ قیامت کے مختلف احوال و واقعات سے بحث کرتی ہیں۔ نیز احادیث فتن، المحلمة العظمٰی، شخصیات اور علاقہ جات اور آخری دور میں ہونے والی جنگوں سے متعلقہ نبویؐ پیش گوئیوں کی جمع و ترتیب اور بعض مفکرین کی غلط تعبیروں کا تنقیدی جائزہ بھی بالتفصیل پیش کیا گیا ہے۔ خواب، پیشین گوئی اور نبویؐ پیشین گوئی میں فرق پر اصولی بحث بھی کی گئی ہے۔

نام کتاب	هدية العروس	قیمت-/220

نکاح کی ضرورت و اہمیت، ترکِ نکاح کے نقصانات، شادی بیاہ کا اسلامی طریقہ، جاہلانہ رسومات کا تفصیلی رد، حقوق زوجین، خوشگوار ازدواجی زندگی کے رہنما اصول، آداب مباشرت، خلع وطلاق، لعان، ایلاء، ظہار، متعہ، حلالہ، شغار وغیرہ کے شرعی مسائل، تعدد ازدواج اور پاکستانی کلچر، میاں بیوی کے مخصوص مسائل، ساس بہو کا جھگڑا اور اس کا منصفانہ حل اور ایسے ہی بیسیوں ازدواجی و خانگی احکام و مسائل پر مشتمل ایک جامع اور مستند کتاب الحمد للہ!

نام کتاب	اسلام میں تصور جهاد	زیرطبع

اس کتاب میں بنیادی طور پر دو چیزوں کو پیش کیا گیا ہے؛ ایک تو یہ کہ اسلام میں جہاد کا صحیح تصور کیا ہے۔ اس کے آداب وضوابط، حدود و قیود اور اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ حکومت کی سرپرستی، والدین کی اجازت، معاہدوں کی پابندی، غیر مسلموں سے تعاون وغیرہ جیسے مسائل میں آنحضرت کی سیرت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے جبکہ دوسری یہ چیز پیش کی گئی ہے کہ دور حاضر میں اپنے حقوق کے دفاع، ظلم کے خاتمہ اور قیام امن کے لیے جہاد کیسے کیا جائے۔

نام کتاب	جهاد اور دهشت گردی	زیرطبع

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ دہشت گردی کیا ہے؟ اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گرد کیوں کہا جا رہا ہے؟ اصل دہشت گرد کون ہیں؟ دہشت گردی کے اسباب و علل کیا ہیں؟ دہشت گردی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کے حوالے سے اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟ جہاد اور دہشت گردی میں کیا فرق ہے؟ خودکش اور فدائی حملوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

نام کتاب	جهیز کی تباه کاریاں	زیرطبع

اس کتاب میں جہیز کی شرعی حیثیت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مروجہ جہیز کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

هدیة الوالدین

خاندانی نظام میں والدین اور اولاد کا رشتہ نہایت اہمیت کا حامل ہے یہ دین اسلام ہی کی خوبی ہے کہ اس نے خاندانی نظام کے تحفظ کے لئے اولاد اور والدین کے باہمی رشتے کو محبتیں، الفتیں اور ادب واحترام کی نہایت مضبوط دیواریں فراہم کیں، ورنہ آج کی ماڈرن سولائزیشن سمیت دنیا کا کوئی نظام ایسا نہیں جس نے عمرانیات کے اس اہم ترین حصے یعنی ادارہ خاندان کو حقیقی تحفظ فراہم کیا ہو۔ مغربی تہذیب وتمدن میں پروان چڑھنے والی نوجوان نسل بوڑھے اور محتاج والدین کو اپنی عیاشانہ زندگی میں رکاوٹ اور بوجھ سمجھتے ہوئے جس وقت گھروں سے نکال کر ''اولڈ ہوم'' (نرسنگ ہاؤس) میں بھیج رہی ہوتی ہے' اس وقت اسلام ان بوڑھے اور محتاج والدین کو موقع غنیمت قرار دیتے ہوئے ان کی خدمت پر دنیا وآخرت کی بہتری اور جنت میں داخلے کی ضمانت دیتا ہے!

اس کتاب میں والدین کے حقوق وفرائض کے ساتھ ان مسائل کو خصوصی طور پر زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے جن سے والدین اور اولاد کے درمیان بحث وتکرار کی فضا پیدا ہوتی اور باہمی تنازعات جنم لیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگر ان کا صحیح ومنصفانہ حل پیش نہ کیا جائے تو خاندانی ادارہ تباہی وبربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ والدین اور اولاد کے متنازعہ مسائل کی تفصیلات میں جھگڑوں کی وجوہات اور ان کے تدارک وسدباب کے ذرائع پر بھی خصوصی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے اور قرآن سنت کی روشنی میں ایسا منصفانہ حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ نہ اولاد کی حق تلفی ہو اور نہ ہی والدین پر ظلم وزیادتی ہو بلکہ افہام وتفہیم اور ادب واحترام سے زندگی کی گاڑی چلتی رہے اور خاندانی نظام کی مستحکم روایت قائم رہے۔ الحمد للہ اپنے موضوع پر یہ اولیں جامع کتاب ہے۔



Rs.150/-

Areeb Publications

1542, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2 (India)

Ph. 011-23282550, email: apd1542@gmail.com